بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# کم یاب ہیں ہم

(تجربات وحوادث)

اصغر علی جاوید

KUM-YAAB HAIN HUM (Auto Bioghraphy)

Author: Asghar Ali Javed

Farah Publications, Tariq Road, Sheikhupura.

Contact: 056-3864248, 0334-4005060

asgharalijaved53@gamil.com.

نام کتاب: ............................ کم یاب ہیں ہم (تجربات وحوادث)

مصنف: ............................ اصغر علی جاوید

کمپوزر: ............................ اشرف نقوی

سرورق: ............................ اشرف نقوی

تعداد: ............................ 1000

باراوّل: ............................ 2024

قیمت: ............................ -/600 روپے

فرح پبلی کیشنز، شوکت علی روڈ، آف طارق روڈ شیخوپورہ

اپنے بچّوں

ایمن عدیل، فیصل جاوید، میمونہ جاوید،
محمد موسیٰ عدیل اور محمد ارحم جاوید

کے نام

ڈھونڈو گے اگر مُلکوں مُلکوں ، ملنے کے نہیں ، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم ، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں ، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو ، نایاب نہ ہوں ، کم یاب ہیں ہم

شاد عظیم آبادی

# فہرست عنوانات

شجرہ نسب اصغر علی جاوید
عبدالحلیم
مولا بخش
مند بخش
الہی بخش
دین محمد
چراغ دین
اللہ دتہ
معراج دین
تاج دین
محمد لطیف
خورشید عالم
صادق علی
محمد امین
عبدالرشید
شوکت علی
محمد اشرف
اصغر علی جاوید
شہناز اختر
ارشد علی
خالدہ پروین
عباس علی
محمد الیاس
ایمن جاوید
ایم اے (اردو)
ایم اے (ایجوکیشن)
فیصل جاوید
ڈسٹرکٹ انفارمیشن آفیسر
پنجاب گورنمنٹ
میمونہ جاوید
ایم فل (ایل آئی ایس)
محمد موسیٰ عدیل
محمد ارحم جاوید

# چچو کی ملیاں

لاہور سے بذریعہ ٹرین شیخوپورہ جائیں تو شیخوپورہ سے 9 کلومیٹر پہلے ایک مضبوط اور اُونچے پلیٹ فارم والا ریلوے اسٹیشن راستے میں پڑتا ہے۔شیخوپورہ میں جنکشن بننے سے پہلے یہی اسٹیشن ریلوے جنکشن تھا اور لاہور سے جڑانوالہ اور فیصل آباد جانے والی گاڑیاں یہیں سے اپنے راستے بدلتی تھیں۔1886 میں جنکشن ختم ہونے کے بعد اس کی رونقیں ماندرہیں لیکن ستمبر 1965 کی جنگ کے بعد جب لاہور شیخوپورہ روڈ صنعتی علاقہ بننے لگا تو اِس ریلوے اسٹیشن کے پہلو میں داؤد ہرکولیس کیمیکلز فیکٹری قائم کردی گئی جو ببر شیر کے نام سے یوریا کھاد بنانے لگی۔اِس صنعتی انقلاب سے اِس ریلوے اسٹیشن کی رونقیں لوٹ آئیں۔یہ چچو کی ملیاں کا ریلوے اسٹیشن ہے۔

اِس بستی کے اِک کوچے میں اِک انشا نام تھا دیوانہ

چچو کی ملیاں کا گاؤں اپنے منفرد، عجیب اور بقول ستیہ پال آنند اپنے بے ہودہ سے نام کی وجہ سے بہت مشہور رہے۔فلموں، ڈراموں میں اِس نام کو بے وقوفی اور بعض اوقات دُوری کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔نہر اپر چناب پر قائم کیا گیا مشہور پن بجلی گھر چچو کی ملیاں سے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لیکن واپڈا میں اِسے چچو کی ہائیڈل پاور اسٹیشن ہی کہا جاتا ہے۔1995 میں 'نگارشات' لاہور نے 'عالمی اُردو افسانے' ترتیب دی تو پتہ چلا کہ اس چھوٹے سے گاؤں کا نام بیرونِ ملک بھی جانا جاتا ہے۔ستیہ پال آنند کا خوب صورت افسانہ 'چچو کی ملیاں کی شہزادی' میں نے 'عالمی اُردو افسانے' میں ہی پڑھا تھا۔

## چچو کی ملیاں اور 'اُس بازار میں'

میرے گاؤں کا ذکر شورش کاشمیری نے اپنی کتاب 'اُس بازار میں' بھی کیا ہے۔وہ علامہ اقبالؒ کے اُستاد علامہ میر حسن سیالکوٹی کے چچا حضرت قاسم شاہؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''حضرت قاسم شاہؒ رنجیت سنگھ کے ابتدائی زمانہ میں مشہد سے لاہور تشریف لائے تھے اور اس جگہ قیام فرمایا جہاں دفن ہیں۔(ہیرامنڈی، لاہور) مزار کے پڑوس میں ایک کھلے صحن کا مکان ہے جس کا چوبی دروازہ اندر سے بند

رہتا ہے ............ ابتداء میں اِس جگہ ایک ٹِبّہ (ٹیلا) ہوتا تھا۔ حضرت قاسم شاہ نے اس کو اقامت و عبادت کے لیے چُن لیا۔ مسجد کی نیو رکھی، حجرہ بنوایا اور یادِ اللہ میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑے ہی دِنوں میں اُن کے فقر و استغنا کا چرچا ہو گیا۔''

''اُنہی دِنوں چیچو کی ملیاں (شیخوپورہ) کے بعض خانہ بدوشوں نے ٹبّی (ٹیلے) کے نشیب میں قیام کیا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو پنجاب کی مختلف ذاتوں سے منسوب کرتے تھے۔ ان کا کام چٹائیاں بُننا اور چھقیں بنانا تھا، لیکن پیٹ کی مار صورتوں کے ساتھ سیرتیں بھی بگاڑ دیتی ہے۔ ان کی عورتیں خوب صورت تھیں۔ اُن سے چوری چھپے پیشہ کمانا شروع کیا۔ حضرت قاسم شاہؒ کے فرزند حضرت میرن شاہ جو اُس وقت دس گیارہ برس کے تھے، اُن کی جھونپڑیوں میں شب کو گھس جاتے، دیے گُل کرتے اور چِلّاتے:

سُور آ گئے سُور، سُور آ گئے سُور

اِس پر چند لوگ حضرت قاسم شاہؒ کی خدمت میں پہنچے اور مرشد زادے کی شکایت کی۔ شاہؒ صاحب نے فرمایا:

میرن! ان کے لیے دُعا کرو، بد دعا نہ دو۔ سُور بھی تو خدا کی مخلوق ہے۔ ان خانہ بدوشوں ہی کی اولاد ہیرا منڈی کے پشتینی کنچنوں کی مورث ہے اور ان کی بڑی بڑی حویلیاں ہیں۔''

حضرت شورش کاشمیری سے میری واحد ملاقات اپنی نوعمری کے زمانے میں موچی دروازہ لاہور کے ایک ہال میں ایک تقریب کے دوران ہوئی تھی۔ اُن کی شخصیت مجھے بہت اچھی لگی اور اُن کی تقریر نے تو مجھے بے حد متاَثر کیا، لیکن 'اُس بازار میں' کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کی شخصیت کا وہ مینار جو مَیں نے اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا، نیچے آ گِرا۔ 'اُس بازار میں' کی اہمیت و افادیت کیا ہے، میں نہیں سمجھ سکا، لیکن ہوسکتا ہے اُس کی معرکہ آرائی کسی دُوسرے قاری کو بھا گئی ہو۔ میں تو صرف چیچو کی ملیاں کے حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

شورش لکھتے ہیں کہ حضرت میرن شاہؒ کا 1878 میں وصال ہو گیا۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ جب اُنھوں نے ''سور آ گئے، سُور آ گئے'' کا شور مچایا تو یہ 30-1821 کا عشرہ ہو گا۔ میرے

دادا، میاں جی اللہ دِتہ ہنجرا اِس سے پچاس سال بعد چچو کی ملیاں میں پیدا ہوئے اور اُنھوں نے اپنے بزرگوں سے سُنی ہوئی داستانیں ہمیں بھی سُنائیں۔ اُس عہد میں پنجاب کی مشہور ذاتوں میں سے کوئی بھی چچو کی ملیاں میں آباد نہ تھی، البتہ اِس سے بہت پہلے ایک صاحبِ حیثیت اور سیانا بزرگ جسّا سنگھ ورک وہاں واہی بیجی کرتا تھا۔ جسّا سِنگھ مسلمان ہوا تو جس بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی، اُس نے جسّے سنگھ کا نام جسّے شاہ رکھ دیا۔ گاؤں میں اِکا دُکّا ہی مسلمان نظر آتا تھا، شاید اِسی وجہ سے جسّے شاہ وہاں سے شیخوپورہ کے قریب بدومرادے کے گاؤں میں جا آباد ہوا۔ شیخوپورہ میں آباد جسّل خاندان اُسی جسّے شاہ کی اولاد ہے۔

جسّے شاہ کی ہجرت کے بعد گاؤں میں وِرک خاندان کا کوئی فرد باقی نہ رہا۔ تین چار سکھ خاندان جو قیامِ پاکستان تک وہاں مقیم رہے، اُنھوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو سنگھ کے علاوہ کچھ کہلانا پسند نہ کیا۔ مثلاً منگل سنگھ اور حاکم سنگھ گاؤں کے دو قابلِ ذکر سردار تھے۔ اُنھوں نے اپنے نام کے ساتھ سنگھ کے علاوہ اور کچھ لکھنا یا کہلوانا پسند نہیں کیا۔ میرے تایا جی حاجی تاج دین ٹھیکیدار کی اولاد کے پاس منگل سنگھ اور حاکم سنگھ سے خریدی گئی زمین کی کچھ دستاویزات آج بھی موجود ہیں جن پر قوم سکھ ہی درج ہے۔

سکھوں کے اِن تین چار گھرانوں کے علاوہ گاؤں میں ہندو ہی آباد تھے۔ ہندو جو ذات پات کی ناپسندیدہ مگر مضبوط زنجیر میں جکڑے ہیں، اپنی پہچان، برہمن، شودر، کھشتری اور ویش کی حیثیت سے ہی کرواتے ہیں۔ اگر وہ اپنی کچھ دیگر پہچان بناتے بھی ہیں تو اُن کی بابت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ 'پنجاب کی ذاتیں' ہیں۔

حضرت شورش نے یہ نہیں بتایا کہ لاہور میں پیشہ شروع کرنے والے لوگ ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلمان میں سے کیا تھے، اور اگر وہ سکھ یا ہندو تھے تو قیامِ پاکستان کے وقت اُن کے سامنے جو option موجود تھے، وہ کیا ہوئے؟ وہ لوگ ''حویلیاں'' چھوڑ کے چلے گئے یا مسلمان ہو گئے؟ اور اگر وہ مسلمان تھے تو چچو کی ملیاں میں اُن کی باقیات کہاں گئیں؟ وہاں تقسیمِ ہند کے وقت ہمارے علاوہ صرف تین چار مسلمان گھرانے تھے جن کے آباء کی قبریں چچو کی ملیاں میں ہی موجود ہیں، اور اُن میں کوئی بھی چٹائی ساز نہ تھا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ جناب شورش کاشمیری کو یہ بات پوری طرح معلوم تھی کہ چچو کی ملیاں

میں چٹائی ساز آباد ہیں لیکن وہ یہ بات نہ جان سکے کہ یہ سب لوگ قیامِ پاکستان کے وقت آ کر آباد ہوئے تھے، جو میرن شاہؒ سے ایک صدی بعد کی بات ہے۔ تقسیمِ ہند کے مہاجرین میں یہ سب سے زیادہ مفلوک الحال لوگ تھے۔ غربت، جہالت اور بے بسی اِن بے چاروں کے چہروں سے عیاں تھی۔ مرد، عورت اور بچے سب مل کر گاؤں کے باہر چٹائیاں بناتے اور پیٹ کا ایندھن تیار کرتے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اُن کی نیک بخت عورتیں تو جانوروں کی طرح بوجھ اُٹھاتی ہیں۔ ایسے میں خوب صورتی کہاں اور مرد کے لیے جاذبیت کہاں!

## چیچو کی ملیاں اور مستنصر حسین تارڑ

چیچو کی ملیاں کو سینئر قلم کار مستنصر حسین تارڑ نے بھی تختۂ مشق بنایا۔ 12-6 جون 2011 کے اخبارِ جہاں کے 'کارواں سرائے' میں جناب تارڑ نے 'ادبیت' کے لیے جو عنوان منتخب فرمایا ہے، وہ ہے 'چیچو کی ملیاں سے نیویارک تک'۔ اِس میں جو خاص بات ہے وہ چیچو کی ملیاں کے نام کی تکرار ہے ورنہ تو بھینسوں کی اُداس آنکھیں، چیچو چیچ گنڈیریاں، ساہی وال کے بیل اور ادبی گاڈفادرز کی باتیں تو وہ سب لوگ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں جو اخبارِ جہاں میں نہیں لکھتے۔ تارڑ صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ چیچو کی ملیاں کے نام میں اُنھیں کیا جاذبیت نظر آئی اور اس سے اس 'پُر مزاح' طنز و مزاح کا وزن کتنے گُنا بڑھ گیا۔

## جندن کور آف چیچن کی ملیاں

"Jindan Kaur of Cheechan-ke-Mallian"

"My thoughts swayed from my usual Sunday article to focus on the outcome of a remarkable person we are researching with regard to the events of 1947, a 'holocaust' the sort the world has seldom seen, definitely the largest exodus in human history and one that our elders are still ashamed to discuss openly. For this I condemn my elders, for they have not been truthful about our past".

یہ اقتباس ہے روزنامہ ڈان لاہور (18، اپریل 2010) میں شائع ہونے والے ماجد شیخ کے آرٹیکل "Jindan Kaur of Cheechon-ke-Mallian" سے۔ پورا آرٹیکل جناب ماجد شیخ کے دُکھی اور پُر آشوب ہونے پر دال ہے۔ وہ اپنے بڑوں سے اِس بات پر ناراض نظر آتے ہیں بلکہ اُنھیں لائقِ مذمت گردانتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے ماضی پر سچائی سے کام نہیں لیا۔ ماجد شیخ نے اس بُور سہاگن داستان میں ''چیچن کی ملیاں''(Cheechan-ke-Mallian) کی ایک 'سکھنی' کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگست 1947ء میں جنڈیالہ کے قریب ایک گاؤں سے بھارت ہجرت کرنے والے سکھوں کے جتھے پر اُس وقت حملہ کیا گیا جب اُنھیں بذریعہ ٹرین شیخوپورہ سے امرتسر لے جایا جارہا تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ٹرین پر حملہ ''چیچن کی ملیاں'' کے قریب کیا گیا اور حملہ کے دوران تمام مردوں، بزرگ عورتوں اور بچوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اُس ٹرین میں تقریباً 105 عورتیں تھیں جن میں زیادہ تر جوان تھیں۔ جندن کور، جس کا موجودہ نام فاطمہ بی بی ہے، کی عمر اُس وقت صرف پندرہ سال تھی۔ وہ بھی دیگر سکھ خواتین کے ساتھ ہانک لی گئی اور پھر اُس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو جاہل اور واہیات لوگ کرتے ہیں۔ اُسے (جندن کور عرف فاطمہ بی بی کو) یاد نہ ہے کہ کتنے لوگوں نے اُس کی عصمت دری کی۔ ماجد شیخ نے اِس واقعہ کو 'ہولوکاسٹ'(holocaust) کا نام دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب انسان نما جانور اپنی شیطانی پیاس بجھا چکے تو گاؤں کا نوجوان مُلّا اُسے اپنے گھر لے گیا، اُسے قبولِ اسلام کی دعوت دی اور پھر مسلمان ہونے پر اُس سے نکاح کر لیا۔ تقریباً ایک سال بعد، جب اغوا شدہ عورتوں کو بھارت پہنچانے کا کام جاری تھا، آرمی کی ایک بس وہاں بھی آئی۔ جندن کور اُس وقت حاملہ تھی۔ اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ سکھ ہندوستان پہنچنے والی اپنی اُن عورتوں کو خود ہی قتل کیے جا رہے تھے جو فسادات میں بے آبرو ہو گئی تھیں۔ لہٰذا اُس نے بھارت نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ مضمون کے آخری پیراگراف میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ پاکستان اور بھارت میں اِس طرح کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔

اپریل 2010 میں جب مَیں نے ماجد شیخ کا آرٹیکل پڑھا تو مَیں نے اس سلسلے میں اپنے تایا جی حاجی تاج دین ٹھیکے دار سے طویل نشست کی۔ تایا جی اکثر ہمیں جنگِ عظیم دوم کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

جب میں نے ڈان کی اس کہانی کا اُن سے ذکر کیا تو کہنے لگے کہ یہ تو چیچو کی ملیاں اور گردونواح کے لوگوں پر ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ میں 1947 کا اگست اور ستمبر گاؤں میں رہا ہوں، وہاں سِرے سے اِس طرح کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہ ہے، اور بلوے تو سِکھوں کے نہنگوں نے شروع کیے تھے۔

''یہ نہنگ کون تھے تایا جی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''یہ خود کو سکھوں کا بزرگ سمجھتے تھے۔ سر پر لوہے کا رِنگ پہنتے تھے اور پیلا لباس پہنتے تھے۔'' اُنھوں نے جواب دیا۔ ''جہاں تک سلکھنی کے زندہ کردار کا تعلق ہے تو یہ درست ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے پاکستان رہ جانے والی سکھ عورت کو قیامِ پاکستان کے بعد بھی لوگ 'سلکھنی' ہی کہا کرتے تھے، بھلے وہ مسلمان ہی ہو چکی ہو، لیکن ہمارے گاؤں میں ایسی کوئی سلکھنی تھی نہ ہے۔''

تایا جی تاجدین کا یہ کہنا کہ شیخوپورہ سے لاہور جانے والی سکھ مہاجرین کی کسی ٹرین کو چیچو کی ملیاں بلکہ راستے میں کہیں بھی، غارت گری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، ایک ایسے بزرگ کی شہادت تھی جو اُس عہد کے ہر ہر لمحے کے چشم دید گواہ تھے اور جنھوں نے اس عہد کا ایک ایک لمحہ یاد رکھا ہوا تھا۔ ماجد شیخ کا چیچو کی ملیاں کا تحقیقی دورہ اِس لحاظ سے بھی اپنے پیچھے سوالیہ نشان چھوڑتا ہے کہ اُنھیں گاؤں کے نام کے ہجے بلکہ گاؤں کا اصل نام تک معلوم نہیں ہے۔ وہ کم از کم گاؤں کے پہلو پر موجود اِس ریلوے اسٹیشن کو بھی دیکھ لیتے جہاں سے بالآخر وہ ٹرین گزری۔ یوں اُنھیں گاؤں کا اصل نام چیچو کی ملیاں نظر آ جاتا اور یہ انگریزی ہجے بھی: Chicho ki Mallian۔ بلوؤں اور فسادات کے دوران ناگوار اور اذیت ناک واقعات کا نہ ہونا قابلِ تسلیم نہیں ہوتا۔ ہاں اُنھیں 'holocaust' کا نام دینا ایک ناگوار امر ہے۔ 1947 پنجاب میں سکھوں نے جو کچھ کیا اور جو کچھ اُن کے ساتھ ہوا، اُس کے ذمہ دار اہلِ چیچو کی ملیاں ہرگز نہ تھے بلکہ یہ ماسٹر تارا سنگھ جیسے عاقبت نا اندیش سکھ رہنماؤں کی جہالت کا نتیجہ تھا۔ جہاں تک چیچو کی ملیاں کی سلکھنی جندن کور (اب فاطمہ بی بی) کا تعلق ہے تو اِس سلسلے میں یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں:

''علامہ عزیز انصاری 33 برس کے بعد آج سے دو سال قبل جب اپنے آبائی گاؤں بھوجیاں گئے تو بھوجیاں میں تقسیم سے قبل کریانہ کی دُکان کرنے والے چھیانتی سروپ نامی ہندو سے اُن کی ملاقات ہو

گئی۔علامہ صاحب کے بیان کے مطابق چھیانتی سروپ نے ماضی کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے علامہ صاحب کو بتایا کہ بھوجیاں پر حملے کے بعد ایک ہزار کے لگ بھگ اغوا شدہ مسلمان عورتوں کو حملہ آور بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے گئے تھے۔ چھیانتی سروپ نے بھوجیاں کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کی ایک مسلمان لڑکی کے اغوا کی رُوداد بیان کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ بھوجیاں کی مسجد (جسے فسادیوں نے شہید کر دیا تھا) اب ایک حویلی کے روپ میں موجود ہے اور اِس میں ایک سِکھ خاندان رہائش پذیر ہے۔ آپ اس مسجد کو دیکھنے کے بہانے چلے جائیں، آپ کو حویلی کے صحن میں ایک اڈھیر عمر عورت بیٹھی دِکھائی دے گی۔آپ اس عورت کو جب غور سے دیکھیں گے تو پہچان جائیں گے کہ وہ عورت بھوجیاں کے کون سے معزز گھرانے کی آبرو تھی۔'' (جب امرتسر جل رہا تھا از خواجہ افتخار)

چلیے یہ تو ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے ایک نوجوان مسلمان مہاجر کی تحریر ہے۔ قارئین اس سلسلے کے غیر جانبدار مصنفین Larry Collins کی 'Freedom At Midnight' کا مطالعہ فرمالیں تو حقائق خود ہی چیخ اُٹھیں گے۔'فریڈم ایٹ مِڈ نائٹ' سے ایک اقتباس دیکھیے:

''ہندوستان کا یومِ آزادی پنجاب کے لیے تباہی کا دن تھا۔اُس روز طلوع ہونے والا آزادی کا سورج بنفشی اور سنہری نہیں بلکہ تشدد کے ان گنت واقعات اور خونریزی کی بِنا پر قرمزی رنگ اختیار کر چکا تھا۔امرتسر میں نئے حکام آزادی کے بعد اپنے اختیارات سنبھال چکے تھے، مگر شہر میں امن و امان کی صورتِ حال بدستور مخدوش تھی۔شہر کے اندر سکھ اپنے مسلمان ہمسایوں کا بے دریغ خون بہا رہے تھے۔ مردوں کو بے رحمی سے قتل کیا جا رہا تھا؛ عورتوں کو اغوا کیا جاتا؛ اُن کی آبروریزی ہوتی؛ خوف وتشدد سے کانپتی اِن برہنہ بے بس عورتوں کو شہر بھر میں پھرا کر گولڈن ٹمپل (دربار صاحب) تک لایا جاتا اور پھر بہت سی عورتوں کی گردنیں اُڑا دی جاتیں۔''

تحریکِ پاکستان، قیامِ پاکستان بلکہ سقوطِ مشرقی پاکستان پہ جو دستاویزات اور کُتب ریکارڈ

کا حصہ بننا چاہتی تھیں، اب تو شاید اُنھیں Archives میں دیکھا جا سکتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے 63 برس بعد کی نسل کو جب یہ بتایا جائے گا کہ پاکستانی پنجاب کے مسلمانوں نے سکھ عورتوں کی عزت و عصمت کو تار تار کیا تو پھر قارئین کو اِس کا ثبوت مانگنے کا بھی حق حاصل ہونا چاہیے۔ اب جو 'holocaust' بھارتی پنجاب کی تاریخ میں محفوظ ہوا، اُس کا ثبوت مسلمان مصنف اور انگریز مصنفین کے بعد ننکانہ صاحب کے ایک سکھ یاتری سے لیجئے:

''ہندوؤں نے ہمیں اُن دِنوں ایک نعرہ دیا تھا۔ رنگے اور مودے کے مظالم کا بدلہ لے لو۔''
(رنگے سے مراد اورنگ زیب عالمگیر اور مودے سے مراد سلطان محمود غزنوی ہے)۔

مزید دیکھیئے:

''گُرو معاف کرے۔ ہم اُس وقت وحشی بن گئے تھے۔ ہم دس دس سکھوں نے بیک وقت ایک ایک مظلوم لڑکی کو بے آبرو کیا۔ ہمیں اُس وقت تخریب اور درندگی کے سِوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ہم نے معصوم اور مظلوم بچّوں کو کرپانوں کی نوک پر اُٹھا اُٹھ کر مارا۔ عورتوں کی چھاتیاں کاٹ کر اُنھیں کہتے: 'یہ تمھارا پاکستان ہے۔' نوجوان عورتوں کو چھانٹ کر الگ کر لیتے اور باقی بچّوں، بوڑھوں اور بوڑھی عورتوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دیتے۔ جب انسانی جسم جلتے تو ہمیں کئی بوتلوں کا نشہ ہوتا۔ ہم قہقہے لگاتے اور اِتنا بھنگڑا ڈالتے کہ ہمارے کیس (یعنی بال) کھل کر رہ جاتے اور پھر نوجوان لڑکیوں کے ساتھ چُوہے بلّی کا کھیل کھیلتے۔ بکروں کا جھٹکا کرتے۔ شراب پیتے اور پھر ان کھلی سرمستیوں کا باب کھل جاتا۔ میں کیا بتاؤں میاں جی!............ہم بالکل اندھے ہو گئے تھے اور انسانیت کا آخری احساس بھی مٹ چکا تھا۔''

(روزنامہ آفاق، لاہور، 2 ستمبر، 1979)

مزید دیکھیئے:

ضلع امرتسر کے ایک گاوں سٹھالہ میں سکھ درندوں نے ایک ایسی مسلمان لڑکی کو وحشیت اور درندگی کا نشانہ بنایا جو اپنے تمام اہلِ خانہ کو اپنی آنکھوں سے سامنے قتل ہوتا دیکھ کر پاگل ہو گئی تھی۔ گرو نانک کے جنم استھان پر آئے سکھ یاتری کی بے غیرتی کی داستان اُسی کی زبانی سُنیئے:

''بھگوان نے ہمیں زندگیوں میں ہی ہماری حرام کاریوں کی سزا سنادی اور پھر وہ ہُوا جس کے ہم سزا وار تھے۔ہم تینوں کی داستان علیحدہ علیحدہ ضرور ہے، مگر ایک بات سب میں مشترک ہے کہ ہماری وہ سردارنیاں جنھیں ہم باجوں گاجوں سے بیاہ کرلائے تھے، یکے بعد دیگرے ہم سے علیحدہ ہوگئیں۔

کیکرسنگھ کی بیوی ایک اچھوت کے ساتھ نکل گئی (یعنی بھاگ گئی)۔کرتارسنگھ کی بیوی اُس کے نوکر کے ساتھ فرار ہوگئی اور میری پتنی میرے ہی گاؤں کے ایک موچی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑی گئی اور میں نے اِس واقعہ سے دل برداشتہ ہوکر سادھوسنتوں جیسے طور طریقے اپنا لیے اور اپنا گاؤں چھوڑ کر در در کی خاک چھاننا میرا مقدر بن گیا۔'' (جب امرتسر جل رہا تھا،صفحہ 228)

ذرا یہ پیرا بھی مطالعہ فرمالیجیے:

''15 اگست کو جب بھارت پر آزادی کی دیوی کا نزول ہوا تو امرتسر شہر نے اِس روزِ سعید کو عجیب طور پر منایا۔ جان کونیل نے اپنی کتاب 'آ کنلیک' میں لکھا ہے کہ اُس روز سکھوں کے ایک ہجوم نے مسلمان عورتوں کو برہنہ کر کے اُن کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس شہر کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ پھر سارے جلوس کی عصمت دری کی گئی۔اُس کے بعد کچھ عورتوں کو کرپانوں سے ذبح کر دیا گیا۔ باقی کو زندہ جلا دیا گیا۔ واہ گرو کا خالصہ، واہ گرو کی فتح!''

فیصلہ فرمایئے 'Holocaust' چیچو کی ملیاں میں ہوا یا امرتسر میں!

**چیچو کی ملیاں اور ستیہ پال آنند:** چیچو کی ملیاں چند ہزار نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اِس گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک ہندو راجہ مقیم تھا۔اُس جگہ کو آج ملیاں کلاں، چبوترے والی ملیاں یا وڈھیاں ملیاں کہا جاتا ہے۔اِردگرد کی ساری زمین اُسی کی ملکیت تھی۔اُس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، البتہ اُس کی بارہ بیٹیاں راجدھانی میں مشہور تھیں۔مرنے سے پہلے اُس نے اپنی سب بیٹیوں کو بلایا اور زمین کے 12 برابر حصے کرتے ہوئے کہا کہ اپنی مرضی اور باہم صلاح مشورے سے حصہ پسند کرلو۔ رقبے کے وہ بارہ حصے اُنھی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ یہ چیچو، ساہو، داؤ اور موجو دراصل اُن لڑکیوں کے ہی نام ہیں۔ یوں چیچو کی ملیاں سے مراد ہے چیچو کے پسند کیے ہوئے کھیت (چیچو دی ملیاں ہوئیاں پیلیاں)۔11 جون، 2020 کو ستیہ پال آنند کے افسانے 'چیچو کی ملیاں کی شہزادی' کے حوالے سے مَیں

نے آنند صاحب سے پوچھا کہ اِس کہانی کا پس منظر کیا ہے تو اُن کا جواب تھا:

This story is 35 years old. The young lady was a fictitious character but based on a real person. I have lost contact with her. To me, it seems, cheecho was the name of the first settler in that village.

Malian in loose village dialect means _________:

ملی ہوئی یا قبضہ کی ہوئی۔

گویا اُنھوں نے کسی حد تک میری بات کی تائید کر دی۔

## میرے گاؤں کے وسنیک اور ماحول

چیچو کی ملیاں میں اس وقت ارائیں، سیّد اور صف ساز آباد ہیں۔ اِس کے علاوہ سندھو، ہنجرا، راجپوت اور ڈوگر برادری کے کچھ خاندان بھی یہاں مقیم ہیں۔ سوائے ہنجرا برادری کے یہ سب لوگ مہاجر ہیں۔ اِن لوگوں میں ماسوائے ایک دو وکلاء، پروفیسر امداد حسین، رانا زاہد حسین (ناول نگار) کوئی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ ہے۔ میں نے 1972 میں جب ایف اے پاس کیا تو چیچو کی ملیاں اور اِرد گرد کے ڈیروں میں کِسی کی تعلیم میٹرک سے زیادہ نہ تھی۔ میٹرک پاس بھی صرف چار یا پانچ افراد تھے۔ لڑکوں کا سکول پرائمری تھا اور لڑکیوں کے لیے سِرے سے کوئی تعلیمی ادارہ تھا ہی نہیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ گاؤں کی کوئی لڑکی لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھی البتہ چند لڑکیاں قرآن پاک پڑھ لیتی تھیں۔

گاؤں کی کچھ خواتین میں بہت سی قرآن پاک روانی سے پڑھ لیتی تھیں لیکن اُن میں زیادہ تر سیدانیاں ہی تھیں۔ میری دادی رابعہ نہ صرف قرآن پاک خوش الحانی سے پڑھتیں بلکہ بعض اوقات قرآنی قصص بھی سناتیں۔ اِس کے علاوہ وہ اُردو، فارسی اور پنجابی کے اشعار بھی سُنایا کرتی تھیں۔ جولائی 2008 کے آغاز میں اُن کی صحت گرنا شروع ہوئی تو ایک صبح میں اُنھیں ملنے کے لیے چیچو کی ملیاں گیا۔ وہ اِس بات پر بہت خوش تھیں کہ وہ اب اپنے رب سے ملنا چاہتی ہیں۔ اُنھوں نے مجھے ایک خوب صورت پنجابی نظم سنائی جو میں اُن کی نحیف آواز کی وجہ سے پوری طرح نہ سمجھ سکا۔ بس وہ کچھ اِس طرح کا خیال ظاہر کر رہی تھیں:

دُنیا کیا ہے؟ ایک دھوکہ ہی تو ہے!

بہار میں درخت کے پتے، ہرے بھرے پتے، بہت خوب صورت نظر آتے ہیں، من کو بھاتے ہیں۔ پھر خزاں آتی ہے، پتے بکھر جاتے ہیں، کوئی اِدھر کوئی اُدھر۔

گاؤں میں چونکہ تعلیم اور چودھراہٹ دونوں ہی چیزیں نہ تھیں، اِس لیے وہاں کوئی قابلِ ذکر آدمی بھی نہ تھا۔ البتہ اپنی شخصی خوبیوں کی وجہ سے پیر سیّد خادم حسین شاہ، محمد حنیف سندھو، صوبے دار عبدالغفور اور بابا ٹوہری بستی کی پہچان تھے۔ سیّد خادم حسین شاہ جی کا تعلق تقسیمِ ہند کے مہاجرین سے تھا لیکن وہ امرتسر سے آ کر جلو موڑ میں پناہ گزین ہوئے۔ ستر کی دہائی میں آپ کا خاندان چیچو کی ملیاں میں آباد ہوا۔ آپ اپریل 2010ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاہ جی کی تشریف آوری کے بعد چیچو کی ملیاں سے مُجرے کا جنازہ اُٹھ گیا، ورنہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ فصل کی کٹائی ہو اور لاہور سے ناچنے والیاں نہ آئیں۔

چیچو کی ملیاں کا مُجرا بھی گاؤں کے نام کی طرح دلچسپ ہوتا تھا۔ بجلی تو گاؤں میں تھی نہیں۔ ٹیپ ریکارڈر کا وجود تھا نہ اُس کے استعمال کا رواج۔ اِس لیے ناچنے والیوں کو خود ہی گانا بھی پڑتا تھا اور ناچنا بھی۔ مٹی کے تیل کے ائر پریشر لیمپ جنھیں 'گیس' کہا جاتا تھا، گاؤں کی مسجد کے سامنے بوڑھے برگد کے تنوں کے ساتھ لٹکا دیے جاتے تھے۔ شام ہوتے ہی سبھی پیر و جوان اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے۔ ساتھ والے ڈیروں سے آئے باذوق نوجوان چاچے جنابے کی سرسبز ٹاہلیوں کے نیچے سے اُٹھ کر چیچو کی ملیاں کے الحمرا میں پہنچ جاتے۔ سازندے چٹائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے اور وقفے وقفے سے طبلے پہ تھاپ جاری رہتی، پھر اچانک ناچنے والیوں کی سینئیر نمودار ہوتی، جسے گاؤں کے بڑے بوڑھے دارو کنجری کے نام سے یاد کرتے تھے۔ دارو سے کچھ ہی دیر بعد نوجوان رقاصائیں ہجوم سے راستہ بناتے ہوئے اور گھنگھرو چھنکاتے ہوئے برگد کے نیچے آ نمودار ہوتیں۔ اُن دِنوں عریانی کا رواج تو نہیں تھا البتہ جسم سے چپکے ہوئے انتہائی تنگ کپڑے ضرور 'in' تھے۔ شارٹ شرٹس اور تنگ پاجاموں میں ملبوس رقاصائیں اپنے بھرے جسموں اور بے ہودہ میک اپ کے ساتھ تھرتھرانے لگتیں تو ہُو ہا کا عجیب عالم بنتا۔ موسمِ گرما میں تو وہ پسینے سے ایسے شرابور ہو جاتیں کہ تماشائیوں کی نظروں اور رقاصاؤں کے جسموں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہ جاتی، پر گیت اور ناچ جاری رہتے:

اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے، چوٹھی موٹھی دا پالیا ای ککھ وے، توں ساڈے ول تک سجناں۔

نمبواں دا جوڑا اساں باغے وچوں توڑیا، نمبواں دا جوڑا۔

باجرے دا سِٹّا اساں تلی تے مروڑیا، باجرے دا سِٹّا

چٹّی گھوڑی تے کاٹھی تِلّے دارنی سیّو۔ دُوروں تکاں تے لگے تھانیدارنی سیّو۔

اِسی طرح کے بے شمار گیت بے ہودگی سے گائے جاتے اور اُن پر ٹھمکے لگائے جاتے۔ یہ مُجرے عام طور پر نمازِ فجر سے کچھ ہی دیر پہلے ختم ہوتے۔ نماز کا گاؤں میں رواج ہی نہ تھا اِس لیے لوگ مجرے کے ختم ہوتے ہی لمبی تان کے سو جاتے۔

سیّد خادم حسین شاہ جی کے بعد گاؤں کی دوسری معروف شخصیت محمد حنیف سندھو مرحوم کی تھی۔ وہ بنیادی جمہوریت میں بی ڈی ممبر تھے اور گاؤں کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ لکھنا پڑھنا تو دور کی بات، اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن سات فٹ کا وہ چوڑا چکلا اور باوقار انسان بڑی خود اعتمادی سے گفتگو کرتا تھا۔

صوبے دار عبدالغفور چچو کی ملیاں کی ایک سنجیدہ اور مہذب شخصیت تھی۔ معلوم نہیں وہ کہاں کے رہنے والے تھے لیکن چچو کی ملیاں میں اُن کی آمد کا سبب یہاں زمین کی الاٹمنٹ تھی۔ فوجی افسران والا وقار اور وجاہت تو رکھتے ہی تھے، وہ کم گو اور گوشہ نشین قسم کے آدمی بھی تھے۔ چچو کی ملیاں میں سید خادم حسین شاہ جی کی آمد سے قبل جو لوگ باقاعدگی سے نماز ادا کرتے تھے، اُن میں صوبیدار صاحب اور تایا حسین بخش انبالوی کے نام مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ تایا حسین بخش انبالہ کے مہاجر تھے اور بہت نفیس انسان تھے۔

ہمارے ہمسائے تھے۔ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ دینی علوم میں انھیں صرف کلمہ طیبہ آتا تھا اور بس اس کے آگے ختمہ تھا۔ عید کے روز وہ عیدگاہ ضرور جاتے تھے اور اس روز صرف سفید تہبند ہی پہنتے تھے۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود بابا ٹوہری کمال کا آدمی تھا۔ چچو کی ملیاں میں اُس جیسی معصومیت اور فہم کا آدمی پیدا نہیں ہوا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ اُس کے آباؤ اجداد کب سے وہاں رہ رہے تھے لیکن وہ اُن چار مسلمان گھرانوں میں سے ایک کا سربراہ تھا جو قیامِ پاکستان کے وقت اس گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ سیانا ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص اور ہمدرد انسان بھی تھا۔ بابا ٹوہری 2007 میں تقریباً 100 برس کی عمر میں چلانا کر گیا۔

حیرت کی بات ہے کہ بابا ٹوہری کو نماز تو یاد نہ تھی لیکن جب ایک بار میں نے اُس سے اُس کی خانگی زندگی کی بات کی تو وہ اپنے مرحوم بیٹے اور بیوی کو یاد کر کے اُداس سا ہو گیا اور باتیں کرتے کرتے رُک گیا۔ میں بھی احتراماً خاموش ہو گیا تو بابا ٹوہری نے خاموشی یوں توڑی: جیدو! (جاوید) پیر وارث شاہ آکھیا سی:

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ آکھیں ، کون رُٹھڑے یار مناوندا ای

ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی ، جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندا ای

ساڈے چم دیا جُتیاں کرے کوئی ، جیہڑا جیو داروگ گواوندا ای

بھلا دس کھاں چِراں دے وچھنیاں نوں، کدوں رب سچا گھر لیاوندا ای

بابا ٹوہری نے اِن اشعار میں کہیں زیر زبر کی بھی غلطی نہ کی۔

بابا کو میرے والد صاحب چاچا ٹوہری کہا کرتے تھے۔ مَیں یہ بتانا بھول گیا کہ ٹوہری کا مطلب ٹھاٹھ باٹھ اور ٹوہر ٹپے والا آدمی ہے۔

ایک بار شبِ برأت کے موقعہ پر ابا جی نے بابا ٹوہری کو ازراہِ مزاح مسجد چلنے کی دعوت دی تو بابا ناراض ہو گیا۔ اُس کا غصہ ٹھنڈا ہونے پر جب میں نے مؤدبانہ طریقے سے بابا جی سے کہا کہ آپ مسجد چلے جائیں تو کہنے لگا کہ ''پُتر اپنے عملاں نال بشکنا سُو۔'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ ''اللہ نے اپنے رحم و کرم سے ہی ہمیں بخشنا ہے۔''

بابا ٹوہری شاید ہی کبھی پریشان ہوتا تھا۔ جب کسی معاشرتی برائی کا اُس کے سامنے ذکر کیا جاتا تو وہ ایک ہی بات کہتا:

''فقیرا تیری جھونپڑی اے گل کٹیاں دے پاس۔ کرے گا سو بھرے گا، توں کیوں ہونداایں اداس''

مجھے بابے کے اِس شعر کی بس اِتنی ہی سمجھ لگ سکی کہ یہ میرا پرابلم نہیں ہے، بابا کبھی اگر میرے ہاتھ میں اخبار دیکھ لیتا تو کہتا کہ ''خبر وی سناتے ترجاواں وی کر۔'' میں کوئی خبر سُناتا تو وہ بار بار 'ترجاویں' کے لیے زور دیتا۔ 'ترجاویں' کا لفظ ترجمہ کا بدل تھا لیکن وہ دراصل تبصرہ سُننا چاہتا تھا۔

بابا ٹوہری کو میرے ساتھ بے پناہ محبت تھی۔ میں اُن کا مزاج شناس تھا اور اُن کی باتیں دھیان سے

سے سُنا کرتا تھا۔ پھر مَیں ریڈیو جالندھر سے پرکاش کور کے گیت سنوانے کا بھی بندوبست کر دیتا تھا۔ بابے کو سات دن خوش رکھنے کے لیے یہ ایک نیکی کافی تھی۔

دراصل ہمارے گاؤں میں صرف تین ہی ریڈیو تھے جن میں سے ایک ہمارے گھر میں تھا۔ NEC کا ریڈیو شام کو جب ''جمہور دی آواز'' سُناتا، لوگ نظام دین اور چوہدری جی کے مکالمے سُنتے تو واہ واہ کر اُٹھتے۔ اِسی ریڈیو پر منگل کے روز بابا جب شمشاد بیگم کی آواز میں ''ٹُٹ جائیں ریل گڈیئے'' سُنتا تو جھوم اُٹھتا۔ ہمارے اور بابے کے گھر کے درمیان صرف ایک ہی گھر تھا۔ ایک رات جب میں اپنی چھت پر پیپل کی ٹہنی کے ساتھ لالٹین باندھ کر پڑھنے لگا تو اُس نے اپنی چھت سے آواز دی کہ پتر جیید! آندھی آ گئی تو یہ پینگ کی طرح ہلارے کھائے گی اور سب کچھ جلا دے گی۔ مَیں نیچے سے ماں جی کا پیڑھا لے آیا اور بابے کے مشورہ کے مطابق پیپل سے لالٹین کھول کر اُس پر رکھ لی۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ نصف شب کے وقت آواز آتی ''پُتر ترٹھیں نہ، میں جاگدا پیا واں'' (بیٹا! ڈرنا نہیں، میں جاگ رہا ہوں)۔ میں لالٹین کو پھونک مارتا تو آواز آتی ''شاواش پُتر اوئے! توں بڑا وڈا بندہ بننا اے۔'' ایک بار وہ ابا جی کے پاس بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا کہ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر ابا جی سے کہنے لگا: ''تیرا ایہہ پُتر چوکھا سیانا تے آہری اے۔، ایس نوں کُجھ چِر کنجراں کول گھل دے۔ ویکھیں نا، چج تے بندہ اوتھوں ای سِکھدا اے نا۔ تینوں پتہ اے نا داری کنجری میری بھین بنی ہوئی اے۔'' (لطیف! تمھارا یہ بیٹا بہت عقل منداور محنتی ہے، اِسے کچھ دیر گانے بجانے والوں کے پاس بھیج دو۔ دیکھو نا، تہذیب تو انسان وہیں سے سیکھتا ہے۔ تمھیں معلوم ہے نا، داری طوائف میری بہن بنی ہوئی ہے۔)

بابا ٹوہری سے میری آخری ملاقات ستمبر 2007 میں اُن کی وفات سے کچھ دیر قبل ہوئی۔ اُن پر فالج کا اٹیک ہو چکا تھا۔ میری بیوی فرحت جاوید اور بیٹی ایمن جاوید میرے ساتھ اُسے حوصلہ اور دُعائیں دیتی رہیں۔ ہم کتنی ہی دیر اُس کے پاس بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ہم اُٹھنے لگے تو بابا مشکل سے بولا:

''کئی بول گئے شاخ عمر دی تے، ایتھے آہلنا کسے نہ پایا اے۔''

بابا ٹوہری کے گھر میں کوئی بہو بیٹی تو تھی نہیں، اِس لیے گاؤں کا ہر بندہ جب جی چاہتا دروازے

پہ آ کے زور سے آواز دیتا ''چاچا ٹوہری!'' اور پھر بغیر جواب کے انتظار کی زحمت اُٹھائے دھڑلّے سے اندر چلا جاتا۔ ایک شام بابے کی چھت پر میرے ایک یار صادق علی عرف دادو موچی کی آواز سُنائی دی۔ میں چھت پر پیپل کے ایک تنے سے لالٹین لٹکائے چارپائی پر بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ صادق علی کسی بات پر بابا سے اُلجھ رہا تھا۔ بابا بھی کچھ غصے میں آ گیا۔ اُس نے صادق علی کی بات سُنی ان سُنی کر دی اور بلند آواز سے مجھے بلانے لگا۔

''جیبد (جاوید) او پُتر جیبد! آ ایس نوں گل سمجھا۔''

میں بابا خوشی محمد کی چھت سے گزرتا ہوا بابا ٹوہری کے پاس پہنچ گیا۔ کہنے لگا: ''او بھلی جئی گل سی ............ آہو یاد آ گئی اے۔

بُرا جھگڑنا نال فقیر ہوندا ، جانوں مار دینا عقل دانیاں دی

وارث شاہ جیوں سنکھیا چوہیاں نوں، سنکھ مُلاں نوں، بانگ جیوں باہمناں نی

نہیں نا، جھگڑا چنگا ہوندا فقیر نال؟'' بابا نے مجھ سے تائید چاہی۔

''جھگڑا تو کسی سے بھی اچھا نہیں ہوتا۔ بابا جی اور فقیر سے جھگڑا تو بالکل بے عقلی کی بات ہے۔'' میں نے بابے کی بات کی تائید کر دی۔

بابے نے اپنے تازہ بھرے حقّے کا ایک لمبا کش لیا۔ پھر صادق علی کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: ''ایس نوں آکھدے نی سیانف۔'' بابا پھر میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا ''ہور جیبد پُتر! کیہ حال ای؟''

''ستے خیراں نیں بابا جی!'' بس یوں ہی میرے منہ سے نکل گیا۔

''بلّے بئی بلّے .................. کیہڑی کیہڑی؟''

میں کچھ confuse ہو گیا کہ مَیں نے تو ایک سادہ سا پنجابی محاورہ بولا تھا۔ اب میں بابے کو کیا جواب دوں!

''دس پُتر، ایہہ ستے خیراں کیہڑ یاں نیں؟''

''بابا جی آپ ہی بتا دیں۔''

بابا ٹوہری زیرِ لب مسکرایا اور کہنے لگا:

''ماپیاں دی خیر

سوانی دی خیر

پُتراں دی خیر

دھیاں دی خیر

دُدھ دی خیر

پیلی بنّے دی خیر (یعنی کاروبار کی خیر)

ویاہی ہوئی دھی تے اوس دے ٹبر دی خیر''

اب اِس بات کو طویل مدت گزر گئی ہے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہو رہی تو بس یہی کچھ بتایا تھا بابے ٹوہری نے۔ آج تو شاید پنجاب کی دھرتی کا کوئی باسی اس کی تصحیح بھی نہ کر سکے گا۔ مجھے یاد ہے کہ بابے نے یہ بھی بتایا تھا کہ فقیر لوگ جب صدا دیتے ہیں کہ ''وسدے ویہڑے تے دُدھ پُتر دی خیر'' تو وہ دراصل انھی سات چیزوں کی خیر طلب کر رہے ہوتے ہیں۔

چیچو کی ملیاں کے لوگوں میں گاؤں کے لوگوں والی ساری برائیاں موجود تھیں۔ رسہ گیری، سازش اور لالچ اَن پڑھتا کی لومڑی کے بچے ہیں۔ یہ بچے اِس ماحول میں خوب پرورش پا رہے تھے۔ کسی ایک شخص کا اچھا لباس دوسرے کے پیٹ میں یوں مروڑ پیدا کرتا تھا کہ خدا کی پناہ۔ وہ چاہتا تھا کہ اللہ کرے یہ نئے تہبند اور نئی قمیض والا بندہ مر ہی جائے۔ دوسرے کی خوشی پہ خوش ہونا اُنھیں آتا ہی نہ تھا۔ انتہا یہ ہے کہ ایک بار پیر خادم حسین شاہ جی نے عید میلاد النبیؐ کے موقعہ پر شہر سے لاؤڈ سپیکر منگوایا تاکہ تہوار کا سماں بندھ سکے اور گاؤں کی زنانیاں بھی تقریریں سُن سکیں۔ اُسی روز گاؤں کے ایک غیر سُنی مسلمان نے گاؤں کے ایک شخص سے لاؤڈ سپیکر کرائے پر لے کر تقریریں شروع کر دیں۔ جہاں یہ سپیکر لگایا گیا وہ گھر گاؤں کی مسجد کی ہمسائیگی میں تھا۔ ظاہر ہے اُس روز یہ حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن اُس واحد گھرانے نے اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے یہ سب کچھ کر دکھایا۔ دوسری طرف لاؤڈ سپیکر کرائے پہ دینے والے

شخص کو بھی ذرا خیال نہ آیا کہ دو سِکّوں کی خاطر گاؤں کے امن کو برباد کرنے کو تیار ہو گیا۔ شاید اُسے اِس بات کی تکلیف ہو گی کہ سپیکر شہر سے کیوں منگوایا گیا ہے اور اُس سے کیوں نہیں لیا گیا۔

گاؤں کے جنوب میں مسجد کے صرف چند ہی قدم کے فاصلے پر چاچے جنابے کے کھیتوں میں شیشم کے خوب صورت اور بلند قامت درخت اُگے ہوئے تھے۔ گاؤں کے مزدور پیشہ لوگ ٹیکسٹائل مِلوں میں رات کی ڈیوٹی کے بعد، ٹاہلی کے اِن درختوں کی گھنی چھاؤں کو گوشۂ عافیت سمجھتے اور دن کے وقت نیند پوری کرنے کے لیے اپنی چارپائیاں وہاں لے جاتے۔ تعجب ہے کچھ لوگ وہاں سے تکیے اور چادریں غائب کر دیتے۔

ایک بار شاہ جی نے مسجد میں ایک ختم مبارک کا اہتمام کیا۔ مسجد میں لاؤڈ سپیکر بھی موجود تھا اور شیرینی بھی، لیکن حاضرین کی تعداد بہت کم تھی۔ شاہ جی کے ساتھ ساتھ میں بھی تشویش کا شکار تھا چونکہ میں انتظامیہ میں شامل تھا۔ تقریر ختم کر کے شاہ جی دعا مانگنے لگے اور مٹھائی کی ٹوکری کھولی گئی تو مسجد لوگوں سے بھر چکی تھی۔

گاؤں میں جہاں رسہ گیر، سازشی اور لالچی لوگ موجود تھے وہاں اچھے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی۔ صوبیدار عبدالغفور، چوہدری علی احمد، سیٹھ اروڑھا، طالب حسین قریشی، حاکم علی عرف تایا حاکو، مستری خورشید عالم، بابا بسم اللہ، تایا حسین بخش انبالوی، مستری عنایت علی، بابا مستری محمد دین کا پورا خاندان، سید اصغر علی شاہ، چاچا محمد صادق ہنجراء، خورشید عالم اور تاج دین ٹھیکیدار صُلح جُو، سیانے اور ہمدرد قسم کے لوگ تھے۔

یہی وہ ماحول تھا جس میں 24 نومبر، 1953ء کی ایک صبح اِس بے رحم دُنیا سے نبرد آزمائی کے لیے قدرت نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ اُس دُنیا میں جو امیبا کی طرح جسامت اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی ہے۔ جو لومڑی کی چالاکی کو بھی مات دے جاتی ہے۔ جو بجھنگے کی مادہ کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ جو کوئل کی عدم موجودگی میں اُس کے گھونسلے سے اُس کے انڈے نکال کر اپنے انڈے رکھ دیتی ہے۔ کوئل بیچاری انڈے سیتی ہے اور پھر انڈوں سے بجھنگی کے بچے نکلتے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے، ایک دم حیران ............ مَیں تو اِس دُنیا میں کہیں فِٹ نہیں ہوتا۔ ایک کلّ بے کار ہوں۔

گاؤں کے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک گُردوارہ ابھی تک موجود تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہاں پرائمری سکول بنا دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں ایک چھوٹی سی نئی بلڈنگ بھی تعمیر کر دی گئی جس کے دو کمرے تھے۔ بڑے کمرے میں پانچوں جماعتوں کے لڑکوں کے علاوہ کچی اور پکی کے بچے بھی مستفید ہوتے تھے اور چھوٹے کمرے میں ایک چوبی صندوق پڑا رہتا تھا۔ 1959ء کے موسم بہار میں وہاں ایک بونگے سے بچے کا اضافہ کر دیا گیا جس کی ناک بہتی رہتی تھی اور وہ ملیشیئے کی قمیض کے کفوں کے ساتھ ناک صاف کرتا رہتا۔ سکول کے داخل خارج رجسٹر پر اُس کا نام درج کروایا گیا ''اصغر علی عُرف جاوید اقبال''۔ یہ کیا نام ہوا؟ اصغر علی عُرف جاوید اقبال؟ طالب علم کو پتہ چلا نہ مدرّس کو اور نہ سرپرست کو۔

## ماسٹر نذیر احمد صاحب

سکول کے اکلوتے 'اُستاد' ماسٹر نذیر احمد شیخوپورہ سے سائیکل پر چچو کی ملیاں جاتے۔ چھوٹے سے کمرے کا antique تالا کھولتے اور آواز لگاتے ''اوہ مُنڈیو! اپنے اپنے ٹاٹ جھاڑو۔'' لمبے لمبے ٹاٹوں کو دونوں سمتوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا جاتا اور پھر مئی کی آندھیوں کی طرح گرد کا طوفان آسمان سے باتیں کرتا نظر آتا۔ جن دِنوں مَیں تیسری جماعت میں تھا، چچو کی ملیاں ریلوے اسٹیشن پر ایک بٹ صاحب کی بحیثیت اسٹیشن ماسٹر تعیناتی ہوئی۔ بٹ صاحب بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے اور گاڑیوں میں وقفہ کے دوران اکثر خراٹے لیتے نظر آتے تھے۔ گرمیوں میں بعض اوقات تو اُن کا فین پُلر (Fan Puller) بھی کرسی پہ گرا ہوتا اور چھت کے ساتھ لٹکتا جہازی سائز کا کپڑے کا پنکھا ساکن ہو چکا ہوتا۔ چونکہ گاؤں میں لڑکیوں کا سکول نہیں تھا، اِس لیے اُنھوں نے مجبوراً اپنی بیٹی کو بیٹے کے ساتھ ہی لڑکوں کے اسکول میں داخل کروا دیا۔ چچو کی ملیاں کے میلے کچیلے لڑکوں نے پہلی بار اپنے درمیان ایک سمارٹ سی گوری چٹی لڑکی دیکھی تو اُن کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ مجھے اُس کا نام تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ اُس کا بھائی اُسے پپّی کہتا تھا۔ پپّی کوئی دس گیارہ سال کی دراز قد اور سڑیل سی لڑکی تھی، بلکہ لڑکی کیا تھی چھوئی موئی کا پودا تھا یا یوں کہیے کہ لڑکوں کی آرزوؤں میں رنگ بھرنے والی مصوّرہ تھی۔ ماسٹر نذیر احمد چھٹی کر کے اور کمروں کو تالے لگا کر شیخوپورہ کے قریب پہنچ چکے ہوتے لیکن لڑکے تھے کہ ریلوے اسٹیشن کا طواف کر رہے ہوتے کہ کہیں پپّی

سے دو باتیں کر لیں جو ماسٹر نذیر احمد کی موجودگی میں ممکن نہ تھیں۔

میں اصغر علی عُرف جاوید اقبال جسے گاؤں میں جیدی، جیدو اور بھولا کے ناموں سے بلایا جاتا تھا، جلد ہی کتابی کیڑا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ابتداء میں مجھے کتابی کیڑا کہا جانے لگا تو میرے پلّے کوئی چیز نہ پڑتی تھی کہ ایسا کیوں کہا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے بابا ٹوہری کی زبان میں اس کے 'تر جاویں' کا پتہ چل گیا۔ سکول کے 6 سال بس لمحوں میں بیت گئے۔ 1965 میں جس روز پانچویں کا امتحان، جسے سنٹر کا امتحان کہا جاتا تھا، دینے کے لیے شیخوپورہ گئے تو ماسٹر نذیر احمد نے مجھے بہت پیار کیا اور مجھے ڈھیروں دُعائیں دیں۔ شاید وہ مجھ سے بہت اچھی پرفارمنس کی توقع رکھتے تھے۔ یہ ماسٹر نذیر احمد اور سکھوں کے گرو دوارے میں بنا پرائمری سکول دونوں ہی میرے ذہن پر اَن مِٹ نقوش چھوڑ گئے۔ اُن کی فسوں گری کون کافر بھول سکتا ہے!

ماسٹر نذیر احمد .................. وہ آدم زاد تھا یا جن .................. کچی، پکی، اور اوّل سے پنجم تک سات جماعتیں اور سینکڑوں طالبِ علم .................. 8 میل کا سائیکل پہ سفر کر کے چچو کی ملیاں آنا اور پھر بچّوں کو مکمل نیک نیتی سے پڑھانا.................. ایک ایک طالب علم سے سبق سُننا، پہاڑے یاد کروانا، سنٹر کے پانچویں کے امتحان کی تیاری اور سکول کے سب انتظامی اُمور.................. ایک پہاڑ نظر آتا ہے یہ سب کچھ، لیکن وہ فرشتہ سیرت ماسٹر نذیر احمد .......... تن واحد وہ سب کچھ کرتا رہا۔ مَیں کیا لکھوں اُس کے بارے! حضرت واصف نے لکھا ہے: ''اِس دُنیا میں جتنے بھی قابلِ ذکر اور قابلِ قدر نفوس آئے، وہ ہمیشہ وسیع کائناتی، عظیم تخیل کے مطابق کام کرتے رہے۔ اُنھوں نے اپنے زمانے سے اپنے وقت کی قیمت حاصل نہیں کی اور آج ہر زمانہ اُن کا زمانہ ہے۔ کوئی زمانہ اُن کے ذکر سے خالی نہیں۔ کوئی دور اُن کے دور کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کوئی بقا اُن کو فنا سمجھ کر ترک نہیں کر سکتی۔'' یہ شاید میرے مؤخر الذکر اُستاد نے اوّل الذکر اُستاد کے لیے ہی لکھا تھا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ میرے ہاتھوں میں اِس وقت جو قلم ہے، یہ قلم مجھے ماسٹر نذیر احمد نے تھمایا تھا۔ سرکنڈے کا بنا خوب صورت قلم، درمیان میں چھوٹی سی کاٹ، صاف دُھلی ہوئی تختی، تختی پر سیدھی،

عین سیدھی 180 درجے کی لکیریں اور ماسٹر نذیر احمد کی کڑکتی سوٹی! سبحان اللہ! کیا نظارہ تھا وہ!

ایک دن سوا اور اڑھائی کے پہاڑوں میں سے کسی ایک میں بھول ہوگئی۔ ماسٹر جی نے حکم دیا:

''اُٹھ کے کھلوجا'' .................. ''کندھ تے ہتھ رکھ دے'' .................. ''تلیاں زور نال کندھ دے نال لالے'' .................. حکم کی تعمیل ہوگئی تو ماسٹر جی نے میرے ہاتھوں پر چھڑیاں لگانی شروع کیں۔ میری چیخیں نکل گئیں اور پورے سکول نے سُنیں۔ مجھے جب کبھی بھی وہ سوٹیاں یاد آتی ہیں تو میرے منہ سے بے ساختہ یہ دُعا نکلتی ہے کہ اے اللہ! ماسٹر جی نے جتنی چھڑیاں ماری تھیں، جنت میں اتنے ہی اُن کے درجات بلند فرمادے۔

پانچویں کا امتحان دیا تو گاؤں کا پرائمری سکول اور ماسٹر نذیر احمد پرائے ہوگئے۔

اس کا حساب حشر تک کون لگائے گا بھلا
تجھ سے گیا تو کیا گیا ، مجھ سے گیا تو کیا گیا

اِسی سکول میں زیرِ تعلیم تھا کہ ایک روز سکول سے گاؤں جاتے ہوئے راستے میں پڑتے گنّے کے کھیت دیکھ کر گنّا چوسنے کو دل مچل آیا۔ میں نے تختی بستہ ایک طرف رکھے اور مرضی کا ایک گنّا توڑ لیا۔ گنّا پکڑ کر گاؤں کی طرف بڑھنے کا مطلب تو آگ سے کھیلنا تھا لہٰذا وہیں بیٹھ کر گنّا چوسنا شروع کر دیا۔ کھیت کا مالک، جس کا نام مجھے 6 عشروں کے بعد بھی یاد ہے، کہیں دُور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی وہ گنّا چھینا اور میری کمر اور ٹانگوں پر برسانا شروع کر دیا۔ میں روتا چیختا رہا اور وہ اس گنّے سے میری پٹائی کرتا رہا۔ میری عمر اُس وقت کوئی 7/6 سال ہوگی۔ لیکن اُسے ذرا ترس نہ آیا۔ یہی نہیں بلکہ پھر اُس نے ہاتھ سے گنا رکھا اور میرے دونوں پاؤں سے پکڑ کر مجھے اُلٹا کر دیا۔ پھر بھی اُس کی سفاکیت کو اطمنان نصیب نہ ہوا تو اُس نے میرے اُلٹے کیے سر کو ساتھ والے بہتے کھال میں ڈُبکیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ بد بخت کتنی ہی دیر مجھے ڈبکیاں دیتا رہا اور اس دوران انتہائی غلیظ زبان بولتا رہا۔ پھر وہ مجھے نیم مردہ حالت میں وہیں چھوڑ کر گنّا ہاتھ میں پکڑ کر یوں اکڑ اکڑ کر گاؤں کی طرف چلنے لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ دیکھو میں نے کیا کر دیا ہے۔ وہ بڑا ہے وقت کا فرعون اور نمرود۔ اے اہلِ بستی! ہے کوئی تم میں میرے جیسا؟ .......... یہ حادثہ کسی معصوم ذہن کو ایک خاص طرح کے ماحول سے متنفر کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا 'ہولوکاسٹ' تھا۔

**شیخوپورہ میں داخلہ:** جماعت ششم میں مجھے طارق ہائی سکول شیخوپورہ میں داخل کرا دیا گیا، جہاں میرے بڑے بھائی ڈاکٹر شوکت علی مرحوم پہلے ہی زیرِ تعلیم تھے۔ طارق ہائی سکول، شیخوپورہ کے مغربی جانب گورنمنٹ کالج کے قریب ایک کشادہ عمارت میں ہے۔ اُن دِنوں طارق ہائی سکول شیخوپورہ کے ہیڈ ماسٹر خان غلام اکبر خاں تھے جو ایک گرانڈیل گینڈے کی طرح سکول کے چاروں اطراف گھومتے اور جس طرف سے گزرتے، سب کے کس بل نکل جاتے۔ سکول کے قابلِ ذکر اساتذہ میں علاؤ الدین بھٹی صاحب، عتیق الرحمٰن صاحب، فقیر حسین صاحب، مرزا عبدالحمید صاحب، بابا نور دین صاحب، تایا فتح محمد جی اور ماسٹر محمد شریف صاحب شامل تھے۔ چاروں مؤخر الذکر اساتذہ نے سرکاری ملازمتوں سے ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں دوبارہ نوکری حاصل کی ہوئی تھی۔ بزرگ آدمی تھے اور بوڑھے لوگوں والی ساری عادات ان میں موجود تھیں۔ علاؤ الدین بھٹی صاحب ایک نہایت ہی شریف النفس انسان تھے۔ اُن کی سادگی، شرافت اور شفقت کی آج تک لوگ مثال دیتے ہیں۔ میں نے میٹرک کا امتحان اِسی سکول سے پاس کیا۔ اُن دِنوں چیچو کی ملیاں سے شیخوپورہ جانے کے لیے واحد ذریعہ ٹرین تھی۔ سردی ہوتی یا گرمی، گاؤں سے صبح پانچ یا ساڑھے پانچ بجے ہی نکلنا پڑتا۔ موسمِ سرما میں بھی فجر ہی کے وقت ریلوے اسٹیشن پہنچنا پڑتا۔ ملیشیئے کی قمیض اور پاجامے کے ساتھ ماں کے ہاتھ کا بُنا ہوا سویٹر اور بعض اوقات لنڈے کا مفلر شدید سردی کے تھپیڑوں کے سامنے حفاظتی دیوار بنتے۔ سردیوں میں جب طارق سکول پہنچتے تو ابھی آسمان پر ستارے نظر آ رہے ہوتے تھے۔ سکول کی اسمبلی ہونے تک لڑکوں کے درمیان جو بے ہودگی ہوتی اُسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

گاؤں کے پرائمری سکول اور شیخوپورہ کے طارق ہائی سکول میں زیرِ تعلیم رہتے ہوئے گاؤں کے کھدّو کُھنڈی، گلی ڈنڈا، چھتر کِلاّ، کانواں گھوڑی، لُکن میٹی اور کبڈی میں دلچسپی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ کھدو کھنڈی کے علاوہ میں نے شاید ہی کبھی کسی کھیل میں عملی حصہ لیا ہو۔

**چیچو کی ملیاں کا برگدِ کُہن:** میرا مستقبل تابناک نہیں، مجھے اس کی فکر نہیں۔ میں اپنے حال سے

انصاف نہیں کر پا رہا، مجھے اِس کا بھی غم نہیں ہے۔ میں بس اِس صدمے سے بے حال ہوں کہ مستقبل تیزی سے حال میں اور حال ماضی میں بدل رہا ہے۔ اس ماضی کی طرف جب بھی جھانکتا ہوں تو مجھے اپنے گاؤں کا برگدِ کُہن ضرور یاد آتا ہے۔

گاؤں میں جب شام تک دھوپ نا قابلِ برداشت ہوتی تھی تو کچھ لڑکے کھدو کھنڈی چھوڑ دیتے تھے اور دھیان کانواں گھوڑی اور باندر کلّے کی طرف ہو جاتا تھا اور برگد کے نیچے سماں بندھ جاتا تھا۔ مسجد کے باہر یہ درخت تپتی دوپہروں میں موسم گرما کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا تھا۔ بابے اروڑھے کی پاشا کی ٹیم سے لڑکیوں کی کیکلی تک، ثقافت کے سارے رنگ اِس بوڑھے برگد نے دیکھ رکھے تھے۔ بوڑھ کے اس درخت کے ایک طرف بابے محمد دین کی حویلی کی دیوار کے ساتھ کانواں گھوڑی کا کھیل ہوا کرتا تھا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اُس عہد کے نوجوان کی کمر میں کیسا سٹیل بھرا ہوتا تھا کہ گھوڑی بنے نوجوانوں میں سے کسی کو کبھی کمر درد نہ ہوا، جب کہ کھیل کو دسے دُور آج کے نوجوان پر تو لکھنوی عورتوں کا گمان ہوتا ہے۔

بجلی سے محروم اِس گاؤں میں آگ برساتے سورج سے توجہ ہٹانے کے لیے برگد کے نیچے 'باندر کلّا' کا کھیل خاصا کارگر ثابت ہوتا تھا۔ ساون بھادوں میں یہی شجرِ سایہ دار جھولوں کے بھی کام آتا تھا۔ بڑے قد کاٹھ کے لڑکے تھوڑے ہی فاصلے پر چاچے جنابے کی ٹاہلیوں کے ساتھ پینگ ڈال لیتے تھے جبکہ چھوٹے لڑکے اور گاؤں کی لڑکیاں اِسی برگد کے ساتھ جھولے لیتے رہتے۔

جھولوں کے دِنوں کی خاص بات میرے ایک یار صادق علی کی آواز بھی ہوتی تھی۔ صادق علی، جسے عام طور پر لڑکے دادو موچی کے نام سے یاد کرتے تھے، ایک شریف النفس اور سادہ سا لڑکا تھا۔ سکول کی اُس نے شکل بھی نہ دیکھی تھی لیکن کچھ گیت اور ٹپّے اُس نے ضرور یاد کر رکھے تھے۔ شیشم کا درخت جسے مقامی زبان میں ٹاہلی کہتے تھے، اُس کی پسندیدہ آرام گاہ تھی۔ پینگ کے زوردار ہلاروں کی وجہ سے جب بھی کوئی تنا ٹوٹ جاتا یا ٹوٹنے لگتا تو صادق علی کی زبان پر فوراً آتا:

پینگ ٹُٹ گئی ہلارا کھا کے تے ٹاہلیاں دے ٹہن بھج گئے

وہ پینگ، یا پینگ سے گرنے والے کی حالتِ زار سے بے نیاز پورا گیت سُنا دیتا۔ صادق علی

گاؤں کے دیگران پڑھ لڑکوں سے تھوڑا مختلف تھا۔ایک باران پڑھتا کے شکارکسی سجن متر سے اُسے کوئی تکلیف پہنچی۔وہ شام کو شیشم کے درختوں کے نیچے جا بیٹھا اور گانے لگا:

’ج‘ جس درخت دا پھل کھا یئے ،سُک جاوے تے اوس نوں کٹیئے نہ

جنھوں یار کہیے ، اوہدے نال رہیے ، لوکی دین طعنے پِشاں ہٹیے نہ

جِنھوں یار کہیے،اوہدے نال رہیے،جنھوں یار کہیے اوہدے نال رہیے

صادق علی کی عجیب سی کیفیت تھی اوروہ مسلسل دُہرائے جا رہا تھا ’’جِنھُوں یار کہیے اوہدے نال رہیے،لوکی دین طعنے ،پِشاں ہٹیے نہ‘‘ ................کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ اُس کی ’یار‘ سے صلح ہوگئی ہے۔

چیچو کی ملیاں میں گزری زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا ساون بھادوں گزرا ہوگا جس میں گاؤں کے جوہڑ کے پانی نے اس برگد کو نہ چھُوا ہو لیکن بارش کا زور ٹوٹتے ہی پانی اُتر جاتا تھا۔انٹرٹینمنٹ اور تشویش کے ملے جُلے ان لمحات میں لڑکے کیا،لڑکیاں تک گھروں میں نظر آنے والا ہر کاغذ کشتیوں کی نذر کر دیتیں۔مجھے یاد ہے عہدِ جوانی میں جب میں نے پہلی بار جگجیت سنگھ کی یہ نظم سُنی تھی تو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا تھا اور بچپن کی کاغذ کی کشتیوں کو یاد کر کے روتا رہا............:

یہ دولت بھی لے لو یہ شہرت بھی لے لو ، بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی

مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون ، وہ کاغذ کی کشتی ، وہ بارش کا پانی

جمعرات کے روز امّی چراغی کا تیل مسجد میں ڈالنے کے لیے دیتیں تو میں اُس میں سے کچھ نہ کچھ ضرور بچا لیتا۔میں کیا،گاؤں کے سارے لڑکے لڑکیاں سرسوں کے تیل کی اِس خوب صورت چوری کے عادی تھے۔جمعرات شام کو ہم سب یہ بچا ہوا تیل لے کر برگد کے نیچے جوہڑ کے کنارے بیٹھ جاتے اور قطرہ قطرہ تیل پانی میں بہانے لگتے۔قوسِ قزح کے رنگ بناتے تیل کے قطرے دیکھتے ہی دیکھتے دور تک پھیل جاتے۔وہ منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔بعض اوقات اِس میں مقابلہ بازی بھی ہوتی تھی کہ کس نے زیادہ خوب صورت گُھگھو گھوڑے بنائے ہیں۔یہ مقابلہ جیتنے کے لیے ہم کئی بار جوہڑ میں گرتے رہے۔وہ گُھگھو گھوڑے بیتِ عنکبوت کی طرح عارضی اور کمزور ہی سہی،پھر بھی میرے ذہن میں آج تک صحیح سلامت

موجود ہیں۔بس ایک کلک کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر چیز سامنے۔

ایک ساون میں سانپوں کی ایک جوڑی برگد کے نیچے پہنچ گئی۔ بارشوں کے موسم میں سانپوں کا بِلوں سے باہر آ جانا کوئی انہونی بات نہیں ہوتی لیکن دو سانپوں کا اس طرح اکٹھے ڈھٹائی سے آبادی میں آ داخل ہونا میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔کسی شخص نے شور مچایا تو دوسرے نے لاٹھی سے ایک سانپ کو مار دیا جب کہ دوسرا غائب ہوگیا۔ بابا محمد دین یہ منظر دیکھ رہا تھا۔اُس نے سانپ مارنے والے کو احتیاط کی تاکید کی اور بتایا کہ اُس نے نر سانپ کو مارا ہے اور مادہ بھاگ گئی ہے۔اب وہ ضرور اس پر حملہ کرے گی۔وہ ناگن، سانپ مارنے والے کو خیر کیا ڈھونڈتی اور کیا حملہ کرتی، بابے محمد دین کا وہ جملہ میرے ذہن میں ضرور پیوست ہوگیا۔ایک طویل مدت کے بعد جب vision کچھ اور ہو چکا تھا تو پتہ چلا کہ ہاں یہ درست ہے کہ بہت سی ماداؤں کے برعکس ناگن اور پینگوئین اپنے نر سے بہت پیار کرتی ہیں اور وہ اس پر جان قربان کردیتی ہیں۔سُنا ہے ہمارے پنجاب میں یہ جو اوڈھنی ہوتی ہے یہ بھی زندگی میں کسی دوسرے نر کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

اس برگدِ کُہن کے صرف چند گز کے فاصلے پر مسجد کا دروازہ تھا۔پیر سید جماعت علی شاہ علی پور سیداں والے کی گاؤں میں سالانہ آمد پر (جسے عُرس کا نام دیا جاتا تھا) یہ جگہ روحانی مرکز بن جاتی تھی۔کبھی کبھی اجتماع مسجد کی بجائے برگد کے نیچے ہوتا۔وہیں میں نے وہ نعتیں سُنی تھیں جنھوں نے مجھے حیاتِ سرورِ کائناتﷺ کے مطالعہ کی طرف راغب کیا تھا۔ایک ایسے شخص کی زندگی کا مطالعہ جس کے بارے میں نامور مستشرق تھامس کارلائل نے کہا تھا، اور درست کہا تھا کہ کسی شہنشاہ نے اپنے تاج اور شاہی کلاہ کے باوجود اپنی اِتنی اطاعت نہیں کروائی جتنی کہ پیوند لگے ہوئے جُبہ پوش اس شخص کی ہوتی ہے جسے لوگ محمدؐ کے نام سے جانتے ہیں۔

وہیں سُنی ایک نعت مجھے زندگی بھر نہ بھول سکی اور جس کا بعد میں پتہ چلا کہ وہ میاں محمد بخش کا کلام ہے۔دیکھیئے:

نعت اُنھاں دی لائق پاکی کیہ دسّاں ناداناں، میں پلیت ندی وچ وڑیا، پاک کیتا تن جاناں
نال اشارت ٹکڑے کیتا جس نے چن اسمانی، سُک روڑاں تھیں جس پڑھایا کلمہ ذکر زبانی

گاؤں میں آنے والی زیادہ تر براتوں کی میزبانی یہی برگدِ کہن کرتا تھا۔ایک بار بابا ٹوہری ایک برات سے کھانا کھا کر گھر آ رہا تھا کہ میرے والد صاحب نے دریافت کیا کہ ''چاچا ٹوہری! اِتنے غصے میں کیوں ہو؟''

''کھیہ تے سواہ کھوایا نیں، ایہہ روٹی کھوائی نیں؟ ایہنج پکائی داا اے زردہ؟''

بابے ٹوہری نے جواب دیا۔

''چاچا! کیاہُوا زردے کو؟'' ابّا جی نے پوچھا۔

''محمد لطیف! ویکھ ناپُتر! پیر وارث شاہ نے تے ایوں دے چولاں دی کِدھرے دس نئیں پائی۔ لے سُن'':

مشکی چاولاں دے بھرے آن کوٹھے، سون پتی دے جھونپڑے چھڑی دے نی

باسمتی ، مسافری ، بیگمی سن ، ہر چند تے زردے دھڑی دے نی

باریک سفید ، کشمیر ، کابل ، خورش جیہڑے حور تے پری دے نی

بابے ٹوہری نے وارث شاہ کے یہ مصرعے پڑھنے کے بعد والد صاحب سے سوال کیا کہ ''بتاؤ اِن میں سے کون سے چاول انھوں نے پکائے ہیں؟''

اِس بوڑھے برگد نے چیچو کی ملیاں میں بستی اولادِ آدم کی رعنائیوں کا جو نظارہ کیا ہے، اُس میں وہ مُجرے بھی ہیں جو لاہوری طوائفوں کا خاصا ہوتے تھے۔

**امرودوں کا ٹوکرا اور میں:** چیچو کی ملیاں کے پرائمری سکول اور شیخوپورہ کے طارق ہائی سکول کے دَور کی یادوں کو Display پہ لانے کے لیے مجھے کسی کلک کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہر بات، بھلی یا بُری، ہر لمحہ یاد رہتی ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ چھٹی جماعت میں زیرِ تعلیم رہتے ہوئے جب تعطیلاتِ گرما ہوئیں تو میں نے ابا جی سے پوچھا کہ مجھے اِن ایاّم میں کیا کرنا چاہیے۔

جواب ملا: ''جو تیرا دل کردا اے۔''

صبح مَیں نے ابا جی سے تین روپے لیے، گھر سے پرانی سی ایک ٹوکری پکڑی، ایک ٹوٹا پھوٹا ترازو

ڈھونڈا اور گاؤں سے کچھ فاصلے پر امرودوں کے باغ میں جا پہنچا۔ تین روپے میں دو دھڑیاں (دس سیر) امرود مل گئے۔ واپسی پر گاؤں میں داخل ہوتے ہی مَیں نے آوازیں لگانا شروع کر دیں:

''بوٹیاں دے پکے مِٹھے امرود، لے لو مِٹھے امرود''

وہ ٹوکری امرودوں کی ٹوکری کہاں تھی، مجھے اپنے سر پر فلک کا سایہ نظر آ رہا تھا، وہ فلک جس کے پیچھے چُھپا بیٹھا کاتبِ تقدیر تقدیریں لکھتا ہے؛ لکیریں کھینچتا ہے؛ پھر مٹاتا ہے؛ اپنی مرضی سے دانوں پر مہریں لگاتا ہے؛ اُنھیں تحت الارض دبا دیتا ہے اور پھر انسانوں کو ترغیب دیتا ہے کہ اپنے اپنے مقدر کا دانہ زمین سے نکال لاؤ۔ مَیں اس ٹوکری سے اپنے حصے کا دانہ ڈھونڈنے کی کوشش میں شام کو ایک اُٹھنّی بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب میرے پاس تین نہیں، ساڑھے تین روپے تھے۔ مَیں ایک لڑکا نہیں بلکہ 'الکاسب حبیب اللہ' کے ارشادِ مبارک کے مطابق، اللہ کا حبیب بن چکا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں، قینچی چپل پہنے گاؤں کی گلیوں میں بغیر ٹھنڈے پانی کے کئی میل کا سفر طے کر کے مَیں نے بالآخر اپنا نام اللہ کے محبوبوں میں لکھوا ہی لیا۔ اب گرمیوں کے موسم میں اپنے ائر کنڈیشنڈ کمرے سے نکل کر ائر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھتے وقت پچھلی سیٹ پر 7up اور روح افزا کی فریز ہوئی بوتلیں رکھتا ہوں تو مجھے جون 1963 کا وہ دن ضرور یاد آتا ہے جس روز مَیں نے پہلی بار دھوپ میں پھر کر اُٹھنّی کمائی تھی۔ عصر کے وقت میں دس سیر امرود بیچ کر گھر پہنچا تو امی میرے انتظار میں تھی۔

امّی ............ آہ میری امّی ............ لکھنا مشکل ہو رہا ہے .................. مجھے لگ رہا ہے کہ یہ کاغذ لوحِ محفوظ ہے اور میرے ہاتھ میں اللہ کا قلم ............ امّی آخری لفظ ہونا چاہیے تھا ...... لیکن داستان تمام کیسے ہوگی؟

''امّی! مجھے پہچان لیا ہے؟ جاوید ہوں میں!'' میں نے اپنی قمیض کے آستین سے سارے دن کی گرد اور پسینہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب؟ تم اولاد ہو میری۔ میرے پیارے بیٹے ہو تم۔ کماؤ پتر ہو۔'' ماں مسکرا دی، لیکن اس کی مسکراہٹ کے اندر کسی تازہ گہرے گھاؤ کا کرب صاف نظر آ رہا تھا۔

امّی نے اپنی چادر کے پلّو کو پنکھا بنایا اور مجھے ہوا دینا شروع کی۔ پھر ساتھ پڑے پنکھے پر نظر پڑی تو وہ کتنی ہی دیر پنکھا جھلتی رہی۔ مَیں نے جاننے کی بہت کوشش کی کہ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی ہے یا کسی اذیت کا شکار، لیکن اِس کا جواب نہ مل سکا۔ وہ کتنی ہی دیر مجھ سے باتیں کرتی رہی لیکن اُس نے میرے کاروبار کا مجھ سے نہ پوچھا۔ عصر کی اذان سُن کر وہ اُٹھ کر ہینڈ پمپ کی طرف بڑھی تو اُس کی حالت یہ تھی کہ جیسے سزائے موت کا وہ مجرم پھانسی گھاٹ کی طرف بڑھ رہا ہو جو سراسر بے گناہ ہو۔

اگلے روز باغ کی طرف جاتے ہوئے میں یہ سوچتا رہا کہ کیا 10 سال سے کم عمر کا کوئی لڑکا 15 سیر وزن اُٹھا کر پھر سکتا ہے۔ مجھے اس کا کچھ اندازہ نہ ہوسکا لیکن مَیں نے باغ کے ٹھیکیدار سے تین دھڑیاں امرود مانگ لیے۔

''اج تیزی اے نِکیا! چھے روپے لگن گے۔'' باغ کے ٹھیکیدار نے کہا۔

''میرے پاس تو ساڑھے تین روپے ہیں۔ باقی کل دے دوں گا۔'' میں نے التجا کی۔

''جا جا کم کر .................. دو دھڑیاں لے جا .................. تے اٹھ آنے کل دینے نی۔''

''مَیں جی کل ..................۔''

''بوتھا بھن دیواں گا ای ............ بوہتی چبڑ چبڑ نہ کر۔'' ٹھیکیدار نے رعب جمایا اور یوں مَیں دو دھڑیاں امرود لے کر واپس آ گیا۔

میرے والد صاحب اُن دِنوں چیچو کی ملیاں کے برانچ پوسٹ ماسٹر تھے۔ اُنھوں نے گاؤں میں ایک دُکان بھی بنا رکھی تھی۔ تایا تاجدین ٹھیکیدار کے ساتھ مل کر محکمہ انہار میں چھوٹی موٹی ٹھیکیداری بھی کیا کرتے تھے۔ بھینس، ٹرانسسٹر ریڈیو، سائیکل، ٹارچ اور لالٹین سب کچھ ہمارے گھر میں موجود تھا۔ پیلی بنّے سے تربوز، خربوزہ، ساگ پات، پیاز، لہسن وغیرہ دستیاب تھا۔ تو پھر مَیں نے امرودوں کا ٹوکرا کیوں اُٹھایا؟ مَیں نے کبھی اِس کے آگے سوالیہ نشان لگایا ہی نہیں تو جواب کہاں سے ملے گا۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اُسی دور میں بہترین باسمتی چاول پیدا کرنے والا گاؤں کا رقبہ پھتّو والا کھوہ داؤد ہر کولیس کھاد فیکٹری کی نذر ہو گیا تو خیر الرازقین نے گاؤں کے لوگوں کے لیے رزق کے کئی دروازے

کھول دیے۔ تایا جی نے داؤد ہرکولیس کیمیکلز کام کرنے والی بورنگ کمپنی کے ملازمین کی رہائش کے لیے ریلوے لائن کے ساتھ بہت سے کوارٹرز تعمیر کر دیے جو آج تک 'ٹھیکیدار دے کوارٹر' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

ابّا جی اور تایا جی نے مل کر اپنے چھوٹے بھائی خورشید عالم کو داؤد ملز کے ساتھ ایک ہوٹل بنا دیا۔ بورنگ کمپنی کے ملازمین کے لیے وہ ہوٹل کسی فائیوسٹار سے کم نہ تھا۔ گھریلو طرز کے بنے ہوئے کئی کھانے، دیسی گندم کے اَن چھنے آٹے کی تنوری روٹیاں اور مزے دار گاڑھی لسّی زیرِ تعمیر ملز کے ملازمین کو ہوٹل کی طرف کھینچ لاتی۔ وہاں کئی کلچھّن قسم کے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا رہا لیکن تایا جی اپنی معاملہ فہمی سے مسائل نمٹا لیتے تھے۔

**برف کا عذاب:** میں نے بچپن میں کہیں سُنا تھا کہ بڑے لوگوں کو مصائب کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ جناب آدمؑ، یونسؑ، ایوبؑ، ابراہیمؑ اور رحمۃ اللعالمین علیہم السلام سب نے بے پناہ دُکھ دیکھے اور اُنھیں صبر سے برداشت کیا۔ اگر انبیائے کرام پر مصیبت آسکتی ہے تو اُن کی اولاد پر کیوں نہیں؟ مَیں بھی نبی کی اولاد ہوں۔ سوا مرود فروشی کے بعد مجھ پر ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ مجھے ابا جی کی طرف سے حکم ملا کہ صبح 5 بجے ٹرین پر شیخوپورہ جانا ہے اور پھر لاہور جانے والی پہلی گاڑی پر آدھا بلاک برف لے کر دورانِ تعطیلات روزانہ ہوٹل پر پہنچانی ہے۔ سو صبح بوری تھامی اور بذریعہ ٹرین شیخوپورہ پہنچ گیا۔ شہر سے برف خریدی، اس پر بوری چڑھائی، بوری پر رسی باندھی اور برف سر پر رکھ کے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ میرے پورے جسم پر برف سے گرتا اور بوری کی گندگی سے رنگین ہوتا پانی، عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ کمپنی باغ کے درمیان سے گزر رہا تھا تو ایسے محسوس کیا کہ لاہور جانے والی ٹرین اسٹیشن پر پہنچ چکی ہے۔ اُسی لمحہ اُس حافظ صاحب پر نظر پڑی جس سے ہم سکول جاتے ہوئے روزانہ مزے لینے کے لیے ٹائم پوچھتے تھے۔

میں نے بصارت سے محروم اللہ کی اُس شہکار تخلیق سے پوچھا کہ حافظ صاحب! کیا ٹائم ہوا ہے؟ جواب سُن کر احساس ہوا کہ اپنی ہی گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ دوڑ لگانے کی کوشش کی تو برف اُچھل اُچھل کر میرے سر پر ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگی۔ مَیں سڑک پر تماشا بنا ہوا تھا لیکن وہ جو عربی لوگ کہتے ہیں کہ:

عِــزَّالرَّجُلِ اِسْتِغْنَآءِ عَنِ النَّاسِ (آدمی کی عزت لوگوں سے بے نیاز ہوجانا ہے) مَیں بے نیاز ہو کے بھاگتا رہا اور برف گاڑی میں لادنے میں کامیاب ہو گیا۔ چیچو کی ملیاں اسٹیشن پر برف اُتاری، دوبارہ سر پر رکھی اور تقریباً ایک کلومیٹر پیدل سفر کر کے ہوٹل تک پہنچ گیا۔ یہ سلسلہ ساری تعطیلاتِ گرما کے دوران جاری رہا۔ برف کا یہ عذاب مجھے جب بھی یاد آتا ہے، میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

اور ہاں! جن حافظ صاحب کا مَیں نے ذکر کیا ہے یہ اکثر و بیشتر کمپنی باغ میں ٹہلتے نظر آتے تھے۔ ہاتھ میں سفید چھڑی پکڑے تیز تیز قدم اُٹھاتے اُنھیں ہمیشہ محوِ سفر ہی دیکھا۔ کبھی کبھی اُن کے ہاتھ میں تسبیح بھی ہوتی تھی۔ اِس نابینا شخص کو جاننے والا ہر راہ گیر اُس سے یہ سوال ضرور کرتا کہ ''حافظ صاحب! کیہ ٹائم ہویا اے؟'' جملہ مکمل بھی نہ ہو پاتا تھا کہ حافظ صاحب جواب دیتے ''7 بج کے 13 منٹ'' یا ''3 بج کر 21 منٹ وغیرہ وغیرہ۔ کبھی کبھار کوئی لڑکا کہہ دیتا کہ ''حافظ صاحب! سیکنڈ وی دس دیو'' تو جواب آتا 3 بج کے 21 منٹ 47 سیکنڈ۔ لوہُن 48, 50,49 تے 51۔

برف کے بلاک سے، امرودوں کے ٹوکرے سے اور پرچون کی دُکان سے روٹی تلاش کرتے کرتے بالآخر طارق ہائی سکول شیخوپورہ سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ اُن دِنوں 9th اور 10th کے علیحدہ علیحدہ امتحانات نہیں ہوتے تھے بلکہ میٹرک کا ایک ہی امتحان ہوتا تھا۔ رزلٹ کا انتظار تھا کہ ابا جی نے اپنی 'پوسٹ ماسٹری' کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے لاہور روڈ پر زیرِ تعمیر پنجاب کاٹن ملز کی انتظامیہ سے کہا کہ وہ مجھے نوکری دے دیں۔

**ہیلپر کی نوکری:** رب کی اِس خاکی دھرتی پہ دُکھوں کی ایک ورائٹی نظر آتی ہے۔ سب سے بڑا دُکھ تو خود انسان بننا ہے۔ انسان ............ آدمؑ کی اولاد، اللہ کا نائب، اشرف المخلوقات ہونا ............ بڑا مشکل کام ہے جی ............ محبت کی تلاش، اپنوں کی تلاش، سُکھ کی تلاش اور سب سے بڑھ کر روٹی کی تلاش۔ کچرا بنا دیتی ہے بندے کو یہ تلاش ............ اِس تلاش نے اگلے ہی روز مجھے قُلی بنا دیا۔ نوکری کا نام تھا سرویئر ہیلپر ............ کام تھا قُلی کا ............ بیدل نے کہا تھا:

ہر کُجا رفتم غبارِ زندگی درپیش بود     یارب ایں خاکِ پریشاں از کجا برداشتم

9 گھنٹے کی مشقّت کی قیمت 2روپے پڑی اور گاؤں میں ڈھنڈوراپٹ گیا کہ ''منڈا سٹھاں روپیاں مہینے تے نوکر ہوگیا اے۔'' -/60روپے تنخواہ ملی تو مَیں نے سب سے پہلے شہر سے ایک ڈکشنری اور 'آداب عرض' خریدا۔

اِس نوکری کے پہلے ہی روز مجھے احساس ہوگیا تھا کہ تقدیر کہیں گھات لگائے بیٹھی تھی، اور اب یہ اپنی روایتی ناانصافی کے ساتھ اپنے سارے ظالمانہ حربے مجھ پر آزما کر رہے گی۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ دھوپ میں گھما پھرا کر میرے ہاتھ میں ایک لٹھ سی دے دی گئی جس پر سُرخ رنگ سے کوئی اعداد لکھے ہوئے تھے۔ سروئیر نے مجھے ہدایت کی کہ اِسے کندھے پر رکھ لو اور سیدھے چلتے جاؤ۔ جہاں تمھیں آواز دوں گا، وہاں رُک جانا۔ کوئی ڈیڑھ سو گز فاصلہ طے کرتے کرتے میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا اور میرے بائیں کندھے سے رِسنے والے خون سے میری قمیض پر سُرخ دھبے نمایاں تھے۔ دِن گیارہ بجے کا وقت تھا اور سورج سوا نیزے پر آچکا تھا۔ جب سرویئر نے مجھے آواز دی تو میں قدرت کی ستم ظریفی پہ نوحہ کناں تھا۔ آواز سُن نہ سکا۔ جب اُس کی آواز میرے کانوں تک پہنچی اور میں اُس کی طرف متوجہ ہوا تو اُس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے واپس آنے کو کہا۔ میں تقریباً لڑکھڑاتا ہوا اُس تک پہنچا تو اُس نے حکم دیا کہ جاؤ، اب واپس جاؤ اور اب میری آواز اور میرے اشاروں کی طرف دھیان کرنا۔ یہی سزا ہے تمھاری۔ میں نیم مردہ حالت میں اُس جگہ واپس پہنچا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے وہ بیس کلو وزنی پیمانہ کچھ اوپر اُٹھانے کو کہا۔ جب کئی بار اُسے اُوپر نیچے کیا تو پھر اُس نے اپنی ہتھیلی میری طرف کی، جس کا مطلب تھا کہ 'Over'۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور اُستاد سرویئر کے اگلے حکم کا منتظر اُس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

وقت اور تقدیر دونوں درپئے آزار ہیں
ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزشِ غم کے لیے

(آغا حشر کاشمیری)

سورج کی جلا دینے والی کرنیں میری رگ رگ میں پیوست ہو رہی تھیں۔ مَیں سوچنے لگا کہ قیامت کب آئے گی، وہ کس طرح کی ہوگی، آئے گی بھی کہ نہیں ................ میں سوچ رہا تھا کہ یہ وہ سورج تو نہیں ہے جس کی خواہش حبیب جالب نے کی تھی:

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے

نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

سرویئر کی بے نیازانہ سی آواز آئی ، اشارہ ہوا اور میں اُس کی طرف چل پڑا، یہ سوچتا ہوا کہ گاؤں میں شاہ جی تو کہتے ہیں کہ اللہ بڑا عادل ہے، وہ کہیں جھوٹ تو نہیں کہتے !اور کئی سال تک یہی سوچتا رہا۔

**گاؤں کے ساون بھادوں :** جون کے آغاز میں گاؤں کی گلیوں میں بچوں کی جو پہلی اجتماعی آواز گونجتی تھی، وہ اس طرح کی ہوتی تھی:

ہیٹھوں سڑدے پَیر وے ربّا                اُتّوں سڑدا سِر وے ربا

دِھیاں دھیانیاں دی سُن وے ربّا                مینہ ورسا دے زوردار ربّا

پچھو کی ملیاں میں پرائمری سکول تھا اور وہ بھی صرف لڑکوں کا۔ گاؤں کی بچیوں کے پاس کرنے کا کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ 5/7 سال کے ایج گروپ کی درجنوں بچیاں ساون بھادوں میں گاؤں کی گلیوں میں گاتی پھرتی تھیں:

وس مینہا چٹیا                میں گُڈی گُڈا اِپٹیا

وس مینہا کالیا                میں گُڈی گُڈا اساڑیا

بچیوں کے علاوہ معصوم بچے بھی اِن مترنم دُعاؤں میں شامل ہو جاتے تھے۔ بارش کے لیے 'جدوجہد' کرنے والوں میں نوجوان بھی پیچھے نہیں رہتے تھے اور وہ راہ چلتے بزرگوں پر پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر پھینکتے رہتے تھے۔ بزرگ اچانک بھیگ جانے پر گالیاں دینی شروع کر دیتے تو پانی پھینکنے والے یوں خوش ہوتے جیسے وہ ساحلِ مراد پر پہنچ گئے ہیں۔ اُنھیں اُمید نہیں بلکہ یقین ہوتا تھا کہ ان گالیوں کے بعد بارش برس کے رہے گی۔

گاؤں کے جو بوڑھے گالیاں دینے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اُن میں بابا عزیز سندھو اور بابا خوشی محمد سرِ فہرست تھے۔ بس یوں سمجھیے کہ 'فارسی گردانوں' کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا تھا جو کئی روز تک چلتا رہتا۔ بابا خوشی محمد پاکستان ویسٹرن ریلوے کی ملازمت سے ریٹائرڈ تھا اور اُس کی جیب میں فری

ریلوے سیزن ٹکٹ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ایک جولائی میں اُس پر پانی پھینکنا مقصود تھا لیکن اس سے پہلے سیزن ٹکٹ کو گیلا ہونے سے بچانا بھی ضروری تھا۔اب وہ سیزن ٹکٹ نکلوانے کے لیے غلام مصطفیٰ (چاچا گوگا) نے گفتگو یوں شروع کی:

''بابا خوشیا! ساری عمر ریلوے کی خدمت کی ہے تُو نے اور 'پاس' (سیزن ٹکٹ) لیے پھرتا ہے ''تھرڈ کلاس'' کا۔

''تھرڈ دا نہیں،فسٹ دا اے،فسٹ کلاس دا' بابے خوشیے نے جواب دیا۔

''بُڈھے وارے جھوٹھ،نِرا جھوٹھ،توبہ توبہ'' چاچے گوگے نے اگلا وار کیا۔

''آہ تیری بے بے دا .................. '' کہتے ہوئے بابے نے پاس جیب سے باہر نکالا تو چاچے گوگے نے جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے چھین لیا۔بارش کی طلب گار ٹیم کے باقی ارکان جو سیزن ٹکٹ کو بچانے اور بابا خوشی پر پانی کی بالٹیاں پھینکنے کے لیے تیار بیٹھے تھے، بابے خوشی پر اُمڈ پڑے۔بس پھر بابے نے غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اِسی طرح کی فضا میں شب و روز کی چکی چلتی رہتی۔ بالآخر بابا خادم حسین شاہ صاحب (ف۔ 2010) گاؤں کے لوگوں کو اُس ہستی کے حضور اکٹھا کر دیتے جو بارش برسانے والی ہواؤں پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ وہ کھلے میدان میں نماز ادا کرواتے اور پھر اُلٹے ہاتھوں سے دعا منگواتے۔ اِس نمازِ اِستسقاء اور اُلٹے ہاتھوں کی دُعا میں نہ جانے کیا تاثیر بھر دی ہے قادرِ مطلق نے کہ کچھ ہی دیر کے بعد بارش شروع ہو جاتی۔ بابا عزیز، بابا خوشیا اور بابا ٹوہری جیسے بزرگ گاؤں کے لوگوں کو ساون کی بارش کی طرح ہی عزیز ہوتے تھے۔ بس پھر بارش کے متوالے کبھی سُرمئی، سُرخ اور سفید بادلوں کو دیکھ کر اور کبھی اِن بابوں کے معصوم چہروں کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے۔اس وقت گاؤں کے باہر چاچے جنابے کی ٹاہلیوں (شیشم کے درختوں) کو حال پڑتا نظر آتا اور مسجد کے باہر برگدِ کُہن بھی جھومنے لگتا۔ایسے میں چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کوئل کی کُوک دل کو لُبھانے لگتی تھی۔ بارش کی رفتار کم ہوتی تو بابا اُروڑا رسّے نکال لاتا یا پرالی کے رسّے خود بنا دیتا اور بڑ کے درخت پر پینگیں ڈال دیتا۔ یہی وہ منظر ہوتا تھا جب محبت کرنے والوں کے

لبوں پہ یہ میٹھے بول گونجنے لگتے تھے:

باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

اِسی برگد سے گاؤں کی بچیاں پوڑے بنانے کے لیے دُھلے ہوئے پتے توڑ کر لے جاتی تھیں۔ پھر گُڑ اور دیسی گھی میں گُندھا ہوا آٹا جب توے پر ڈالا جاتا تھا تو گھروں میں عید کا سماں بن جاتا تھا۔ گاؤں کی سب گلیاں پکی تھیں، اِس لیے بارش سے کوئی زیادہ مسائل پیدا نہیں ہوتے تھے البتہ گاؤں کا جوہڑ خوفناک منظر پیش کرتا تھا۔ بارش تھمنے کے چند گھنٹے بعد جوہڑ سے باہر اُمڈتا پانی داؤد ہرکولیس فیکٹری کے ساتھ چلتا سیم نالہ کھینچ کر لے جاتا تو پھر یہی جوہڑ سرسوں کے تیل سے بنتے لکھو گھوڑوں کے لیے اور کاغذ کی کشتیوں کے لیے موزوں بن جاتا۔

جون، جولائی اور اگست میں سکول سے چھٹیاں ہوتی تھیں، اِس لیے میرا زیادہ وقت حویلی کے عین درمیان میں موجود فلک بوس نیم کے نیچے گزرتا۔ نیم کے درخت کے جنوبی جانب کنواں ہوتا تھا جس کا پانی نیم کے نیچے سے گزرنے والی نالی سے بہتا ہوا حویلی کے صدر دروازے کی طرف سے باہر گلی کی نالی میں چلا جاتا تھا۔ میری پیدائش سے بہت پہلے کے لگے ہوئے لکڑی کے بڑے سے دروازے کے ساتھ پہلا گھر چاچا طالب حسین قریشی کا تھا۔ جسے ہم بہن بھائی چاچا طالب کہتے تھے۔ چاچا طالب کی والدہ حاکم بی بی عرف مائی حاکاں ہمارے دروازے کے ساتھ اور اپنے دروازے کے آگے بنی ہوئی تھڑی پر براجمان رہتی۔ وہ بڑی سیانی بُڑھیا تھی اور گاؤں کے لڑکے لڑکیوں کے کئی رشتے اُسی کی وساطت سے طے پاتے تھے۔

**لپ سواء دی:** ایک موسمِ گرما کی بات ہے کہ مَیں اور ابّا جی گھر سے باہر نکلے تو مائی حاکاں تھڑی پر بیٹھی کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ ''کیا ہوا پھوپھی؟ کچھ خفا نظر آ رہی ہو'' ابّا جی نے پوچھا۔ ''ایڈی گرمی وچ پندھ کرا کرا کے مار دِتّا نیں۔ ٹُر پیندے نیں رشتے لبھن۔'' مائی حاکاں نے جواب دیا۔

حاکاں نے بڑا دلچسپ اور مشکل جواب دیا۔ کہنے لگی: ''پُتر نِرامُنڈ اای تے نہیں سی ویکھنا نا۔ اِک لپ سواء دی سی او ہناں دے چُلھے اگے۔'' ابّا جی ''اچھا'' کہتے ہوئے چل پڑے تو مَیں نے سوال کیا کہ ''ابا جی! چولھے کے آگے پڑی ہوئی راکھ کا رِشتے سے کیا تعلق ہے؟'' جواب ملا کہ ''یا تو وہ گھرانہ بہت چھوٹا ہوگا یا اُنھیں پیٹ بھر کے روٹی نہیں ملتی ہوگی۔ دونوں صورتوں میں مائی حاکاں نے رِشتہ نہیں کرنا تھا۔''

**نمازِ مغرب کے بعد کی پھونک:** تعطیلاتِ گرما کی ایک اور ناقابلِ فراموش بات یہ ہے کہ اُن دِنوں کچھ لڑکے مسجد میں نماز پڑھنے بھی جاتے تھے۔ یوسف راجپوت، عبدالمجید، مختار انبالوی، عبدالرشید اور مَیں مسجد جانے کو 'جائز' ہی سمجھتے تھے۔ رمضان المبارک میں نوبت بجانے کے شوق میں کچھ دیگر لڑکے بھی مسجد چلے جاتے تھے، لیکن صرف مغرب کے وقت۔

موسمِ گرما میں اکثر چھوٹے بچے بیمار پڑ جاتے تھے۔ بخار، ہیضہ اور آنکھوں کی بیماریاں تو گاؤں کی سوغات تھیں۔ ان بیمار بچوں کے بڑے بہن بھائی نمازِ مغرب کے بعد اُنھیں گود میں لے کر مسجد کے دروازے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے اور نمازیوں سے بچوں کو پھونک مارنے کا کہتے۔ نمازی نہایت سنجیدگی سے پھونک مار کر آگے گزر جاتے۔ مَیں سُنا کرتا تھا کہ نمازِ مغرب کے بعد کی اِس پھونک سے بیمار بچے شفایاب ہو جاتے تھے۔

پنجاب کاٹن ملز میں قُلی کی نوکری اپریل 1969 سے اگست 1969 تک جاری رہی اور ستمبر میں نیشنل فین فیکٹری شاہدرہ کے اپرنٹس ٹریننگ سنٹر میں داخل ہو گیا۔ یہاں کام بھی سکھایا جاتا تھا اور 90/- روپے ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔ یہاں میں نے دو سال کا طویل عرصہ گزارا۔ میں اِس سنٹر میں جنرل الیکٹریشن تو نہ بن سکا لیکن وہاں مجھے دُنیا کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا وسیع موقع ضرور ملا۔

**پینڈو کے طعنے اور اداکاری:** اپرنٹس ٹریننگ سنٹر میں چھوٹی موٹی تقاریب ہوتی رہتی تھیں۔ وہاں کے انجینئرز میں شوکت علی نام کے ایک انجینئر کو فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی۔ ہارمونیم کا اچھا پلیئر تھا اور خوب صورت آواز رکھتا تھا۔ اُس عہد کا ایک مشہور فلمی گیت ''بھائیاں باجھ نہ جوڑیاں تے پُتراں باجھ نہ ناں'' اُسی نے گایا تھا۔ ایک دوسرا مردم شناس نوجوان مجاہد مرتضٰی بخاری تھا جس کا کسی نہ کسی طرح کا کوئی تعلق فلمی دُنیا

سے بھی تھا۔ میرا گاؤں سے تعلق ہونے کی وجہ سے اُن دونوں نے مجھے پینڈو کہنا شروع کر دیا اور پھر آہستہ آہستہ سارے سنٹر میں مجھے پینڈو ہی کہا جانے لگا۔

یہ 1970 کی بات ہے جب ٹریننگ سنٹر میں ایک ڈرامہ سٹیج کرنے کا پروگرام بنا۔ بخاری کے علم میں تھا کہ میری افسانہ نگاری سے کچھ دلچسپی ہے لہٰذا اُس نے مجھے ہی ڈرامہ لکھنے کا کہا۔ چند روز بعد میں نے اُس کے ہاتھ میں مسودہ تھما دیا۔ نام تھا 'لاوارث'۔ بخاری نے اسے بار بار پڑھا اور پھر حیرت اور خوشی سے کہنے لگا ''اوئے پینڈو! توں تے بڑی شے ایں۔'' تھوڑی ہی دیر بعد سارے سنٹر میں مشہور ہو گیا کہ یہاں جو ڈرامہ سٹیج ہونے جا رہا ہے وہ پینڈو نے لکھا ہے۔ وہاں مجھے کوئی پینڈو کہتا تھا اور کوئی پینڈا۔

ڈرامہ نگاری کا مرحلہ مکمل ہوا تو مسئلہ یہ تھا کہ اِس کا مرکزی کردار کون ادا کرے۔ چند دوست سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور ہیرو کے انتخاب پر بحث مباحثہ شروع ہو گیا۔ یک دم مجاہد بخاری اُچھل پڑا۔ ''مل گیا ............ مل گیا۔''

''جی بخاری! کون کرے گا مرکزی کردار؟'' پُرتجسّس دوستوں نے پوچھا۔

''پینڈو''۔ اُس نے میری کمر پر مُکّا رسید کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر اگلے روز ریہرسل شروع ہو گئی۔

طے شدہ تاریخ پر خوب صورت سٹیج تیار تھی۔ پردہ ہٹا۔ پینڈو پھٹا پرانا کرتا پاجامہ پہنے زمین پر بیٹھا تھا اور سامنے لکڑی کی ایک لٹھ پڑی تھی۔ پینڈو کے ہاتھ میں آری تھی اور وہ چہرے پر گہرے کرب کے تأثرات دیتے ہوئے بڑے آرام سے آری لٹھ پر چلا رہا تھا اور ہال زوردار تالیوں سے گونج رہا تھا۔ کل کا پینڈا ڈرامہ نگار اور اداکار بن چکا تھا۔ اوائل 1971 میں میری امّی نے نانا جان کے حکم پر فیصلہ کیا کہ میں شاہدرہ سے روزانہ گاؤں آنے کی بجائے لاہور میں ننھیال میں قیام کروں۔ لہٰذا شام کی کلاسز میں لاہور انگلش کالج، لاہور میں ایف اے کے لیے داخلہ لے لیا۔ میں لاہور انگلش کالج میں ہی زیرِ تعلیم تھا جب دو بڑے لوگوں سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ مجھے چونکہ پرانی انارکلی سے کرشن نگر کی طرف جانا ہوتا تھا لہٰذا سڑک پار کر کے لیفٹ ہینڈ ہونا پڑتا تھا۔ جس جگہ پر میں بائیسائیکل پر سوار ہوتا تھا وہاں ایک پھٹہ سا پڑا ہوتا

تھا جیسا کہ برف فروشوں کے زیرِ استعمال ہوتا ہے۔اس پھٹے پر اکثر ایک آدمی نظر آتا تھا،جس کا بایاں بازو خمیدہ یا شاید کچھ کمزور تھا۔اس کے علاوہ مجھے اُس کی بڑھی ہوئی شیو،مٹی بھرے لمبے بال اور میلی کچیلی سی کالی چادر ابھی تک یاد ہے۔کالج کے اندر خوب صورت لمبے بالوں والا کلین شیو آدمی جو انگریزی پڑھاتا تھا وہ تھا ولیِ کامل حضرت واصف علی واصف اور کالج کے باہر بڑھی ہوئی شیو اور مٹی بھرے بالوں والا شخص تھا محمد اختر۔محمد اختر ساغر صدیقی۔

کبھی خرد کے جہاں سے گزرے ، کبھی جنوں کا نگر بسایا
ہیں بے نیازِ قیام و راحت ، ہمارا کوئی وطن نہیں ہے

# اور میرا پاکستان ٹوٹ گیا

1971 میں جب میں شیخوپورہ،شاہدرہ اور لاہور کے درمیان شٹل بنا ہوا تھا تو ایک منحوس دسمبر دیکھنا نصیب ہوا۔یہ دسمبر اور پھر اِس میں 16 دسمبر کا دن ................. قیامت سے کم نہ تھا۔ایک ڈائری میرے سامنے ہے:

16 December 1971, Thursday.

27 Shawal 1391 Hij, 1 Poh, 2028 Bik

29 Augrahain, 1378 Ben

درج بالا الفاظ واعداد سے پتہ چل رہا ہے کہ 16 دسمبر 1971 جس روز عالمی سامراج نے ہمارے جسم کے دو ٹکڑے کیے تھے،اُس روز جمعرات کا دن تھا، 27 شوال ، 1391 ہجری، یکم پوہ 2028 بکرمی اور ایک چوتھے حساب سے اگرہن کی 29 تاریخ اور 1378 کا سن تھا۔اِس کتاب سے میرے قارئین کو اگر کچھ بھی نہ مل سکا تو یہ دلچسپ انفارمیشن تو مل گئی کہ اس وقت وطنِ عزیز میں سنین کے چار طرائق مروّج تھے۔ڈائری پر نیچے لکھا ہے:

”آج بابائے قوم کی روح تڑپ گئی ہوگی۔مشرقی کمان کے کمانڈر جنرل اے اے کے نیازی نے 4:31 بجے اپنا ریوالور خالی کر کے بھارتی کمانڈر کے ہاتھ دے دیا۔بھارت ڈھاکہ پر قابض ہوگیا۔“

یہ میری زندگی کا منحوس ترین دن تھا جو مجھے دیکھنا پڑا۔اب تک قیامِ پاکستان اور سقوطِ ڈھاکہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور شاید اب مزید کی گنجائش نہیں ہے، پھر بھی اِس سلسلے کا اپنا ایک آرٹیکل جو مدتوں بعد نوائے وقت میں شائع ہوا، نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔

''تاریخِ مسلمانانِ عالم روح فرسا حادثات سے اٹی پڑی ہے۔ایک سے بڑھ کر ایک سانحہ ہے۔ جنگِ جمل سے ہی اِک جہانِ اِضطراب کھلتا ہے۔پھر اُس کے بعد سانحہ کربلا، گیارھویں صدی میں بیت المقدس پر یہود کا قبضہ، تیرھویں صدی کے وسط میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی، پندرھویں صدی میں سپین سے فرڈی ننڈ اور ازابیلا کے ہاتھوں مسلمانوں کا اخراج، ہندوستان میں ٹیپو سلطان کی شہادت، 1947 میں مسلمانان ہند کی ہجرت اور مشرقی پنجاب میں ٹوٹنے والی قیامت اور پھر سقوطِ مشرقی پاکستان! کیا کیا زخم سہے اور کیا کیا نوادرات لُٹ گئے ------ !وائے افسوس، سفر وہی ہے، سمت وہی ہے اور برہنہ پائی بھی وہی۔

دسمبر آتا ہے تو ڈھاکہ کا سقوط ایک بار پھر آنکھوں کو سُرخ کر دیتا ہے؛ مسلمانانِ ہند کی قربانیوں کی رائیگانی خون رُلانا شروع کر دیتی ہے اور ماضی کے عاقبت نا اندیش نام نہاد راہنماؤں کے جہل اور طمع کی داستانیں حال کے قصّہ گو کی زبان کو قفل لگا دیتی ہیں۔

دسمبر کا مہینہ 16 دسمبر 1971 کی منحوس یادوں کو تازہ کر دیتا ہے، جب دُنیائے اسلام کی سب سے بڑی ریاست پاکستان کے مسلمان کمانڈر امیر عبداللہ خاں نیازی نے ایک جابر اور دہشت گرد ریاست کے در انداز کمانڈر جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے آگے گُھٹنے ٹیک دیے۔ 90 ہزار کی ایک بڑی فوج کو نہایت ہزیمت کے ساتھ بھارت کا قیدی بنا دیا گیا۔ چودہ صدیوں پر محیط مسلم قوم کے عروج و زوال میں اِس طرح کی سُرخ دہکتی شرمندگی کبھی مقدر نہ بنی تھی۔توہین اور ذلت کے ایسے آتش فشاں سے کبھی گزرنا نہ پڑا تھا۔

16 دسمبر 1971 کے سانحہ کی بڑی وجہ شیخ مجیب الرحمٰن جیسے غدارِ وطن کا ناپاک وجود تھا۔وہ میر جعفر اور میر صادق کا کردار ادا کرنے کے لیے موزوں ترین شخص تھا۔ ہندو قوم جس نے ابھی تک پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا، روزِ اوّل سے ہی پاکستان کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہے۔ 1962 میں جب پاکستان میں مارشل لاء نافذ تھا اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی، پاکستان توڑنے کے لیے

بھارتی حکومت نے مشرقی پاکستان میں تین لوگوں سے رابطہ کیا، جن میں محمود علی صاحب (ازاں بعد وزیرِ مملکت پاکستان)، مولوی تمیز الدین خاں (سابق سپیکر قومی اسمبلی پاکستان) اور شیخ مجیب شامل تھے۔ پہلے دونوں بزرگوں نے پاکستان توڑنے کی سازش میں شرکت کی پیش کش کو حقارت اور نفرت سے ٹھکرا دیا لیکن مؤخر الذکر ذِلت و رُسوائی کی خرید کے لیے تیار ہو گیا اور بھارتی وزیر اعظم جواہر لال نہرو سے سبق لینے کے لیے اگرتلہ کے مقام پر پہنچ گیا۔ (روزنامہ مشرق لاہور۔ 8 ستمبر 1983) یوں بنگالیوں اور بنگالی زبان کے حقوق کے نام نہاد علمبردار کو وطن دشمنی کی راہ ہموار کرنے کے لیے مالی امداد اور اسلحہ ملنا شروع ہو گیا۔ اس طرح کل تک ٹوٹے ہوئے بٹنوں والا کرتہ اور پھٹی پرانی چپّل پہن کر لاہور میں بھکاریوں کی طرح دن گزارنے والا شیخ مجیب کروڑوں میں کھیلنے لگا (دس پھول ایک کانٹا از خواجہ افتخار) ۔ 1966 تک اُس کی جرأت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ جب وہ فروری 1966 میں چودھری محمد علی اور نواب زادہ نصراللہ خاں کی دعوت پر ڈیموکریٹک کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور آیا تو اُس نے اپنے اُن رُسوائے زمانہ چھ نکات کا ایک پریس کانفرنس میں اعلان بھی کیا جو ازاں بعد بنگلہ دیش کے قیام کی خشتِ اوّل ثابت ہوئے۔

شیخ مجیب بھارتی حکومت کی طرف سے دیے گئے سرمائے اور اسلحہ کے ڈھیروں سے دہشت گرد تنظیم مکتی باہنی کا قیام عمل میں لا چکا تھا۔ مکتی باہنی کے ذمے ایک ہی کام تھا اور وہ یہ کہ وہ ہر غیر بنگالی کو بغیر وجہ بتائے اور بغیر کچھ سُنے قتل کر دے اور یوں ہر اُس آواز کو سناٹوں میں بدل دے جو پاکستان کے مقدس نام کا ذکر بھی لائے۔ مکتی باہنی کے غنڈوں کے ہاتھوں خونِ مسلم کی ارزانی کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ بیت المقدس میں مسلمانوں کا قتل عیسائیوں کے ہاتھوں ہوا اور مشرقی پنجاب کا قتلِ عام سکھوں نے کیا۔ بنگال میں بظاہر مسلمان، مسلمان کا خون بہا رہا تھا۔ اُنھوں نے پنجابیوں اور بہاریوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ اُن کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے یا اُنھیں زندہ جلا دیا گیا۔ ایسا کرنے میں مرد، عورت اور بچّوں کی کوئی تفریق روا نہ رکھی گئی۔ میمن سنگھ میں ایک غیر بنگالی پوسٹ ماسٹر نے صحافیوں کو اپنے جسم پر چُھروں سے لگائے گئے زخم دکھاتے ہوئے بتایا کہ وہ بنگالی بلوائیوں کے قتلِ عام کا نشانہ بننے

والے پانچ ہزار غیر بنگالیوں میں سے بچ رہنے والے 25 افراد میں سے ایک ہے۔( پاکستان کیوں ٹوٹا از صفدر محمود صفحہ: 135 ) ۔انتھونی ماسکارنہاس کے مطابق ہلاک کیے جانے والے غیر بنگالیوں کی تعداد ایک لاکھ ہوسکتی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ کئی مقامات پر خواتین کو ہلاک کرنے سے پہلے اُن کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں۔ چٹا گانگ میں ملٹری اکیڈمی کے کرنل کمانڈنٹ کو ہلاک کر دیا گیا اور اُس کی آٹھ ماہ کی حاملہ بیوی کی آبروریزی کے بعد پیٹ میں چھرا گھونپ کر اُس کے بیٹے کا سر اُس کے ننگے بدن پر رکھ دیا گیا۔ یوں بھی ہوا کہ ماؤں کو اپنے ہی مقتول بیٹوں کا خون پینے پر مجبور کیا گیا۔

بھارتی میڈیا جو مشرقی پاکستان میں فسادات پھیلانے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا، اُس نے نہ صرف مکتی باہنی کے اس ظلم وستم پر پردہ ڈالے رکھا بلکہ اپنے منفی پروپیگنڈہ کے ذریعے بنگالیوں میں اشتعال پیدا کرنے کی بھرپور سعی کرتا رہا۔ مثلاً یہ کہ سینٹ جوزف سکول ڈھاکہ کے بچّوں پر جئے بنگلہ کا نعرہ بلند کرنے کے جرم میں پاکستانی فوج نے فائر کھول دیا یا بی۔اے۔صدیقی، چیف جسٹس ڈھاکہ ہائی کورٹ کو پاکستانی فوج نے قتل کر دیا۔ یہ بھارتی میڈیا کی دروغ گوئی کی محض دو مثالیں ہیں۔ (S. Alamdar Raza, (Dacca's Debacle, P: 122)

بھارتی حکومت، شیخ مجیب اور ان دونوں کی پروردہ مکتی باہنی کے اوچھے ہتھکنڈے عروج پر تھے کہ حکومت پاکستان کی طرف سے ملک میں پہلے عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ 7-دسمبر، 1970 کو ہونے والے ان انتخابات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب کی عوامی لیگ ایک بڑی طاقت کے طور پر سامنے آئی جب کہ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی سبقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

راقم کے خیال میں انتخابات میں حاصل کردہ نشستوں کی تعداد کبھی بھی عوامی پسندیدگی کا واحد اور حتمی پیمانہ نہیں رہی۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے معاملہ میں تو اِس تھیوری کی صداقت پوری شدت سے سامنے آتی ہے۔عوامی لیگ کی ہنگامہ خیز اور جارحانہ سرگرمیوں، بھارت کی طرف سے مہیا کیے گئے لامحدود مالی وسائل اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کے باوجود قومی اسمبلی کی 300 میں سے 160 نشستیں جیت کر اکثریتی پارٹی

کی حیثیت حاصل کر لینے کے باوجود اس زبردست حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ عوامی لیگ کو صرف 43 فیصد ووٹروں کی حمایت حاصل تھی۔ان انتخابات میں مشرقی پاکستان میں صرف 57 فیصد ووٹرز نے حقِ رائے دہی استعمال کیا۔اُن 43 فیصد ووٹرز کا کیا کہیے جنھوں نے ہر طرح کے جبر کے باوجود گھروں سے نکلنے سے انکار کر دیا۔اگر یہ شیخ مجیب کی عوامی لیگ اور اُس کے چھ نکات کے حق میں ہوتے تو یہ ووٹ ڈالنے ضرور جاتے، جس کی دلیل یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں بسنے والے 100 فیصد ہندوؤں نے اپنا حقِ رائے دہی استعمال کیا تھا۔جن 57 فیصد ووٹرز نے اپنا حق استعمال کیا اُن میں 75 فیصد ووٹ عوامی لیگ کے حصے میں آئے۔ یوں نصف سے بھی کم لوگوں کی رائے کو پورے مشرقی پاکستان کے لوگوں کا فیصلہ قرار دیتے ہوئے بغاوت کی راہیں ہموار کر لی گئیں اور مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کی تحریک کو پورے شدّ و مد اور تلخی کے ساتھ جاری رکھا گیا۔

پاکستان کی وفاقی حکومت نے اِس صورتِ حال کو فوجی طاقت کے ساتھ سنبھالنے کی کوشش کی جو اس وقت شاید واحد آپشن تھا،لیکن مغربی حصّے سے ایک ہزار میل کی دُوری، بھارت کا غاصبانہ اور جنگجوانہ رویہ،مکتی باہنی کی منظّم غداری اور پاکستان کی ناکام خارجہ پالیسی جیسے عناصر نے فوجی کارروائی کو بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے دیا۔روس کی کھلی جارحیت اور امریکہ اور چین کا منافقانہ رویہ بھی سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب میں شامل ہے۔نومبر 1971 میں مشرقی پاکستان میں پاکستان کی فوجی شکست یقینی ہو چکی تھی۔دسمبر کے آغاز میں بھارت نے اپنی فوجی کارروائیاں اور مکتی باہنی نے قتل و غارت گری کو انتہا تک پہنچا دیا۔یہ خیال بھی غلط ثابت ہو گیا کہ مشرقی پاکستان کی بقا کی جنگ مغربی محاذ پر لڑی جا سکتی ہے اور بالآخر 16 دسمبر 1971 کی منحوس شام کو جنرل نیازی نے پاکستان کے 90 ہزار مجاہدین اور اپنا خالی پستول جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے حوالے کر دیے۔ بھارتی افواج مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئیں اور یوں:

## میرے قائد کا پاکستان ٹوٹ گیا

1971 کی پاک بھارت کشیدگی اور پھر خوفناک جنگ نے پوری قوم کے اعصاب کو جکڑا ہوا تھا اور محبِ وطن نوجوان طبقہ میں شدید بے چینی پائی جاتی تھی۔آج 2023 کی قوم کی نفسیات (بقول) حسن نثار، منٹو کے 'کھول دو' کے مرکزی کردار کی سی ہے،لیکن اس وقت صورتِ حالات مختلف تھی اور

'ابھی کچھ لوگ باقی تھے جہاں میں'۔ میرے سامنے اُس وقت تین آپشنز تھے۔ سیاست میں آ کر ملک کی تقدیر بدلی جائے، قلم کو ہتھیار بنایا جائے اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور تیسرا یہ کہ فوج میں بھرتی ہو کر اچھا سپاہی بنوں۔ اور اگر کبھی حالات سازگار ہو جائیں تو انڈیا کو مزا چکھایا جائے۔ لہٰذا میں نے نمبر 3 آپشن کے لیے جدوجہد کی اور آرمی میں کمیشن کے لیے اپلائی کر دیا۔

میری 18 دسمبر، 1971 کی ڈائری پر لکھا ہے:

اپنے وطن کے جو کام آؤں گا

نام اپنا شہیدوں میں کر جاؤں گا

21 دسمبر، 1971 کو آرمی میں کمیشن کا انٹرویو ہو گیا۔ بورڈ نمبر 1 اور رول نمبر 25165 تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خاں انٹرویو لے رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے سِوکس اور قانون کے مضامین سے کچھ سوالات کیے۔ RCD اور کل رات کی بھٹو کی تقریر پر بھی بات چیت ہوئی۔ لیکن بس بات چیت ہوئی۔ بات بن نہ سکی۔ میرے حصے میں فوج آئی نہ سیاست لیکن مَیں قلم مزدور ضرور بن گیا۔

یہاں 20 دسمبر، 1971 کی ڈائری کا ورق نقل کرنا مناسب لگ رہا ہے:

''لوگ کہتے ہیں:

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے

اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

یحییٰ کے ہاتھوں ملک تباہ ہوا ہے، لیکن ابھی کچھ کہا تو نہیں جا سکتا .................. یحییٰ آج مستعفی ہو گئے ہیں۔ اب صدر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھٹو ہیں۔ بھٹو پرسوں پیکنگ جائیں گے۔ وہ آج ہی نیویارک سے واپس آئے تھے۔''

''بھٹو نے ابھی رات دس بجے بحیثیت صدر تقریر کی۔ تقریر انگلش میں تھی جس کے لیے اُنھوں نے معافی مانگی .................. معلوم ہوتا ہے یحییٰ خان گرفتار نہیں ہوا۔''

پاکستان کا ٹوٹ جانا میں زندگی بھر کبھی نہ بھول سکا۔ مَیں ایک نا اہل، لالچی اور خود غرض قوم کا فرد ہوں۔ بُرا نہ مانیے مِن حیث القوم ہمارے رویّے کچھ ایسی ہی عکاسی کرتے ہیں، لیکن یہ خوفناک گھاؤ جو میرے وطن کے دو ٹکڑے ہونے کی شکل میں مجھے لگا، میری ساری کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود مجھے آج تک خون کے آنسو رُلا رہا ہے۔ میں نے تب سے ہی پاکستانی سیاست کے زیر و بم بلکہ سیاست کی غلاظتوں پر گہری نظر رکھی ہے۔ میری ڈائری کا 8 جنوری، 1972 کا صفحہ پڑھیئے:

''آج صبح 3 بجے شیخ مجیب الرحمٰن رِہا ہو گیا اور ٹھیک 9 گھنٹے بعد لندن پہنچ گیا۔ نہ جانے وہاں کیوں گیا۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اُن کی خواہش کے مطابق لندن بذریعہ PIA پہنچایا گیا۔ کچھ لوگوں نے شیخ سے ملنے کے لیے درخواست کی تھی، جن میں شاید اصغر خان بھی ہوں گے لیکن اُنھوں (شیخ) نے کسی بھی شخص سے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ وقت ملاقاتوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔''

یوں تاریخِ پاکستان کا سب سے مکروہ انسان اور سب سے بڑا مجرم پاکستان سے لندن اور لندن سے دہلی پہنچ گیا۔ دہلی میں شیخ نے بھارتی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی اور صدر بھارت سے ملاقات کی اور اپنے 'سنہری کارنامے' پر شاباش وصول کی۔

**ذوالفقار علی بھٹو:** اُن دِنوں دیگر بہت سے زخم خوردہ پاکستانیوں کی طرح میری نظروں کا مرکز و محور بھی ذوالفقار علی بھٹو کی ذات تھی لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ پاکستانی قوم ابھی تک یہ یقین کرنے پر تیار نہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں 93 ہزار فوجی اب جنگی قیدی بن چکے ہیں۔ 13 یا 14 جنوری، 1972 کو عالمی ریڈ کراس نے 35 ہزار پاکستانی P.O.Ws کی فہرست پاکستان کے حوالے کی تو ایک نئی بحث شروع ہو گئی۔ بھٹو اِتنا دباؤ میں تھا کہ اُسے بھارت کو یہ پیش کش کرنا پڑی کہ وہ میرا بیٹا یرغمال رکھ لے اور میرے جنگی قیدی رِہا کر دے۔

آغازِ مارچ، 1972 میں بھٹو نے قوم کو اعتماد میں لینے کے لیے لاہور میں ایک جلسہ عام کا فیصلہ کیا جس کے لیے 19 مارچ، اتوار کا دن مقرّر رہوا۔ یہ بھٹو کا اگرچہ لاہور میں 6 واں جلسہ عام تھا لیکن

بحیثیت صدرِ پاکستان یہ اُس کا پہلا جلسہ تھا۔ بہت بڑا جلسہ تھا یہ۔ میں بھی بھٹو کی باتیں سُننے کے شوق میں کرکٹ سٹیڈیم فیروز پور روڈ پہنچ گیا۔ بھٹو بمطابق اعلان ٹھیک چار بجے سٹیڈیم پہنچ گیا۔ تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد جب بھٹو تقریر کرنے کے لیے اُٹھا تو ہجوم کے جوش و جذبہ کی وجہ سے چند سپیکرز کی تاریں ٹوٹ گئیں۔ بھٹو تین مرتبہ بولنے کے لیے اُٹھا لیکن شور اور بدنظمی کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ پایا۔ اِس طرح تقریباً سوا گھنٹہ ضائع ہو گیا۔ بھٹو کی بار بار کی التجا پر ہجوم میں کچھ نظم و ضبط آیا تو اُس نے تقریر شروع کی۔ کچھ اقتباسات جو میں نوٹ کر سکا نذرِ قارئین ہیں:

1۔ ''چھ سال پہلے امریکہ ہم سے اِس لیے ناراض تھا کہ ہم چین کے دوست تھے اور آج روس بھی اِسی لیے ہمارا دُشمن ہے لیکن میں روس اور امریکہ پر واضح کرتا ہوں کہ چین ہمارا دوست ہے اور بہر حال رہے گا۔''

2۔ ''بیگم اندرا گاندھی، مائی جی! اگر پاکستانیوں کی بہن بننا چاہتی ہو تو سوگوار بھائیوں کی، بہنوں کی فریاد سُنو اور اُن کے بھائیوں کو چھوڑ دو۔''

3۔ ''فرانس اور جرمنی! ہم نے تمھارے ساتھ کیا دُشمنی کی تھی کہ تم نے اِتنی جلد بازی کی اور بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ چین اور امریکہ بھی تو قائم ہیں۔''

4۔ ''ہم تمام مسلم ممالک کے علاوہ لیبیا کو پُر زور سلام کہتے ہیں اور آج سے اِس سٹیڈیم کا نام کرنل قذافی سٹیڈیم ہو گا۔''

5۔ ''مجیب! میں اور تم نے روزِ قیامت خدا کو جواب دینا ہے۔ بہاریوں پر ظلم نہ کرو ورنہ میں کوئی گارنٹی نہیں دیتا۔''

6۔ ''جو بھی کام کرتا ہے غریب ہے مگر وہ بہن چود جو کمروں میں بیٹھے ہیں، وہ نہیں............ کاٹ دو، کاٹ دو .................. یہ گالی کاٹ دو۔''

بس یہ تقریر وہی کچھ تھی جس کی بھٹو جیسے انسان سے ایک پبلک میٹنگ میں توقع کی جا سکتی تھی۔

**ایئر مارشل اصغر خان:** 1972 کے شب وروز میرے جسم اور میری روح کو مسلسل گھائل کیے جا رہے تھے۔ جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے 9۔اکتوبر، 1972 کو ایئر مارشل محمد اصغر خان کو ایک خط لکھا، جس میں اُن سے کچھ رہنمائی طلب کی اور اُنھیں اُن کی قائم کردہ سیاسی جماعت تحریکِ استقلال کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔صرف 10 ایّام کے بعد مجھے ائیر مارشل صاحب کی طرف سے ایک پیکٹ موصول ہوا جس میں تحریکِ استقلال کے آئین ومنشور کے علاوہ اُن کی ایک تصویر شامل تھی۔اُنھوں نے مجھے ڈسٹرکٹ کورٹس شیخو پورہ میں جماعت کے ضلعی صدر محمد اکرام ناگرا ایڈووکیٹ سے رابطہ کرنے کا بھی لکھا۔ پھر رابطے مضبوط ہوتے گئے اور چیچو کی ملیاں میں تحریکِ استقلال کا ایک باقاعدہ دفتر قائم کردیا گیا۔ کچھ دیر بعد ضلعی مجلسِ عمل قائم ہوئی تو میں اُس کا کم عمر ترین رُکن تھا۔تنظیم کے قیام کے بعد ائیر مارشل سے شیخوپورہ اور لاہور میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔

یوں تو مسلمانانِ ہند نے بڑے بڑے رہنما اور مدبّر پیدا کیے ہیں لیکن چند لوگ ایسے ہیں کہ اُن کا نام سُنتے ہی سرادب واحترام سے جُھک جاتا ہے۔اقبالؒ، محمد علی جناحؒ، لیاقت علی خانؒ، حسین شہید سہروردی، ائیر مارشل محمد اصغر خاں اور ڈاکٹر عبدالقدیر خاں اُن ہی لوگوں میں شامل ہیں۔حیرت ہے کہ صرف 36 برس کی عمر میں محمد اصغر خان نے پاک فضائیہ کے پہلے مسلمان کمانڈر انچیف اور ائیر مارشل ہونے کا اعزاز حاصل کرلیا۔

ائیر مارشل اصغر خان سے میری پہلی ملاقات کسان ہال لاہور میں ہوئی تھی۔میٹنگ کا وقت چار بجے کا تھا لیکن وہ 3:55 پر ہال میں داخل ہو چکے تھے۔میں حیران رہ گیا کہ یہ کیا ہے۔اُن کے بارے میں مجیب الرحمٰن شامی نے اپنے کالم ''اصغر خان......88 ''میں لکھا تھا کہ ''قائدِ اعظم کی طرح بلند و بالا وہ ہو نہیں سکتے تھے اور عام سیاست دان بن کر رہ جانا اُن کو گوارا نہیں تھا۔''اُنھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات اپنی کتب 'چہرے نہیں نظام بدلو'، 'جمہوریت اور پاکستان' ، مائی پولیٹیکل سٹرگل (My Political Struggle) اور "We Have Learnt Nothing From History" میں نہایت دل آویز انداز سے بیان کیے ہیں۔

میں کم وبیش 45 برس تک اِس باوقار انسان، عالی ظرف ہستی، حق گو مصنف، بلند پایہ مدبّر اور

عظیم ماہرِ حرب کے شب و روز سے آگاہی حاصل کرتا رہا، یہاں تک کہ 5 جنوری 2018 کو اُنھوں نے اگلی دُنیا کی راہ لی۔

ائیر مارشل کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ کبھی کبھی ذہن کے دریچوں سے جھانکنے لگتا ہے اور وہ یہ کہ بھٹو کے خلاف اپوزیشن کی تحریک کے دوران لاہور میں دفعہ 144 نافذ تھی۔ ائیر مارشل صاحب کہنے لگے کہ یہ شخصی آزادی کے خلاف اور بلا جواز ہے، لہٰذا ہم جلوس نکالیں گے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق کارکن لاہور میں فین روڈ پر ہائی کورٹ کے گیٹ سے کچھ آگے واقع میاں محمود علی قصوری کی کوٹھی کے باہر اکٹھے ہونا شروع ہوگئے جہاں ائیر مارشل صاحب پہلے ہی موجود تھے۔

ائیر مارشل صاحب جب کوٹھی سے باہر نکلے تو پولیس کی بھاری نفری نے جس کی کمان ایک معروف افسر محمد اصغر خان DIG المعروف ہلاکو خان کر رہے تھے، اُن کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اُس عہد کی حماقت آمیز بہادری کا تقاضا تھا کہ میں ائیر مارشل کے قریب تر ہوتا گیا۔

جب میں ائیر مارشل اصغر خان اور DIG اصغر خان کے قریب پہنچا تو ائیر مارشل صاحب کہہ رہے تھے کہ ''مجھے کیا کہتے ہو۔ میں تو تمھارے قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔ ہم تو صرف تین آدمی ہیں، میں، میاں صاحب (محمود علی قصوری) اور احمد رضا۔'' کچھ اِس طرح کی بات ہو رہی تھی کہ کسی (شاید احمد رضا قصوری صاحب) نے کہا کہ یہ ہلاکو خان صاحب ہیں۔

''اچھا تو تم ہو ہلاکو خان'' کہتے ہوئے ائیر مارشل صاحب نے DIG کی ٹوپی اچھال کر ہائی کورٹ کی طرف پھینک دی۔

اس طرح کے کسی ایک واقعہ سے کسی بڑی شخصیت کے کردار کی صحیح عکاسی نہیں ہوتی اور اس سے کوئی رہنما اصول بھی مرتب نہیں کیے جانے چاہییں۔ جس طرح کہ یونانی فلاسفر کہا کرتے تھے ہجوم کے فیصلے غلط ہی ہوتے ہیں، اسے بھی غلط ہی تصور کرنا چاہیے کہ یہ بھی ہجوم ہی میں ہوا تھا۔

## خواجہ محمد رفیق شہید

یوں تو وطنِ عزیز کو دولخت ہوئے ایک سال کی مدت گزر چکی تھی لیکن اِس طرح کے سانحات تو

ہزاروں سال بعد بھی یاد رہتے ہیں۔ سانحۂ کربلا، جنگِ جمل، جناب معاویہ کا یزید کو عنانِ اقتدار تھمانا، ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی، ہسپانیہ اور بیت المقدس کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانا اور دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کی شان وشوکت کا جنازہ نکل جانا، مسلم پولیٹیکل ہسٹری کے وہ شرمناک سانحات ہیں جو لاکھ کوششوں کے باوجود بھلائے نہیں جا سکتے۔ مغربی پاکستان کے حکمران عربی کہاوت هَرِّقْ عَلٰی جَمْرِكَ (چنگاری پر پانی چھینکو) کے مصداق قوم کے غم وغصہ کو کم کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کررہے تھے لیکن قوم کی حالت اُس فقیر سے ذرا مختلف نہ تھی جسے کتا کاٹ کاٹ کر یا ڈرا ڈرا کر آبادی سے باہر نکال دیتا ہے اور فقیر دُور جا کر بھی پیچھے مُڑ مُڑ کے دیکھتا ہے کہ کہیں کتا پیچھے تو نہیں آ رہا۔

پاکستان کے ترانوے ہزار فوجی جنگی قیدی بن چکے تھے اور مشرقی پاکستان میں سازش کا مرکزی کردار شیخ مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان میں قیدی کی حیثیت سے دن گزار رہا تھا۔ مگر اہلِ مغربی پاکستان کے ترجمان ذوالفقار علی بھٹو نے 8 جنوری، 1972 کو صبح 3 بجے اُسے، بغیر کسی سودا بازی کے رِہا کر دیا اور اُسے پی آئی اے کے طیارے کے ذریعے لندن پہنچا دیا۔

مجیب لندن سے بھارت گیا اور تقریباً اڑھائی گھنٹے اس سازش کے دوسرے مرکزی کردار وزیرِ اعظم ہندوستان اندرا گاندھی سے شاباش وصول کرتا رہا۔ مشرقی پاکستان، جو اَب بنگلہ دیش بن چکا تھا، پہنچنے کے بعد اُس نے لاتعداد انتقامی کارروائیاں کیں۔ وہ مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتا رہا جس سے مغربی پاکستان میں بنگلہ دیش کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوتا رہا۔ 21 نومبر، 1972 کو مشرقی پاکستان کے آخری گورنر ڈاکٹر اے۔ ایم۔ مالک کو عمر قید کی سزا سُنا دی گئی۔ 15 دسمبر، 1972 کو جب پاکستانی جنگی قیدیوں کو بھارت میں ایک سال مکمل ہونے والا تھا، شیخ مجیب الرحمٰن نے اے۔ایم۔ مالک کی کابینہ کے ایک شریف النفس وزیر مولانا ابوالکلام یوسف کو بھی عمر قید کی سزا سُنا دی۔

مغربی پاکستان، جسے اب پاکستان کہا جانے لگا تھا، میں ایک شخص ابھی تک انگاروں پر لوٹ رہا تھا اور وہ تھا ائیر مارشل اصغر خاں۔ 17 دسمبر، 1972 کو مجھے اُن کی طرف سے حکم ملا کہ 20 دسمبر کو، جو کہ ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کی پہلی سالگرہ تھی، یومِ سیاہ منایا جائے گا اور اُس روز لاہور میں وہ ایک بڑے جلوس

کی قیادت کریں گے۔ مجھے اپنے ذرائع سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ جلوس میں پاکستان اتحاد پارٹی بھی شرکت کرے گی، جس کے سربراہ خواجہ محمد رفیق تھے۔

20 دسمبر کو مَیں چیچو کی ملیاں سے اپنے ساتھیوں کو لے کر نیلا گُنبد پہنچ گیا۔ جلوس حسبِ پروگرام مسجد نیلا گُنبد سے شروع ہوا اور مال روڈ کی طرف چل دیا۔ قائدین کے عین پیچھے مَیں اور میرے گاؤں کے غلام مصطفیٰ سب سے بڑا بینر لے کر چل رہے تھے۔ جلوس کے ساتھ ساتھ کچھ مشکوک افراد بھی دیکھے گئے اور کچھ شرکائے جلوس اُن سے پریشان بھی نظر آئے۔ خیال کیا جا رہا تھا کہ اُن مشکوک لوگوں کی قیادت افتخار احمد تاری کر رہا تھا جو مبیّنہ طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کے چند بدنام کارکنوں (یا رہنماؤں) میں تھا۔ جونہی جلوس طے شدہ پروگرام کے مطابق اسمبلی ہال کے سامنے پہنچ کر منتشر ہونا شروع ہوا، پاکستان اتحاد پارٹی کے کارکنوں پر حملہ کر دیا گیا۔ کچھ لوگ جو اسمبلی ہال کے مغربی جانب تانگوں پر سوار ہو رہے تھے اُنھیں تشدّد کا نشانہ بنایا گیا۔ عین اُسی وقت فائرنگ کی آواز آنا شروع ہوئی۔ میں اور غلام مصطفیٰ زمین پر لیٹ گئے۔ ابھی سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ پتہ چلا کہ خواجہ رفیق کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یوں حق کی آواز بلند کرنے کی پاداش میں ایک محبِ وطن پاکستانی کو بے رحمی سے منظر سے ہٹا دیا گیا۔ یاد رہے کہ خواجہ رفیق آج کے معروف مسلم لیگی رہنما خواجہ سعد رفیق کے والد تھے۔

خواجہ رفیق سے میری پہلی ملاقات مزنگ روڈ لاہور کی ایک بلڈنگ میں ایک میٹنگ کے دوران ہوئی تھی اور دوسری جلوس کے روز۔ وہ ایک مخلص، نیک نیت اور شریف النفس انسان تھے۔ میں خواجہ صاحب کو کبھی بھی بھلا نہ پایا ہوں۔ 20 دسمبر، 1973 کو چیچو کی ملیاں میں اُن کی پہلی برسی منائی گئی، جس میں محمد اکرام ناگرہ ضلعی صدر، تحریکِ استقلال، محمد سلیم فیضی سیکرٹری، سکندر حمید لودھی (صحافی) اور جسٹس محمد نواز بھٹی مرحوم جیسے لوگوں نے میری درخواست پر شرکت کی۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو کب یہ گوارا ہو سکتا تھا کہ اُن کی کارکردگی پر کوئی اختلافی رائے قائم کرے۔ بھٹو کی یہی کمزوری اُس کی پھانسی کا سبب بنی۔ ہُوا یہ کہ جن دنوں چیچو کی ملیاں میں لوگوں کی تحریکِ استقلال میں دلچسپی بڑھنے لگی تو کچھ ایسے لوگوں نے، جنھیں نہ کوئی سیاسی شعور تھا

اور نہ ہی ملکی سیاست میں اُن کی کوئی دلچسپی تھی، ایک مخالف دھڑا منظّم کرنا شروع کر دیا۔ ان کی واحد دلچسپی ایک ایسے پلیٹ فارم کا حصول تھا جسے حکومتی سرپرستی حاصل ہو سکے۔ لہٰذا اُنھوں نے گاؤں میں پاکستان پیپلز پارٹی کی شاخ قائم کی اور پھر تیزی سے اپنے مقاصد میں آگے بڑھے۔

بھٹو نے اُن دِنوں مخالفین کو کچلنے کے لیے دو اِدارے قائم کر رکھے تھے۔ ایک تھا فیڈرل سیکیورٹی فورس، جو بہت طاقت ور تھی اور احمد رضا قصوری جیسے مخالفین کو ختم کرنے کی جرأت رکھتی تھی اور دوسرا اِدارہ پیپلز گارڈ تھا۔

**پیپلز گارڈ:** پاکستان پیپلز پارٹی اور بھٹو کے خلاف نفرت وحقارت پیدا کرنے میں چھوٹے اِدارے نے بڑا کام کیا۔ پارٹی کے اربابِ اختیار اِس خوش فہمی میں رہے کہ وہ قوم کے جاہل اور ان پڑھ طبقے کو نام نہاد گارڈز کی وردیاں پہنا کر پارٹی کو مضبوط کر رہے ہیں لیکن دراصل وہ ایک نظریاتی اور عوامی جماعت کی جڑوں کو انتہائی بے دردی سے کاٹ رہے تھے۔

گاؤں میں پیپلز پارٹی کے خلاف اگر چہ بہت سے لوگ متحد تھے لیکن انھیں اکٹھا کرنے والا میں ہی تھا۔ لہٰذا پیپلز پارٹی نے وہاں وہی کردار ادا کرنے کی ٹھانی جو لاہور میں خواجہ رفیق شہید کی پاکستان اتحاد پارٹی کو ختم کرنے کے لیے پیپلز پارٹی کے لاہوری غنڈوں نے ادا کیا۔ ایک روز قوم کے 'نام ور سپوتوں' اور 'عوامی محافظوں' نے مجھے گھر سے دُور پکڑ لیا اور وہیں میرے خاتمے کا فیصلہ کیا۔ ہر کمزور، ہر وقت کسی نہ کسی طاقت ور کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہاں بھی تمام کمزور طاقتور کے ساتھ ہو گئے اور پھر اُنھوں نے میرے جسم کا کوئی حصہ نہ چھوڑا جہاں اُنھوں نے لاٹھیاں نہ برسائی ہوں۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خِشت مقیّد ہیں اور سگ آزاد

گاؤں میں میری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ اگر تھی تو یہی کہ میرے اِرد گرد کچھ لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ پیپلز گارڈز کو شبہ نہیں، یقین تھا کہ یہ کبھی نہ کبھی وقت کے فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گا۔ اللہ کو یہ منظور تھا کہ ایسا پھر بھی ہو کے رہا۔ میں گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جو ایف اے پاس کر چکا تھا اور جب میں نے ایل ایل بی اور ڈی ایل ایل کے امتحان پاس کیے تو اِن گارڈز میں شاید کوئی میٹرک پاس بھی نہ تھا۔ جب کہ مجھے اَللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ نے پیپلز پارٹی کے طاقتور ترین گورنر اور وزیرِ اعلیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ اور صلاحیت بخشی۔ اُس عہد کے اخباری تراشے آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

**قذافی میچ کمپنی**: جن دِنوں میں نیشنل فین فیکٹری کے اپرنٹس ٹریننگ سنٹر میں تھا اُن دِنوں ساتھ والی ماچس فیکٹری کے ایک لڑکے سے میری دوستی ہوگئی۔ ایک روز نہ جانے کیوں میں نے اُس سے پوچھا کہ یار یہ ماچس کیسے بنتی ہے؟

''کیوں تُوں بنانی اے؟''

''آہو، دل تے کرداا ے۔'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''تمھارے پاس کوئی کاغذ قلم ہے؟''

میں نے جیب سے لگے ایگل کے پین کی طرف اشارہ کیا اور جیب سے ایک ردّی سا کاغذ بھی نکال لیا۔ بس پھر اُس نے بغیر تمہیدی کلمات اور بغیر کسی تردّد کے ماچس سازی کا فارمولا نوٹ کروا دیا۔ ایف۔اے کرنے کے بعد جب مکمل فراغت تھی اور بی۔اے کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا تو میں نے اُس فارمولے سے قسمت آزمائی کی کوشش کی۔ اُن دِنوں گاؤں کا ایک نہایت بھلا مانس انسان چاچا عنایت مستری کالا شاہ کاکو کی کسی فیکٹری یا فیکٹریوں میں طویل ملازمت کے بعد تھک ہار کر واپس آ چکا تھا۔ چاچا عنایت بڑا اسیانا اور ٹیکنیکل مزاج کا آدمی تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتا تھا۔ اُس نے نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ مجوزہ ماچس فیکٹری کے قیام میں میرے ساتھ پارٹنر شپ بھی کر لی۔ کچھ ہی روز بعد اُس نے مطلوبہ ڈائیز تیار کر دیں۔

ڈائیز تیار ہونے کے اگلے روز میں والد صاحب سے پیسے لے کر لاہور سے کچھ کارڈز، سٹیپلر اور

گنپت روڈ کے قریب سے کیمیکلز خرید لایا۔ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہو جانے کے بعد ملک میں ماچس کی شدید کمی تھی ۔ چونکہ ڈھاکہ کی بنی ماچس اب مغربی پاکستان نہیں آ رہی تھی، لہٰذا فوری طور پر 3×2 اِنچ کی ڈائی سے یوں کٹائی کی گئی کہ اس کا بالائی حصہ فاسفورس لگانے کے لیے اور تیلی کی رگڑ کے لیے بن گیا اور زیریں حصہ کٹ کر کوئی تیس تیلیاں بن گئیں ۔ پہلے گتے پر فاسفورس لگایا جاتا اور خشک ہونے پر تیلیوں والا حصہ کیمیکل والے برتن میں ڈبو دیا جاتا۔

ماچس تیار تھی ۔ تیلی کو ہاتھ سے توڑا جاتا اور بالائی حصے پر رگڑا جاتا تو شعلہ بن جاتا اور کارڈ جلنا شروع ہو جاتا۔ایک ماہ کے اندر اندر گاؤں کی تمام دُکانوں پر یہ ماچس دستیاب ہوگئی۔اس ماچس فیکٹری کے سارے اثاثے دو ڈائیاں، ایک چٹو وٹا، کوئی دو سو روپے کے کیمیکلز اور چند کارڈز ( گتے ) تھے۔نام تھا قذافی میچ کمپنی، چیچو کی ملیاں، لاہور روڈ شیخوپورہ۔ پھر کیا ہوا؟ اِس کا مختصر جواب یہ ہے کہ نہ تو میں فرہاد تھا اور نہ ہی چاچا عنایت کوہ کن ۔بس چند ماہ میں یہ میچ کمپنی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

**صحافت اور قلم مزدوری:** یہی وہ دَور تھا جب میں نے زندگی کو قلم کے ذریعے میک اپ کرنے کی شروعات کیں۔ روزنامہ 'جمہور' لاہور تحریکِ استقلال کا نمائندہ اخبار تھا اور اس کا دفتر جی۔ پی۔او لاہور کے سامنے والی نیپئر روڈ پر تھا۔۔ایک روز مَیں چیچو کی ملیاں سے وہاں پہنچ گیا۔ کچھ بات چیت ہوئی اور میں اُن کا نمائندہ بن گیا۔روزنامہ 'وفاق' کا دفتر شاہ دین بلڈنگ، چیئرنگ کراس، مال روڈ پر تھا، اُن سے بھی نمائندگی مل گئی۔ دونوں اخبارات کا مزاج میرے مزاج کے مطابق تھا لہٰذا رفاقتیں بڑھتی گئیں اور میں خبر کی دُنیا کے قریب ہوتا گیا۔ان دونوں اخبارات کی رپورٹنگ کے ساتھ ساتھ 'آداب عرض' کا بھی مطالعہ ہوتا رہا۔

میرے پاس اُس عہد کے مسوّدات اور پرچے تو محفوظ نہ ہیں لیکن 1971 کی ڈائری بتا رہی ہے کہ یکم دسمبر، 1971 کو زندگی کی پہلی کہانی لکھی ۔ نام تھا 'یہ کہاں کی دوستی ہے' اور کچھ ہی دیر بعد 'وہ دل کہاں سے لاؤں' کے عنوان سے دوسری کہانی لکھی ۔لیکن اِس سے پہلے میں 1970 میں ایک سٹیج ڈرامہ لکھ چکا تھا جس کا نام تھا 'لاوارث'۔ یہ ڈرامہ ہمارے اپرنٹس ٹریننگ سنٹر میں پلے ہوا۔ یہ شدید مالی مشکلات کا دور تھا۔ میرے پاس ایسا کپڑا تو پہننے کو موجود ہوتا تھا جو پہن کر گھر سے باہر کہیں جا سکیں لیکن جوتا

بالکل نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مَیں نے 2 سال ایک ایسا جوتا پہن کر گزارے جس کے دائیں پاؤں پر پنکچر لگا ہوتا تھا اور وہ پنکچر کم از کم 1.5 اِنچ کا تھا۔ اب جس کے پاس پہننے کو جوتا اور کپڑوں کا کوئی تیسرا جوڑا نہ ہو وہ وُسعتِ علم کے لیے کتابیں کہاں سے خریدے گا اور سیاست کہاں سے کرے گا۔ اگر دولت کے بغیر سیاست کا کاروبار چلتا تو آج شیخ رشید احمد پاکستان کا سب سے تگڑا سیاست دان ہوتا لیکن اس بے چارے کے پاس ایک لال حویلی اور قومی اسمبلی کی ایک ہی سیٹ رہی ہے۔ ہاں اگر اُسے وزارت ملتی رہی ہے تو یہ حادثات کا نتیجہ ہے۔

سو غربت نے متاعِ لَوح و قلم بھی چھین لی اور اب کہ تلاشِ رزق میں ایک بار پھر لاہور کے لیے رختِ سفر باندھا اور لاہور میں محمد زمان قریشی ایڈووکیٹ کے ہاں منشی ہو گیا۔ یہ وہی زمان قریشی ہیں جو ازاں بعد NIRC پاکستان کے چیئرمین بنے۔ وہاں سے ملنے والے پیسوں سے کچھ گزر اوقات تو ہو جاتی تھی لیکن من میں یہ خیال آیا کہ میں وکیل کیوں نہیں بن سکتا، مجھ میں آخر کیا کمی ہے۔ انھی ایام میں فلم 'انسان اور آدمی' کی نمائش ہوئی۔ مَیں اور میرے دوست شاہد چشتی نے محمد علی مرحوم اور طلعت حسین کے ڈائیلاگ سُنے تو جلتی پر تیل پڑا اور وکیل بننے کا شوق مہمیز ہو گیا۔ دوسری طرف بدقسمتی یہ آڑے آئی کہ قریشی صاحب شام کو واصف صاحب کے ہاں بی۔ اے کی تیاری کے لیے رخصت دینے کو تیار نہ تھے۔ لاہور میں ہمیشہ سے یہ طریقہ مروّج رہا ہے کہ وکلاء صبح عدالتوں میں ہوتے ہیں اور شام کو اپنے دفاتر میں۔ مجھ میں آخر کیا بات تھی کہ میرا وکیل مجھے شام کو دفتر میں پابند نہ کرتا؟

میں جلتا رہا، کُڑھتا رہا اور روتا رہا۔ ایک روز میرے ماموں منور علی بھٹی مرحوم نے کوئی ایک ہزار صفحات کی ایک کتاب میرے آگے رکھی اور کہنے لگے کہ مَیں نے بی۔ اے کی انگریزی کی تیاری اِس گائیڈ سے کی تھی۔ بس اِسے پڑھتے رہا کرو، جب بھی وقت ملے۔ اور ہاں یاد رکھو کہ سلیبس یہی ہے۔ لیکن بڑے ماموں نے میرے جذبہ کو دیکھتے ہوئے نوکری چھوڑ کر واصف صاحب کے کالج میں باقاعدہ پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اُنھوں نے پیش کش کی کہ وہ میرے ہر طرح کے اخراجات پورے کریں گے۔ یوں ایک بار پھر میں واصف صاحب کے 'لاہور انگلش کالج' کا طالب علم بن گیا۔ اب قیام ننھیال میں تھا۔ صبح شام والے

وکیل کے ہاں سے نوکری تو چھوڑ دی لیکن صبح کے وقت عدالت چلا جاتا تھا اور ایک دوسرے وکیل کی خدمت انجام دیتا رہا۔ کچھ نہ کچھ پیسے وہاں سے مل جاتے اور جو کمی رہ جاتی وہ ماموں پوری کر دیتے۔ یہ 1974 تھا جس کے کچھ لمحات زندگی بھرنا قابلِ فراموش ہی رہے ہیں۔ یہ بڑا زبردست دور تھا۔ لاہور میں رہ کر گاؤں میں تحریکِ استقلال کا دفتر چل رہا تھا۔ روزنامہ 'وفاق' اور 'جمہور' کے لیے رپورٹنگ ہو رہی تھی، جس کا حلقہ اب شیخو پورہ اور لاہور تک پھیل چکا تھا۔ روٹی کے لیے وکیل کی ڈانٹ ڈپٹ سُننی پڑتی تھی البتہ شام کو جب جناب واصف علی واصف کے ہاں پہنچتا تو ایک اطمینان سا نصیب ہوتا کہ یہاں سے کچھ سیکھنے کا موقعہ ملے گا۔

2 فروری، 1974 کی میری ڈائری کا ورق بتا رہا ہے کہ ائیر مارشل اصغر خاں صاحب سے میری محبت کی راہ میں میرے دُکھوں کے انبار کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر سکے۔ ایک بار مجھے تحریکِ استقلال کے ضلعی صدر محمد اِکرام ناگرہ نے بذریعہ خط لاہور اطلاع دی کہ 2 فروری کو ائیر مارشل صاحب شیخو پورہ آ رہے ہیں اور شیخو پورہ کا یہ کنونشن نہایت اہمیت کا حامل ہے، لہٰذا میں دو دن پہلے گاؤں پہنچ گیا اور 2 فروری کو ائیر مارشل صاحب سے تنظیمی امور پر ہدایات حاصل کیں۔ میرے ساتھ چچا خورشید عالم مرحوم، رانا مسلم مرحوم، آمین سندھو اور ایک طالب علم ساتھی محمد ارشد بھی شریک ہوئے۔ مؤخر الذّکر آج کل میڈیکل سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ بےنظیر شہید ہسپتال راولپنڈی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اِس کنونشن میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے پر بہت بحث مباحثہ سُننے کو ملا۔

**اسلامی سربراہی کانفرنس:** ذوالفقار علی بھٹو اُن دِنوں اسلامی سربراہی کانفرنس میں بنگلہ دیش کی شرکت کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ قوم تو دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی لیکن بھٹو بہر حال شیخ مجیب کی شرکت چاہتے تھے۔ 28 جنوری کو تو بھٹو نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''اپنے بھائیوں کے لیے نہیں تو مسلم سربراہوں سے ہی ملنے آ جاؤ۔''

میرا خیال ہے کہ اسلامی سربراہی کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمٰن کی شرکت کی بھٹو کی خواہش درست ہی تھی۔ اِس سے ایک تو بھارت کو احساس ہو گیا کہ وہ اندرا گاندھی جو دو قومی نظریہ کو خلیجِ بنگال میں دفن

کرنے کی باتیں کر رہی تھی ، وہ بہت حد تک درست نہ تھیں۔ایک مسلمان سربراہ کو بالآخر اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہی بیٹھنا ہے اور دوسرے یہ کہ کسی ایک مسلمان ملک کی غیر حاضری بھی تاریخ کو یہ کہنے کا موقعہ فراہم کر سکتی تھی کہ پاکستان میں منعقدہ اسلامی سربراہی کانفرنس 1974 ملتِ اسلامیہ کی مکمل نمائندہ نہ تھی۔یوں کانفرنس کے پہلے روز یعنی 22 فروری، 1974 کو بھٹو نے ،یعنی پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔اگلے روز شیخ مجیب 12 رُکنی وفد کے ساتھ لاہور پہنچ گیا۔

22 فروری ،1974 کا لاہور آج 2023 کے لاہور سے یکسر مختلف تھا۔مال روڈ پر کوئی 20/25 منٹ کے بعد لال رنگ کی ایک بس نظر آتی تھی جس کا نمبر 1 ہوتا تھا۔ماتھے پر 'اسلام پورہ تا آر۔اے بازار' کی پلیٹ سجی ہوتی تھی اور سروس کا نام تھا، لاہور اومنی بس۔ دریں اثنا کوئی نہ کوئی کار بھی نظر آ جاتی تھی۔موٹر سائیکل اور بائیسیکل البتہ عام تھے۔ ناصر باغ جو تب گول باغ کہلاتا تھا، کا جنوب مغربی کونہ دُنیا کو دیکھنے کے لیے بہت موزوں ہوتا تھا۔ بھاٹی گیٹ سے جونہی کوئی تانگہ لوئر مال پر سیکرٹریٹ کی طرف رُخ کرتا تھا تو گھوڑے کی ٹپ ٹپ سے ایک عجیب سماں بندھ جاتا۔دوسری جانب سیکرٹریٹ سے پی ایم جی آفس تک کوچوان بھاٹی دربار، بھاٹی دربار کی آوازیں بلند کرتے ہوئے تانگے بھگا رہے ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب واصف صاحب کے 'لاہور انگلش کالج' سے رات 8 بجے فارغ ہوتا اور پرانی انارکلی سے سیکرٹریٹ کی طرف بڑھتا تو یونیورسٹی گراؤنڈ اور سیکرٹریٹ چوک کے درمیانی حصہ میں سائیکل کی رفتار بہت تیز کر دیتا۔کوئی ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔مستزاد یہ کہ بائیں جانب شرہینہ کے دیوہیکل درختوں کی خوشبو اور خاموشی کو چیرتی آواز ماحول کو نہایت پُراسرار بنا دیتی تھی۔ہاں لکشمی چوک ،میکلوڈ روڈ، مال روڈ پر سینماؤں کی کثرت کی وجہ سے رات 12 بجے تک رونق رہتی تھی۔

فروری ،1974 کے اوائل میں لاہور کو دُلہن کی طرح سجا دیا گیا۔شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد، مینارِ پاکستان ،راوی روڈ ،لوئر مال ، مال روڈ اور اسمبلی ہال کے اطراف کی خوب صورتی کو تو الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔سلیقے سے کی گئی لائٹنگ اور جہازی سائز کے آرائشی دروازوں نے عجیب ہی سماں باندھ رکھا تھا۔لیکن ہوا یہ کہ 20 فروری کی شام کو طوفانِ باد و باراں نے سب کچھ اُلٹ پلٹ کر دیا۔روشنیوں کی لڑیاں بے ترتیب ہو گئیں اور سجاوٹی دروازے زمین بوس ہو گئے۔اگلی صبح تک سب کچھ اصل حالت میں لانے

کی کوشش تو کی گئی لیکن یہ پوری طرح بار آور ثابت نہ ہوئی۔

22 فروری کو جمعہ کا روز تھا اور سربراہانِ ممالکِ اسلامیہ نے نمازِ جمعہ بادشاہی مسجد میں ادا کی تھی۔ سبحان اللہ! کیا نظارہ تھا! کُرّہ ارض پر موجود آدم زاد تو محوِ حیرت تھے ہی، آسمانوں پہ کرّ و بیاں بھی انگشت بدنداں تھے۔ ماضی کے ایک مسلم شہنشاہ کی یادگار عبادت گاہ میں ایک طرف تو آج کے فرماں روا مل کر اپنے انتہائی تذلّل اور بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے زمین بوس تھے اور دوسری طرف فرشتے آسمان پر صدائیں بلند کر رہے تھے کہ:

اے اللہ ! یہی تھے ، یہی تو تھے ، یقیناً یہی تھے
جن کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے

نمازِ جمعہ کے بعد لاہور میں لاکھوں لوگ بادشاہی مسجد سے اسمبلی ہال کے راستہ پر اُمڈ آئے۔ مجھے گول باغ سے بہت شناسائی تھی چنانچہ میں نے باغ کے اُسی جنوب مغربی کونے کا انتخاب کیا جہاں پہلے بھی دُنیا کا 'مطالعہ' کیا کرتا تھا۔ اِسی جگہ سے گاڑیوں کو لوئر مال سے مال روڈ کی طرف مڑنا ہوتا ہے لہٰذا رفتار کا کم ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ آج کے سامراج نے دُنیا پر جو دہشت گردی مسلط کر رکھی ہے، اس کا تو اُس عہد میں تصور تک محال تھا اِس لیے ہر شخص مکمل سکون سے راستے میں کھڑا تھا۔ میں ماموں سرفراز کے ساتھ کھڑا، دوسرے لوگوں کی طرح محوِ انتظار تھا کہ تقریباً اڑھائی بجے کے قریب عدی امین صدر یوگنڈا وہاں سے گزرے۔ پروٹوکول کی موٹر بائیکس کے پیچھے پھر معمر قذافی (لیبیا) اور اُس کے بعد مختلف فرماں روا وہاں سے گزرتے رہے۔ یاسر عرفات اور ذوالفقار علی بھٹو اکٹھے تھے۔ یاسر عرفات نے 'V' کا نشان بنایا ہوا تھا اور بھٹو دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے ہاتھوں کو جُنبش دے رہے تھے۔ شاید وہ کُہنہ فلک سے یہ کہہ رہے تھے کہ دیکھو میں نے کیا کر دکھایا۔ یہ تین روزہ کانفرنس 24 فروری کو ختم ہوگئی۔

لاہور میں محنت مزدوری اور بی۔اے کی تیاری ہوتی رہی اور پھر 1976 میں بی۔اے کا امتحان دے کر میں واپس شیخوپورہ چلا گیا، چونکہ اِس اثناء میں والد صاحب گاؤں چھوڑ کر مستقل شیخوپورہ میں قیام پذیر ہو چکے تھے۔ چند ماہ بعد بی اے کا رزلٹ آ گیا تو ایل ایل بی کے داخلے شروع ہو گئے۔

**ایل ایل بی میں داخلہ**: میں اُن دِنوں انتہائی پُر جوش تھا لیکن کاتبِ تقدیر نے ایک بار پھر اپنے

ہونے کا شِدّت سے احساس دلایا۔ کہاں جاتے ہو؟ رُکو۔ پیسے کہاں سے لو گے؟ فیس کہاں سے دو گے؟ لاہور کا کرایہ کہاں سے آئے گا؟..................اوہو...................۔

بی اے پاس کرنے کی خوشی میں یہ تو سوچا ہی نہ تھا۔ جوں جوں آخری تاریخ قریب آ رہی تھی میرے جسم وجاں کا کرب بڑھتا جا رہا تھا۔

والد صاحب کے پاس جو کچھ رقم تھی وہ شیخوپورہ میں گھر کی تعمیر پر خرچ ہو گئی۔ ہم شہر میں نئے تھے، قرض کون دیتا؟ کالج، یونیورسٹی سے تو فارم بھی بغیر پیسے کے نہیں ملے گا۔ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ پھر مانگنے چل پڑا۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ جی میں آیا کہ اِس سے پہلے کہ آخری کُرتا بھی چاک ہو جائے، کہیں دو روز کی مزدوری کر کے فارم تو لاؤں.................. امرودوں کے ٹوکرے اُٹھائے ہیں، قلی بنا ہوں، منشی رہا ہوں، پنکھے وائنڈ کیے ہیں .................. تو پھر آج کیا امر مانع ہے؟

آس تجنا تو کبھی گوارا ہی نہ تھا۔ سو فیصلہ ہو گیا کہ صبح ایک اور مزدور کا گوشت بازار میں بِکے گا، ایک اور شاہراہ پر غریب کا لہو بہے گا۔ ایک اور سینے میں آگ اُبلے گی، ایک اور دل بے قابو ہو جائے گا اور فیض کو ایک دوسری 'رقیب' کے لیے خام مال دست یاب ہو جائے گا۔ لیکن شاید امتحان تمام ہو چکا تھا۔

اُسی شام بڑے بھائی نے میرا روہانسوسا منہ دیکھ کر پوچھا کہ وہ تمھارے ایل۔ ایل۔ بی کے داخلے کب ہو رہے ہیں؟

''بس تیاری ہے بھائی۔'' میں نے جواب دیا۔

''پیسے ویسے ہیں؟''

''نہیں جی''

''کتنے پیسے درکار ہیں؟'' بھائی نے پوچھا۔

''فی الوقت پچاس روپے مل جائیں تو کام چل جائے گا۔ تیس روپے کے پراسپیکٹس اور فارم وغیرہ اور باقی کرایہ اور زادِراہ .......... بس کام چل جائے گا۔ پچاس روپے سے۔''

اُنھوں نے پچاس روپے کا نوٹ میرے حوالے کیا۔ میں ربِ رحیم کا شکر بجا لایا اور صبح لاہور

روانہ ہوگیا۔شام کی کلاس میں داخلہ لیا اور صبح کے اوقات میں کوئی محنت مزدوری کی تلاش شروع کر دی۔ اگر چہ اُس وقت والد صاحب اور بھائی نے مدد کر دی اور فیس بھی جمع ہوگئی لیکن فیس کی اُن کے پلّے سے ادائیگی والا سلسلہ زیادہ دیر چلنے والا نہ تھا اور نہ ہی مجھے یہ گوارا تھا۔ دوسری طرف صورتِ حالات یہ تھی کہ یکم جنوری، 1977 ہفتہ کے روز میری جیب میں اِتنے روپے بھی نہیں تھے کہ میں اگلے 365 ایام کی یادیں محفوظ کرنے کے لیے ڈائری خرید سکتا۔آج 47 سال کے بعد میں بس قیاس کرسکتا ہوں کہ اُس وقت ڈائری کی قیمت پانچ اور دس روپے کے درمیان ہوگی۔لہٰذا میں نے 2 روپے کی ایک چھوٹی سی نوٹ بک خرید لی اور اُس پر ایک پرانی ڈائری کا کور چڑھالیا۔ یہ بوقتِ تحریر ہٰذا میرے سامنے ہے۔اُس 'نوٹ بک' ڈائری کا آغاز یوں ہوا:

ہفتہ 01.01.1977

''زندگی کی پونجی مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہوا کرتی ہے۔کوئی دولت کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے تو کوئی سامانِ آخرت اکٹھا کرتا ہے۔شاعر غزلوں کو سنبھال سنبھال رکھتا ہے اور عاشق کی پونجی وہ قیمتی لمحات ہوتے ہیں جو وہ محبوب کی زلفوں کے سائے تلے گزار چکا ہوتا ہے۔میں کیا ہوں، تاحال مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن اِتنا ضرور معلوم ہے کہ میری متاعِ حیات کاغذ کے یہ باترتیب پرزے ہیں، جن میں میری یادیں محفوظ ہیں۔''

آج 2023 میں 47 سال کے بعد یہ سچ ثابت ہوگیا کہ میری متاعِ حیات یہ یادیں ہی ہیں۔ 1977 تو زندگی کے اہم سالوں سے ایک ہے لیکن بدقسمتی سے پانچ روپے نہ ہونے کی وجہ سے ڈائری نہ خرید سکا۔

انا کو بچانے کی جدوجہد کے دوران مجھے اپریل 1977 میں واپڈا میں نوکری مل گئی۔ میں نے پروردگارِ عالم کا ایک بار پھر شکر ادا کیا کہ ساڑھے چھ سو روپے کا مشاہرہ ملنا شروع ہوگیا۔

میری ڈیوٹی اکاؤنٹس سیکشن میں لگی اور وہاں بہت محنت کرنا پڑی۔ دفتر کے سینئرز کام میں میری لگن اور عمدہ کارکردگی سے بہت خوش نظر آتے تھے اور وہ مجھے گاہے گاہے تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ پیسے دینے

لگے۔شروع میں تو میں یہ سمجھتا رہا کہ یہ کوئی اعزاز یہ قسم کی ادائیگی ہے لیکن جلد ہی یہ عقدہ کھل گیا کہ یہ اکاؤنٹس سیکشن میں آنے والا کمیشن ہوتا ہے اور جو رقم مجھے دی جاتی ہے، اُس سے کہیں زیادہ رقم میرے حصے کی آتی ہے جو چار عشرے قبل پاس ہونے والے بلز کا شاید ایک یا دو فیصد ہوتی تھی۔بہر حال تنخواہ سے کچھ زیادہ ہی پیسے اِس طرح مل جاتے تھے۔

**مغلِ اعظم**: نوکری سے قبل ہی لاء میں داخلہ کی وجہ سے لاہور سے رابطے ایک بار پھر مضبوط ہو رہے تھے لیکن دن کا پہلا وقت تو شیخوپورہ میں ہی گزرتا تھا۔سیاست کے لیے کافی وقت بچ جاتا تھا بلکہ لاہور لاء کالج کا ماحول من کی بات کر گزرنے میں معاون ثابت ہو رہا تھا۔ابتداء 1977 کی لاہور اور گردونواح کے حوالے سے ایک اہم بات امرتسر ٹیلی ویژن سے دِکھائی جانے والی فلم 'مغلِ اعظم' ہے۔اُن دِنوں پورے لاہور میں کاروبارِ زندگی معطل ہو گیا تھا اور 15۔جنوری ہفتہ کو تو ایسا تھا کہ کوئی شخص 'مغلِ اعظم' کے علاوہ کوئی بات کرنے کو تیار نہ تھا۔لاہور کی آبادی اُس رات دوگُنا بڑھ چکی تھی اور پورے شہر میں جشن کا سماں تھا۔ہال روڈ پر انٹینا فروخت کرنے والوں کی چاندی بن گئی اور اُنھوں نے لوگوں سے منہ مانگے پیسے وصول کیے۔میرے پاس پیسے نہیں تھے اور میں نے پرانے انٹینا اور پرانے ٹیلی ویژن پر ہی گزارا کیا۔

ہمارے گھر میں بھی 15۔جنوری، 1977 کی شام خوب میلہ لگا۔آنے والوں کی چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی۔رات گیارہ بجے فلم ختم ہوئی تو شیخوپورہ کے بازار اور سڑکیں بھی پُر رونق نظر آئے۔سڑکوں پر تبصرے جاری تھے۔میں نے ڈائری لکھی:

''مغلِ اعظم میں وہ کچھ تو نہیں ملا جس کی لوگوں نے توقعات وابستہ کی تھیں تاہم یہ ایک اچھی فلم ہے۔ہدایت کار نے اداکاروں کو قید کر کے رکھا ہوا ہے۔اکبر (پرتھوی راج) کا اندازِ بیان، شہزادہ سلیم (دلیپ کمار) اور انارکلی (مدھوبالا) کی اداکاری بڑی پسند آئی۔''

**1977 کے خونیں انتخابات**: جنوری میں ہی بھٹو نے پاکستان کی تاریخ کے سب سے پُر ہنگام اور خوفناک ترین جنرل الیکشن کرائے جانے کا اعلان کر دیا۔اِس اعلان کو مولانا مفتی محمود نے تو ایک مستحسن اقدام کہا البتہ ائیر مارشل محمد اصغر خاں کا بیان یہ تھا کہ ''ہم انتخاب کے لیے تیار ہیں۔'' شاید اس

کی وجہ یہ تھی کہ مارچ کے پہلے عشرہ میں انتخاب قبل از وقت تھے۔ اِس اعلان سے بھٹو کی کم ہوتی ہوئی خود اعتمادی اور خوف کی بھی بُو آ رہی تھی۔ میرے اِس خیال کو بعد کے حالات سے درستی کی سند مل گئی۔ لاڑکانہ سے ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلہ میں پاکستان قومی اتحاد کے امیدوار مولانا جان محمد عباسی کو اغوا کر لیا گیا اور کاغذاتِ نامزدگی کا وقت گزر جانے کے بعد رہا کیا گیا۔ حزبِ اختلاف کے چوٹی کے راہنماؤں حنیف رامے، چوہدری ظہور الٰہی، سردار شیر باز مزاری اور راجہ منور وغیرہ کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کر دیے گئے۔

اتوار 23۔جنوری، 1977 کو سندھ کے مرکزی شہر کراچی میں پاکستان قومی اتحاد نے جلسہ کیا تو کم و بیش 2.5 لاکھ افراد نشتر پارک میں موجود تھے۔ دو روز بعد اتحاد کو ہل کا نشان الاٹ کیا گیا تو پورے ملک میں 'ہل چل' ہو گئی۔ اِس صورتِ حالات سے بھٹو کی بے چینی ایک یقینی امر تھا۔

بہت سے دیگر پاکستانیوں کی طرح میری نظر میں بھی اب جنرل الیکشن ہی دُنیا کا سب سے اہم کام تھا، لہٰذا جمعہ، 4۔فروری کو لاء کالج سے محض اِس لیے غیر حاضری کی کہ اُس روز بھٹو کے خلاف شیخوپورہ کی تاریخ کا سب سے بڑا جلوس نکلنے والا تھا۔ اِس جلوس میں تقریباً 70 ہزار افراد نے شرکت کی۔ یہ کمپنی باغ سے شروع ہو کر موڑ پیر بہار شاہ گیا اور پھر واپس کمپنی باغ آ کر منتشر ہو گیا۔ اس میں میرا دیا گیا یہ نعرہ بہت مقبول ہوا:

الوداع الوداع، پیپلز پارٹی الوداع

سیاسی سرگرمیوں کے نکتہ عروج پر ہوتے ہوئے بھی مَیں نے قلم کتاب سے اپنا رشتہ کمزور نہ ہونے دیا۔ کالج میں پروفیسر محترمہ شاہدہ جمیل نے مجھے ایک مقالہ کے لیے موضوع دیا تھا:

T.V. Drama........... A war against social evils

جب یہ کوشش اُن کے سامنے رکھی گئی تو اُنھوں نے بہت سراہا۔ اُنھی دِنوں اسلامک لاء کے ٹیچر نے جب یہ مسئلہ بتایا کہ ایک خاتون جو آج بچے کو جنم دے رہی ہے اگر وہ بچے کا باپ اپنا وہ شوہر بتا رہی ہے جو دو سال قبل فوت ہو گیا تھا، تو اُسے مان لینا چاہیے۔ میرے لیے یہ بات بالکل نئی اور عجیب تھی۔ لہٰذا میں نے اسی شام اس عقدہ کشائی کے لیے مولانا سید مودودی کو خط لکھا۔ چند روز بعد اُن کا جواب موصول

ہوا تو یقین ہوا کہ پروفیسر صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے۔

10 ۔فروری، 1977 کو یا سر عرفات اچانک لاڑکانہ پہنچے تو مجھے ایک دھچکا سا لگا، لیکن اُن کے اس دورے کے اسباب اور نتائج کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ 18 ۔فروری کو شیخوپورہ میں پاکستان قومی اتحاد کا جلسہ رکھا گیا تھا۔ جلسہ سے میں نے بھی کوئی دس منٹ کا خطاب کیا۔ میرے علاوہ میاں زاہد سرفراز، حبیب اللہ سعدی، سردار سکندر حیات اور ائیر مارشل اصغر خان نے خطاب کیا۔ میاں طفیل محمد (جماعتِ اسلامی) سٹیج پر آئے لیکن اُنھوں نے خطاب نہیں کیا۔ اصغر خاں، خواجہ رفیق کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے رو پڑے اور کہا کہ ''میں اس بے غیرت، بے شرم، غدار سے بدلہ لوں گا۔'' اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ سرکاری گاڑیاں جو پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم میں استعمال ہو رہی ہیں، انھیں آگ لگا دو۔ ائیر مارشل صاحب جب سٹیج پر آ کر بیٹھے تو میں نے اُنھیں کندھوں سے پکڑ لیا اور جذباتی انداز میں مبارک باد دی تو وہ بہت مسرور نظر آئے۔

بھٹو ان دنوں میں بھی ہمیشہ کی طرح غلطی پہ غلطی کرتا رہا۔ مثلاً گوجرانوالہ میں ڈگڈگی بجانی شروع کر دی یا یہ کہنا کہ 1965 کی جنگ ہم نے نہیں، امریکیوں نے جیتی تھی یا لاہور کے جلسۂ عام میں کھلے عام یہ اعتراف کرنا کہ میں تھک ہار کر رات کو تھوڑی سی پی لیتا ہوں تو کیا جرم کرتا ہوں۔ اِن باتوں نے اُسے بہت نقصان پہنچایا۔ جس روز اُس نے شراب نوشی کا اعتراف کیا اُسی روز یہ نعرہ ایجاد ہو گیا:

''اسلام بڑا پابند ہے، تھوڑی سی بھی بند ہے۔''

25 ۔فروری کے P.N.A کے لاہور کے جلسے نے بھٹو کے اعصاب توڑ کے رکھ دیے۔ اس جلسہ میں تین لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔ اس جلسے سے جاوید ہاشمی، میاں طفیل محمد، نواب زادہ نصر اللہ خاں، مولانا شاہ احمد نورانی اور اصغر خاں کے علاوہ بیگم ایم۔ کے۔ خاکوانی اور بیگم حنیف رامے نے بھی خطاب کیا۔ بیگم رامے کی تقریر نہایت دلسوز، پُر اثر اور معیاری تھی اور اُس نے سامعین پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اُس روز لاہور میں پیپلز پارٹی اور اتحاد کے کچھ کارکنوں میں جھگڑا ہو گیا اور اگلے روز یعنی 26 ۔فروری کو محمد اشرف نامی اتحادی کارکن کو خنجروں کے پے در پے وار کر کے قتل کر دیا گیا۔ یہ خبر جنگل

کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ 27۔فروری کو گول باغ (ناصر باغ) میں محمد اشرف کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی تو گول باغ تو دُور کی بات لوئر مال اور مال روڈ سے بھی انسانوں کا سمندر سنبھالا نہ جا رہا تھا۔اگلے روز 28۔فروری کو اشرف کے سوگ میں ملک گیر ہڑتال ہوئی تو پیپلز پارٹی کو اندازہ ہوا کہ اُنھوں نے ایک خودکش غلطی کی ہے۔

لاہور اُن دِنوں زبردست سیاسی سرگرمیوں کا مرکز و محور تھا۔لہٰذا 5۔مارچ کو یعنی انتخابی مہم کے آخری روز دو بڑے جلوس نکالے گئے۔قومی اتحاد کے جلوس کی قیادت سیکرٹری جنرل رفیق باجوہ نے کی اور P.P.P کے جلوس کی قیادت خود بھٹو نے کی۔اُس روز وزیرِ اعظم بھٹو نے ائیر مارشل اصغر خاں اور مولانا مفتی محمود کو گالیاں بھی دیں۔

اب 7۔مارچ، 1977 (انتخاب کے دن) کی میری ڈائری دیکھیے:

’’آہ! سات سال کی طویل ترین جنگ ہم ہار گئے۔میں ہار گیا، مفتی ہار گیا، ائیر مارشل ہار گیا، پیر پگاڑا ہار گیا، مزاری ہار گیا، نورانی ہار گیا .................. کوثر، پیرزادہ اور بھٹو جیت گئے .................. کفر و اسلام کی جنگ میں سوشلزم نہ ہارا، اسلام ہار گیا۔درود ہار گیا، ہے جمالو جیت گئی۔قرآن ہار گیا، بوتل جیت گئی۔حق ہار گیا اور باطل جیت گیا .................. لیکن نہیں یہ شکست عارضی ہے۔فتح ہمیشہ حق کی ہی ہوا کرتی ہے، ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔‘‘

(اِس طرح کی شکست کو اگر میں آج قلم بند کروں تو الفاظ یقیناً مختلف ہوں گے۔یہ انداز اُس عہد کے زمینی حقائق کے تناظر میں دیکھا جانا ضروری ہے۔بعد کے حالات نے میری رائے بدل دی۔)

1977 کے جنرل الیکشن میں پاکستان پیپلز پارٹی کے حصے میں قومی اسمبلی کی 155 نشستیں آئیں اور پاکستان قومی اتحاد جو 9 جماعتوں پر مشتمل تھا، صرف 36 نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ان نتائج نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا۔قومی اتحاد کے رہنماؤں نے الزام عائد کیا کہ اُن کی جیت کو زبردستی شکست میں بدل دیا گیا ہے۔انھوں نے 10۔مارچ کو ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ 10۔مارچ کو پولنگ اسٹیشنز پر ہُو کا عالم رہا۔

پاکستان قومی اتحاد نے دفعہ 144 کی خلاف ورزی اور خود ساختہ نتائج کے خلاف ملک گیر احتجاجی تحریک کا اعلان کر دیا، لہٰذا اِس سلسلے میں ہم نے 14۔ مارچ سوموار کو مسجد نیلا گنبد لاہور سے اصغر خاں کی قیادت میں ایک جلوس برآمد کیا۔ اُنھوں نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ ”بھٹو نے کہا تھا کہ غریبوں کے بچے مریں گے اور لیڈر گھروں کو جائیں گے۔ بھٹو! دیکھ لو، پہلے ہم نے خود کو پیش کیا ہے۔“

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے 5۔ مارچ کو PNA کے آخری جلوس کی قیادت لاہور میں رفیق باجوہ نے کی تھی۔ رفیق باجوہ اتحاد کی رُکن جماعت، جمعیتِ علمائے پاکستان کے پلیٹ فارم سے تھے اور JUP کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی تھے۔ باجوہ صاحب ایک باصلاحیت اور ہر دل عزیز انسان تھے۔ وہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں، اچھے مزاج اور پُر تاثیر تقاریر کی وجہ سے بہت مقبول ہو چکے تھے۔ پھر 1977 میں 9 جماعتی اتحاد کا جنرل سیکرٹری ہونا بھی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ الیکشن کے فوراً بعد اتحادی جماعتوں کے متفقہ فیصلہ کے مطابق رفیق احمد باجوہ کو JUP اور PNA کے سیکرٹری جنرل کے عہدہ سے الگ کر دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اُنھوں نے PNA کی مرضی اور اجازت کے بغیر ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی ہے۔ اِس ملاقات کے جو بھی محرکات تھے اور ان کے پیچھے موجود جذبات میں جتنی بھی صداقت تھی، باجوہ صاحب نے بے اصولی کی ہے اور اتحاد کا اعتماد کھو دیا ہے۔ اتحادی رہنماؤں کا طرزِ عمل بتا رہا تھا کہ اُنھوں نے اِس بات کی تصدیق کر لی ہے کہ بھٹو باجوہ ملاقات ہوئی ہے، اور اُنھوں نے لاہور اسلام آباد سفر کے ٹکٹ کا نمبر بھی حاصل کر رکھا ہے۔ اِس سلسلے میں جب ائیر مارشل صاحب سے رابطہ کیا گیا تو اُنھوں نے صرف یہ کہا کہ ”باجوہ صاحب ایک اچھے دوست تھے جو ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔“

**رفیق احمد باجوہ سے ملاقات:** اوائلِ مارچ میں ہی میں نے رفیق احمد باجوہ سے ملاقات کا پروگرام بنایا اور جلد ہی وقت طے ہو گیا۔ یوں 17۔ مارچ جمعرات کی شام میں ان کے ایک کلائنٹ چوہدری غلام مصطفیٰ کے ساتھ نیلا گنبد لاہور میں اُن کے دفتر میں موجود تھا۔ دراز قد، پُر اعتماد اور دھیمی گفتگو والے رفیق باجوہ صاحب حقے کے کش لگا رہے تھے اور اُن کے کمرے میں جو دو افراد موجود تھے، اُن سے کچھ بات چیت کر رہے تھے۔ چوہدری غلام مصطفیٰ نے میرا تعارف کرایا کہ یہ اصغر علی جاوید ہیں۔

تحریکِ استقلال اور پاکستان قومی اتحاد کے پرانے کارکن ہیں اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے بڑے سیانے نبّاض ہیں۔

''جی جاوید! کیہ حال اے؟'' باجوہ صاحب نے دریافت فرمایا۔

''ٹھیک ہوں سر، آپ کیسے ہیں؟''مَیں نے مؤدبانہ کہا، اور ساتھ ہی عرض گزاری کہ مجھے تنہائی میں کچھ وقت چاہیے۔ یہ سُن کر باجوہ صاحب نے پہلے سے موجود دونوں دوستوں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور وہ دفتر سے اُٹھ گئے۔

اب پاکستان کی اُس عہد کی سیاست کے دو سنجیدہ طالب علم آمنے سامنے تھے۔ دونوں ہی پُر تجسّس نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چوہدری غلام مصطفٰے کبھی میری طرف اور کبھی باجوہ صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے کہ بات کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پہنچتی ہے۔

''سر! بھٹو نے آپ کو ملاقات کی دعوت کیوں دی اور آپ کے لیے یہ ملاقات کیوں ناگزیر ٹھہری؟ آپ انکار بھی تو کر سکتے تھے''۔ میں نے ایک ماہر جرنلسٹ کی طرح زبردست وار کیا۔

''سیاست کے علاوہ اور کیا مشاغل ہیں؟'' اُنھوں نے جواباً سوال کیا۔

''روزنامہ جمہور اور وفاق کے لیے کام کرتا ہوں اور لاہور لاء کالج کا طالب علم ہوں۔''

''سمجھ گیا۔ برخوردار! میری ذوالفقار علی بھٹو سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اب بھی وہیں ہوں، جہاں کل تھا۔''

اُنھوں نے کل (16 مارچ) نوائے وقت کے اشتہار کو دُہراتے ہوئے دوبارہ قسم کھائی کہ اُنھوں نے کوئی سازش نہیں کی۔ اب مجھے یاد نہیں ہے کہ اس اشتہار میں کیا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اُنھوں نے کہا کہ اُنھیں نہیں معلوم کہ PNA کے لیڈر پنجابی لیڈر کو کیوں پسند نہیں کرتے۔ سُن لیں کہ اِس اِتحاد کی بدولت ملک میں نفاذِ شریعت ممکن نہیں ہے اور یہ بھی کہ اصغر خاں وزیرِ اعظم نہیں بن سکتے۔ اِس لیے یہ اِتحاد ہی بے سود ہے۔

کل تک پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سب سے بڑے اتحاد کا مرکزی راہنما اور جنرل سیکرٹری رہنے والا انسان اِس اتحاد کو بے سود کہہ رہا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے عرض کی کہ سر! آپ

نے دو بار قسم اُٹھائی ہے کہ آپ کسی سازش کا حصہ نہ ہیں۔ کیا آپ اِسی طرح حلفاً اور بالصراحت کہہ سکتے ہیں کہ آپ چندروز پہلے بھٹو سے نہیں ملے؟

''برخوردار! میدانِ سیاست میں ملاقاتیں کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں ہوتیں۔'' اُنھوں نے جواب دیا۔ بات واضح ہوچکی تھی۔ بھٹو کی چال کامیاب ہوچکی تھی۔ میں نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا؛ کرسی سے اُٹھا اور باجوہ صاحب کو سلیوٹ کیا۔ اُنھوں نے حقے کی نڑی ہاتھ سے چھوڑی اور کرسی سے اُٹھ گئے۔ زور سے ہاتھ ملایا اور فرمایا: ''وکیل بن رہے ہو، آتے رہنا''۔ میں نے اُسی روز اپنے اخبارات کو اِس ملاقات کا مختصر احوال بتادیا۔

17۔ مارچ کو ہی ائیر مارشل صاحب کو حراست میں لے لیا گیا اور پھر 20۔ مارچ کو بھٹو نے اتحاد کے تمام قائدین کی رِہائی کا حکم دے دیا۔ ائیر مارشل نے جیل چھوڑنے سے انکار کردیا اور کہا کہ ''مجھے رِہائی کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہنگامی حالت ختم اور سیاسی قیدی رِہا کیے جائیں۔''

**لاہور کا قتلِ عام:** ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک کا ایک انتہائی اہم دن 9۔ اپریل 1977 کا دن ہے۔ اُس روز اتحاد کے 16 مظاہرین کو پنجاب اسمبلی کے سامنے بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ سینکڑوں کی تعداد میں زخمی بھی ہوئے، جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ اِس غارت گری کے بعد ملک بھر میں احتجاجی تحریک زور پکڑ گئی۔ 22۔ اپریل کی پہیہ جام ہڑتال نے تو ملک کو زندانِ خموشاں بنا دیا۔ اُس روز لائل پور میں کرفیو نافذ کردیا گیا اور کراچی، حیدرآباد اور لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔

احتجاجی تحریک میں یہ شعر زبان زدِ عام تھا:

ڈول گئی بھٹو جی کرسی ڈول گئی
تیرے بخت کی چڑیا اب پر تول گئی

اپریل میں ہی مجھے ملازمت مل چکی تھی اور میں مصروف ہوگیا تھا۔ اب صبح دفتری امور اور شام کو لاء کالج حاضری اور FEL کی تیاری سے سیاست کی طرف توجہ کچھ کم ہوگئی۔ یوں بھی احتجاجی تحریک میں پہلے کی طرح عملی شرکت سے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑ سکتے تھے۔ لہٰذا میں کچھ غیر متحرک ہوگیا لیکن قلم

کے ذریعے بھٹو کے خلاف جدوجہد میں نے جاری رکھی۔

بھٹو بڑی ہمت سے اِس خوفناک احتجاجی تحریک کا مقابلہ کرتا رہا۔ اُس نے اسلام سے اپنی دُوری کے تاثر کو زائل کرنے کے لیے ہفتہ وار تعطیل اتوار کی بجائے جمعہ کو کر دی اور یوں یکم جولائی 1977 کو پاکستان میں پہلی بار جمعہ کو تعطیل ہوئی۔ قومی اتحاد کی تحریک میں کچھ نظم وضبط آ چکا تھا۔ بھٹو مذاکرات کی پیش کش کر رہا تھا اور تحریک کی شکل اب یہ تھی کہ شام 5 بجے ملک بھر کے کاروباری مراکز بند ہو جاتے تھے اور کچھ پُر امن جلسے جلوس بھی ہو رہے تھے۔ اُن دِنوں کا نعرہ تھا:

گھڑی تے جدوں پنج ہون     سب دُکاناں بند ہون

16۔ جون کو PNA اور PPP کے درمیان بنیادی امور پر تقریباً مفاہمت ہوگئی اور جولائی کے پہلے ہفتہ میں کبھی نہ حل ہوتا نظر آنے والا مسئلہ حل ہوتا نظر آنے لگا۔ بھٹو نے PNA کے بہت سے مطالبات مان لیے اور 3۔ جولائی کو معاملہ حتمی شکل اختیار کر گیا۔ جو مسوّدہ PNA نے منظور کیا اس پر پروفیسر عبدالغفور، مولانا مفتی محمود اور نوابزادہ نصراللہ خاں نے دستخط فرمائے۔ یہ PNA کے اپنے ہی نامزد اور اختیار گرہندہ لوگ تھے لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ پاکستان قومی اتحاد کی مرکزی کونسل نے اگلے ہی روز یعنی 4۔ جولائی کو منظور شدہ مسوّدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور حکومت کو 10 نئی تجاویز پیش کر دی گئیں۔ یہ بے اصولی کسی بھی طرح، کسی بھی شخص کو گوارا نہ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا بھٹو نے بھی دوٹوک الفاظ میں کہا کہ: ''معاہدہ ہو چکا ہے، اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔''

میرا ذاتی خیال ہے کہ بھٹو کو اگر وقت ملتا تو وہ ان نئی تجاویز پر بھی گفت وشنید کے لیے تیار ہو جاتا ورنہ اُس کا مؤقف تو اصولی تھا کہ معاہدہ تو ہو چکا ہے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ کوئی تیسری طاقت دونوں فریقوں کو معاہدے کا پابند بناتی لیکن ایسا کرنے کی بجائے قوم کو بدقسمتی کے گُھپ اندھیروں میں پھینک دیا گیا اور ساڑھے گیارہ سال کے بعد جب سوئی ہوئی قوم نے کروٹ لی تو پتہ چلا کہ گھڑی کی سوئیاں تو چلتی رہی ہیں، سورج طلوع وغروب ہوتا رہا ہے لیکن قوم وہیں کی وہیں تھی بلکہ پیچھے جا چکی تھی۔ یہ وہ عہد ہے جس میں ہم نے کچھ بھی نہ پایا، بس کھویا ہی کھویا۔

5۔ جولائی، 1977 کو جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ بھٹو کے خلاف کارروائی کے لیے بہت سامیٹیرئیل تھا لیکن اُس کی سزائے موت اسی بدنامِ زمانہ پیپلز گارڈ اور ایف۔ایس۔ایف کی وجہ سے ہوئی۔ 4۔اپریل، 1979 کو صرف 51 برس کی عمر میں اُسے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ بھٹو کی سزائے موت کا فیصلہ واشنگٹن میں ہوا، لہٰذا اِس پر عمل تو ہو کے رہنا تھا لیکن جس مقدمہ میں اسے پھانسی دی گئی اُس کا فیصلہ پاکستانی عدلیہ کی تاریخ کا متنازعہ ترین فیصلہ ہے، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ باعثِ شرم ہے تو غلط نہ ہوگا۔

میری آواز بھٹو کی آمرانہ پالیسیوں اور جبر کے خلاف اُٹھنے والی آوازوں میں ہمیشہ نمایاں رہی۔ غلام مصطفیٰ کھر جیسے گورنر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اُن دنوں موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، لیکن میں یہ کرتا رہا۔ میری والدہ بھٹو کے خلاف تحریک میں جلوسوں میں شرکت کرتی رہیں چونکہ بھٹو کی ٹیم نے اُن کے لاڈلے بیٹے اصغر علی جاوید پر لاٹھیاں برسائیں اور اُس کے قتل کی سازش تیار کی۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اُسے امریکہ کے کہنے پر پھانسی نہیں دی جانی چاہیے تھی۔ پاکستانی جرنیل کو چاہیے تھا کہ وہ امریکہ کو باور کرواتا کہ ہم اپنے فیصلے اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔ اُسے سوچنا چاہیے تھا کہ اُس کا انجام بھی ایسا ہی ہوسکتا ہے، جو ہو کے رہا۔

**بھٹو اور اسلامی بم:** اکتوبر، 1974 میں بھٹو کو احساس ہو گیا تھا کہ امریکہ پاکستان کے 'اسلامی بم' سے پوری طرح آگاہی رکھتا ہے اور اسے انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا 31۔ اکتوبر، 1974 کو امریکی وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر جب پاکستان آیا تو اُس نے بھٹو کو سخت الفاظ میں خبردار بھی کر دیا۔ ہنری کسنجر کا لب و لہجہ انتہائی بدتمیزانہ تھا اور بھٹو اس سے پریشان بھی ہوئے۔ اگست، 1976 میں جب ہنری کسنجر لاہور آیا تو اُس نے بھٹو کے ساتھ بدتمیزی کی انتہا کر دی اور واشگاف الفاظ میں کہا:

"We'll make a horrible example of you."

(ہم تجھے ایک خوفناک مثال بنا کر رکھ دیں گے۔)

سفارتی حوالوں سے اِس طرح کی کوئی مثال ماضی میں ملتی تھی نہ اس کے بعد ملی۔ بہت سے

پاکستانی احبابِ احوال کسنجر کے اِس رویّہ سے پوری طرح آگاہ تھے لیکن حیرت ہے کہ کسی پاکستانی نے کسی فورم پر زبان نہ کھولی کہ کسنجر پاکستان میں بیٹھ کر بھٹو کا حشر نشر کرنے کی دھمکی دے چکا ہے، یہاں تک کہ سپریم کورٹ میں بھی اِسے Issue نہ بنایا گیا۔ میرے جیسے پچھلی صفوں کے لوگوں کے علم میں یہ بات اُس وقت آئی جب کسنجر اِس پر عمل کر چکا تھا۔ اِس سے بھی زیادہ حیران کُن بات یہ ہے کہ پاکستان کے ایک سابق آرمی چیف اور بھٹو کی لاڈلی صاحبزادی بے نظیر نے بھی یہ انکشاف سال ہا سال بعد کیا اور امریکہ کا نام لیے بغیر کیا۔

29۔نومبر، 2023 کو بھٹو کا قاتل ہنری کسنجر 100 سال سے زائد عمر پا کر جہنم واصل ہوا تو کئی زخم تازہ ہو گئے۔

پاکستان میں بھٹو کیس کے حوالے سے جو منظر نامہ بنا بلکہ بنایا گیا اس پر بھٹو اور اُس کے چاہنے والوں کا مؤقف کبھی بھی پوری طرح سامنے نہ آ سکا یا شاید اس کے لیے حالات ہی سازگار نہ ہو سکے۔ جو کچھ میں سمجھ سکا، اُس کے پیچھے بہت سے دیگر مطالعہ کے علاوہ درجِ ذیل کُتب بھی ہیں:

i. If I Am Assasinated by Z.A. Bhutto

ii. A Judicary in Crisis by T.W Raja Ratnam Chief Justice of Sri Lanka

iii. Bhutto ______ Trial and Execution by Victoria Schofield

یہ تینوں کتب پاکستان میں دست یاب ہیں اور ان کے تراجم بھی بالترتیب درج ذیل ناموں سے ہو چکے ہیں جو 'کلاسک' لاہور نے شائع کیے ہیں:

1۔ اگر مجھے قتل کیا گیا

2۔ عدلیہ کا بحران

3۔ بھٹو ........................ مقدمہ اور سزا

بھٹو کیس کے فیصلہ کے بعد متعلقہ معزز جج صاحبان کبھی بھی نگاہِ احترام سے نہ دیکھے گئے۔ یہاں تک کہ جب جسٹس مولوی مشتاق حسین کے جنازے پر شہد کی لاکھوں مکھیوں نے حملہ کر دیا اور جنازے میں شریک لوگ جنازہ چھوڑ کر بھاگ گئے تو لوگوں نے اسے ’حادثہ‘ قرار نہ دیا بلکہ اِسے اللہ کا عذاب کہا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ لوگوں کے ہجوم اور گاڑیوں کے شور کی وجہ سے شہد کی مکھیاں ڈسٹرب ہوئیں اور یہ اُن کا ردِ عمل تھا۔

# اور ’وہ‘

ہر اِنسان کو کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تنی ہوئی رسّی پر چلنا پڑتا ہے۔ وہ ڈگمگاتا ہے، سنبھلتا ہے، پھر ڈگمگاتا ہے اور پھر ِگر جاتا ہے، یا رسّی کے دُوسرے سِرے سے آخری قدم اُٹھاتے ہی خوشی سے اُچھل پڑتا ہے۔ اِس تنی ہوئی رسّی پر میں بھی چلا بلکہ کتنی ہی دیر چلتا رہا۔ میں جب بھی رسّی کے دوسرے End پر پہنچتا تو نیچے چھلانگ لگانے کی بجائے واپس پلٹ جاتا ............ اپنی مرضی سے نہیں، کاتبِ تقدیر کی مرضی سے۔ پھر بھی مجھے احمق اور جنونی کہا گیا۔ مجھ پر آوازے کسے گئے اور میری ذہنی صحت کو مخدوش قرار دیا گیا۔ قریب تھا کہ مجھ پہ پتھر برسائے جاتے کہ اچانک میں نے رسّی سے چھلانگ لگانے کا فیصلہ کر لیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ِگروں گا تو ٹوٹ جاؤں گا۔ میں تو پہلے ہی کانچ کا تھا اور نیچے زمین بھی پتھریلی تھی۔

یہ اپریل، 1977 کی بات ہے جب مجھے ایک شادی میں شرکت کی دعوت ملی۔ میں اپنے پُر کشش چہرے اور خوب صورت بالوں کی وجہ سے اور اپنے خاندان میں پوسٹ گریجویشن کے پہلے طالب علم ہونے کے ناطے جاذبِ نظر شخصیت کا مالک تھا۔ اُس شادی میں شریک ایک خالص لاہوری لڑکی شاید اس جاذبیت کا شکار ہوگئی۔ اور پھر:

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے

میں اُس کا اصل نام نہیں لکھنا چاہتا۔ جو نام میں نے رکھا تھا وہ لکھنا چاہتا تھا لیکن خودنوشت اِس لیے ہی نہیں ہوتی کہ ہر بات ٹھیک ٹھیک کہہ دی جائے اور ہر سچ اُگل دیا جائے ............ یوں میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے 'وہ' کہہ دیا جائے۔ 'وہ' بہت خوب صورت لڑکی نہیں تھی لیکن خوب صورت ضرور تھی۔ لیکن جوں جوں ہم قریب ہوتے گئے پتہ چلتا گیا کہ وہ حسن کے عالمی معیار یعنی فگرز میں تناسب کے اعتبار سے انتہائی خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی شخصیت کی خاص بات یہی تھی کہ وہ اُن دِنوں 10th کی طالبہ تھی اور عشق کی ابتداء اُس نے کی تھی۔

وہ کسی بھی مرد کے سینے میں ہلچل مچانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ مجھ پر بھی اس کے پے در پے وار چلتے رہے اور وہ میرے اعصاب پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ میں نے اُن دِنوں اپنی حقیر سی ملازمت جو FEL کے ساتھ چل رہی تھی، سے کچھ پیسے بچا کر نئی جاپان اسمبل 100 سی سی موٹر سائیکل خرید لی۔ اب ہمارا گھومنا پھرنا آسان ہو گیا۔ اُن دِنوں موبائل فون تو دُور کی بات، اُس کے گھر میں بھی ٹیلی فون نہیں تھا۔ بس دل کے جلتے دیپ کی لَو سے پیغام رسانی ہو جاتی تھی۔ پھر اچانک حالات بدل گئے ............ پانچواں موسم بھی بدلنے لگا.................. درد کی شاخ تہی کاسہ میں اشکوں کے پھول کھلنے لگے............ ہر صبح اُداس، ہر شام اُداس.............. ہر شعر کا ایک ہی مفہوم .............. ہر تصویر میں ایک ہی چہرہ ............ زندگی، زندگی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی .............. بھری دُنیا، ویران نظر آنے لگی اور دل کی بے قراری بُوئے گُل سے بڑھ گئی .............. اُس نے رابطے ختم کر دیے..............کوئی اذیت سی اذیت تھی۔

وہ کوئی اپنے سِوا ہو تو اُس کا شِکوہ کروں
جدائی اپنی ہے اور انتظار اپنا ہے

1978 کی ایک اُداس شام مجھے اُس کا ایک خط ملا جس میں اُس نے تحریر کیا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بے وفا نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ ہماری راہیں جُدا ہیں۔ بس اللہ کی مرضی۔ یہ ایک سادہ معذرت نامہ تھا جس نے میرے روح و جسم کو گھائل کر دیا۔ بس ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میں نے مہینوں کی کوشش کے بعد اپنے کرچی کرچی وجود کو اکٹھا کیا، اُسے سنبھالا اور واپس کبھی نہ مُڑ کر دیکھنے کا اِرادہ

کیا۔ میں امّی کے ذریعے رابطہ کر کے حتمی بات کر سکتا تھا لیکن بس میں نے تنی رسی سے چھلانگ لگانے کا ہی فیصلہ کیا۔ امّی اِن حالات میں میری دوست بنی، لیکن کچھ ہی دِنوں بعد وہ خدا کو پیاری ہوگئیں۔ اب کوئی نہ تھا جو میری مدد کرتا اور مجھے رُسوا کرنے کی بجائے میرے زخم پر مرہم رکھتا۔

اپنے حال پہ خود رویا ہوں
خود ہی اپنا چاک سیا ہے
کتنی جاں کاہی سے میں نے
تجھ کو دل سے محو کیا ہے
(فراز

میں اپنی لاش کو اپنے کاندھوں سے اُتار ہی پایا تھا کہ پتہ چلا کہ ایک نیا مقتل میری تلاش میں ہے۔ ایک دھان پان سی لڑکی، جس نے زندگی کا زیادہ حصہ دوبئ، ترکی اور بیروت میں گزارا تھا، اب پاکستان پہنچ چکی تھی اور اسلامیہ کالج کوپر روڈ لاہور میں بی اے کی طالبہ تھی۔ وہ ساڑھی میں ملبوس رہتی اور اس پر جب چشمہ لگاتی تو قتالہ بن جاتی۔ اُس نے بچپن میں بھی مجھے دیکھ رکھا تھا اور پاکستان آنے کے بعد بھی اس سے ایک ملاقات ہو چکی تھی۔ اُس کے والد ماموں سرفراز مجھے اِس سلسلے میں کچھ تجویز بھی دے چکے تھے ۔اُن دِنوں، لال رنگ کی 100 سی سی جاپان اسمبل یاماہا پر، لاہور کی سڑکوں پر مٹر گشت کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ سو ایک شام میں نے موٹر سائیکل اُس کے گھر کی طرف دوڑا دی۔ کھانے کے بعد موقعہ ملتے ہی اُس نے مجھے میری پہلی داستان از بر سُنا دی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ وہ ملاقات اُس کی ’صدیوں‘ کی دُعاؤں کا نتیجہ تھا۔ میں دیر تک اُسے یہ سوال کرتا رہا کہ اُسے میرے حالات کا کیسے پتہ چلا لیکن وہ جواب میں بس مسکرا دیتی تھی۔ ’’دیر تک‘‘ کے الفاظ پر آپ حیران نہ ہوں کیونکہ وہ لڑکی کچھ ہی دیر بعد میری بیوی (فرحت جاوید) بن گئی تھی اور زندگی بھر مجھ پر محبتیں نچھاور کرنے کے بعد 6۔ جون، 2020 کو مجھے تنہا چھوڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہوئی۔ اس ملاقات سے شادی تک ہم دونوں کو کس اذیت سے دوچار ہونا پڑا، یہ داستانِ پُرآشوب جب بھی یاد آتی ہے آنکھوں میں نمی بھر آتی ہے۔ میرا خاندان اِس شادی سے پوری طرح انکار کر چکا تھا اور فرحت کی والدہ نیم رضامند تھی۔

ایک طوفان اُٹھ گیا جو تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔فرحی کی صحت بگڑ گئی،اُس کا وزن خوفناک حد تک کم ہوگیا اور وہ تقریباً بستر سے چپک گئی۔میرے پیغامات اُسے حوصلہ دیتے رہے اور ماموں کے پیغامات مجھے حوصلہ دیتے رہے۔بالآخر وہ معمول کی زندگی میں واپس آئی۔بس پھر آسمان پہ طے ہوئے سنجوگ نے زمین والوں کو زیر کر ہی لیا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ'وہ' کہاں گئی؟ ہے نا؟............ تو سُنیئے کہ اُس سے میری ایک ملاقات طویل مدت کے بعد 1992 میں ہوئی۔اُس وقت وہ اپنا سُسرالی شہر چھوڑ کر دوبارہ لاہور شفٹ ہوچکی تھی۔میں نے اُس سے اُس کی بے وفائی کا شِکوہ کیا تو کہنے لگی کہ یہ جھوٹ اور بہتان ہے، میں اب بھی وہ ہی ہوں جو کبھی ماضی میں تھی۔بس یہ سمجھ لو کہ ایک جسم سے روح نکال کر بھی اُسے زندہ رہنے کا کہہ دیا گیا ہے۔اس کے بعد وہ مسلسل میرے ساتھ رابطے میں رہی۔وہ پاکستان آتی تو نکلسن روڈ لاہور پر اکثر میرے دفتر آجاتی۔کبھی کبھار گھر سے کھانا بھی تیار کر لاتی اور کھانے کے دوران مسلسل میری طرف دیکھتی رہتی۔دفتر سے فارغ ہوتے وقت ہم کبھی کبھار فون پر بات کر لیتے۔ایک روز وہ اچانک میرے کمرے میں پہنچی اور کہنے لگی:

''تم نے شادی کیوں کی؟''

''کیا مطلب،تم نے کیا شادی نہیں کی؟''

''میرا مطلب ہے،کسی اور سے کیوں؟'' اُس نے پوچھا۔

''تمھارا خط اب بھی میرے پاس محفوظ ہے،جس میں تم نے مجھے کہیں بھی شادی کر لینے کا کہا تھا۔''

''اچھا''............ اُس نے ایک سرد آہ بھری اور خاموش ہوگئی۔

یہ سلسلہ سال ہا سال جاری رہا۔پھر ایک آندھی اُٹھی اور اس بے نام رشتے کو خس وخاشاک میں دبا گئی۔ایک طویل مدت کے بعد 2000 میں اُس نے میرے ساتھ پھر رابطہ کیا تو میں نے مصنوعی سی ناراضی کا اظہار کیا۔اُس نے مجھے بتایا کہ میٹرک میں بہترین نمبروں کی بنیاد پر پنجاب کالج آف کامرس نے اُس کے بیٹے کو فری پڑھانے کی پیش کش کی ہے اور اُسے ایک موٹر سائیکل بھی تحفے میں دی ہے۔

''تو پھر؟''میں نے کہا۔

میرے اِس غلط انداز پراُس نے کوئی سخت سا جملہ بولا اورفون بند کر دیا۔

پھر کئی سال میں روزانہ اُس کے گھر سے چند گز کے فاصلے سے گزرتا رہا کہ یہ میرا رستہ تھا۔ اِس طرح وہ کبھی کبھار یاد آتی تھی، لیکن مذہب اور معاشرے کی زنجیروں کو آخر کیوں توڑتے رہتے۔ پھر وہ مجھ سے ناراض بھی تو ہے۔

کہیں ملا تو کسی دن منا ہی لیں گے اُسے

وہ زُود رنج سہی پھر بھی یار اپنا ہے

1978 کے ابتدائی ایام میں 'وہ' کچھ دیر میرے اعصاب پہ سوار رہی اور اس سے ملازمت اور تعلیم دونوں ہی متاثر ہوئے۔ لیکن محبت اور اندیشہ ہائے سُود وزیاں ........... کیا نسبت ہے؟ زیاں بڑھنے لگا تو فکر لاحق ہوئی۔ بھول جانے کی کوشش کی لیکن ہر بات انسان کے بس میں تو نہیں ہوتی۔ بھول جانا تو بندے کے بس میں بالکل نہیں ہوتا۔ ساغر صدیقی کے ساتھ کچھ بے فکری کے لمحات بیتے تھے، اُس کا چہرہ نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ کیا انسان تھا، گردشِ لیل ونہار نے کہاں لا کھڑا کیا۔ میں ساغر 2 نہ بن جاؤں!

اِس سے پہلے کہ کوئی حادثہ رُونما ہوتا میں نے حضرت واصف علی واصف سے مشاورت کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کچھ اِس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے کہ محبت کی کامیابی اور ناکامی ایک ہی بات ہے۔ محبت زندہ رہے تو فراق بھی وصال ہے اور مر جائے تو وصال بھی فراق ہے۔ ہم طلباء ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دیا کرتے تھے، شاید اب توجہ کا وقت آ گیا تھا۔ ایک روز لاہور لاء کالج کے بجائے لاہور انگلش کالج واصف صاحب کی طرف چل دیا۔ راستے میں خیال آیا کہ وہ کیا کہیں گے کہ لوگوں کے اژدہام سے رستے بنا کر آگے نکلنے کا دعویدار ایک لڑکی کے ہاتھوں شکست کھا گیا، لہٰذا میں واپس لاء کالج لوٹ آیا۔ ہار جانے کا طعنہ مجھے کب گوارا تھا حالانکہ ہار چکا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ کچھ دیر پہلے کہیں ڈیل کارنیگی کی کتاب 'How to Stop Worrying and Start Living' کا اُردو ترجمہ دیکھا تھا۔ فوراً یاد آ گیا کہ مکتبہ 'میری لائبریری' پر دیکھا تھا اور نام تھا 'پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے'۔ بس پھر پانچ

روپے خرچ کیے اور کتاب خرید لی۔ جس وقت میں یہ سطور قلم بند کر رہا تھا تو میں نے اپنی لائبریری سے یہ کتاب تلاش کر کے اپنی میز پر رکھ لی۔ میں سوچ رہا تھا کہ 'میری لائبریری' سے میری لائبریری تک کے اس سفر میں اِس کتاب کو چالیس سال بیت گئے ہیں۔

کتاب کے اندرونی ٹائٹل کے نیچے میرے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک جملہ ہے: ''عقل مند انسان کے لیے ہر دن ایک نیا دن ہے'............ جاوید۔

دراصل یہ کارنیگی کا جملہ ہے۔ ڈیل کارنیگی نے پروفیسر ولیم جیمز کا ایک جملہ پہلے ہی باب میں نقل کیا ہے کہ ''جو کچھ ہو چکا ہے، اُس پر قناعت کرو کیوں کہ بدنصیبیوں کا خمیازہ برداشت کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ جو کچھ بیت چکا ہو، اُس پر رضامند ہو جاؤ۔'' بس یہ دو جملے زندگی میں نیا پن لے آئے۔ میں نے زندگی بھر قرآنِ پاک کے بعد جن کتب کو سب سے زیادہ مؤثر پایا اُن میں حضرت واصف علی واصف کی 'دل دریا سمندر' اور دوسری ڈیل کارنیگی کی یہ مذکورہ بالا کتاب ہے۔ بہت دیر بعد جب مجھے یہ انگلش میں میسّر آئی تو اسے مزے لے لے کر پڑھتا رہا۔ میری ڈائری کے 31۔مئی، 1978 کے ورق پر لکھا ہے:

میں عمر بھر کے لیے اُس کا ساتھ کیسے دوں ۔۔۔ کہ راستوں نے کہیں پر بدل ہی جانا ہے

ہوا چلے گی تو سب نقش ہی مٹا دے گی ۔۔۔ وہ جیسے ریت پہ لکھا ہوا فسانہ ہے

اور اپنے تئیں محبت کا کام تمام کر دیا۔

# امّی جی

اِس بے کار اور بے وقار محبت کے جھٹکے سے کچھ سنبھلا تو FEL کے امتحان سر پہ تھے۔ اس امتحان پر بہت توجہ کی ضرورت تھی لیکن بدقسمتی کہ انھی دِنوں امّی کی طبیعت بگڑ گئی۔ چند ہی ہفتوں میں یہ بگاڑ اِس حد تک بڑھا کہ وہ بستر کی ہو کر رہ گئیں۔ تمام میسّر وسائل بروئے کار لائے گئے لیکن مرض بڑھتا گیا

جوں جوں دوا کی۔ میں کبھی ملازمت سے اور کبھی لاء کالج سے غیر حاضر ہو کر اُن کے جسم پر بنے لاتعداد زخموں کی ڈریسنگ کرتا رہا اور کبھی گود میں رکھ کر اُن کا سر شیمپو سے دھوتا رہا۔ بھابھی شمشاد بیگم زوجہ ڈاکٹر شوکت علی مرحوم جو نیک سیرت خاتون تھیں، کی معاونت ہمیشہ حاصل رہی۔

11۔اگست (5۔رمضان المبارک) جمعہ کے روز اُن کی بیماری نے مجھے مایوس کر دیا۔ جمعہ کی تعطیل کی وجہ سے میں گھر پہ ہی تھا۔ نمازِ جمعہ پڑھنے بھی نہ گیا۔تقریباً 2 بجے کا وقت تھا کہ امّی نے سوال کیا کہ کیا آج جمعہ نہیں ہے؟ ہم نے بتایا کہ ماں جی! جمعہ ہی ہے آج۔

''اچھا، وقت کیا ہے؟'' امّی نے دوسرا سوال کیا۔

''2 بجے ہیں ماں جی!'' میں نے جواب دیا۔

''اوہو........... میں بہت شرم سار ہوں........... مجھے بہت دُکھ ہوا ہے........... میں بے حد پریشان ہوں........... کاش یہ غلطی نہ ہوتی........... کاش میں وعدہ پورا کر سکتی۔ میں نے تو اللہ کے ساتھ گیارہ بجے پہنچنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب دو بج گئے ہیں۔ اچھا پھر سہی........... اب کیا ہو سکتا ہے؟''

''امّی جی! کب وعدہ کیا تھا اور کہاں پہنچنا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

امّی نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے ہی پوچھنا شروع کیا کہ ''جاوید! خود ہی بتاؤ تم نے کسی سے کسی کام کا وعدہ کیا ہو اور تم اُس وقت وہ نہ کرو تو کتنی بُری بات ہے؟''

''ٹھیک کہا ماں جی! آپ نے۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش ہو گئیں لیکن اُن کے چہرے کا کرب بتا رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔

14۔اگست، سوموار کو امّی کو میو ہسپتال لاہور منتقل کر دیا گیا۔ چونکہ اُس روز چھٹی تھی لہٰذا ڈاکٹر احمد علی ہارٹ سپیشلسٹ اور ڈاکٹر ایس۔آر۔اے گردیزی سرجن سے ان کے کلینک پر ملے۔ دونوں نے صورتِ حال کو مایوس کُن قرار دیا۔ چوتھے روز رمضان المبارک کا دُوسرا جمعہ آ گیا۔ وقت وہی جو اُنھوں نے گزشتہ جمعہ کو بتایا تھا۔ میں نسبت روڈ چوک سے برف لے کر گیا اور اُن کی خدمت میں مصروف تھا۔ امّی نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں کھولیں ...... لبوں پہ کچھ جُنبش ہوئی اور پھر اُنھوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دُعائے نیم شب میں کس کو یاد آؤں گا
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہُوا تُو چل بسی

امّی کو اُسی دن زندانِ خاموشاں میں چھوڑ آئے۔

میری بھتیجی سعدیہ بار بار پوچھتی رہی کہ امّی کب واپس آئیں گی؟ بھابھی شمشاد بار بار بے ہوش ہوتی رہیں اور میں ................... میں اجل کی ارزانی پہ خندہ زن رہا ........... آج 45 سال بعد بھی اِسی طرح ہوں۔

وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

**دُنیا بدل گئی**: اگست میں جن دِنوں امّی اللہ کو پیاری ہوئیں میرے پاس چند ہزار روپے جمع تھے۔ اُن دِنوں یہ خبر بھی گردش کر رہی تھی کہ جاپان اسمبل موٹر سائیکلز کی درآمد پر عنقریب پابندی عائد ہو جائے گی، لہٰذا میں نے فوراً موٹر سائیکل خریدنے کا پروگرام بنایا جو امّی کی بیماری اور موت کی وجہ سے ممکن نہ ہو سکا۔ دسمبر میں ازسرِنو اِرادہ کیا، جس کی اللہ نے تکمیل کر دی۔ سُرخ رنگ کی جاپان اسمبل یاماہا 100 جب گھر آئی تو ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے خاندان کی دُنیا ہی بدل گئی ہو۔ سب خوشی سے اُچھل رہے تھے۔ بڑے بھائی اور والد صاحب نے مبارک دی۔ چھوٹا بھائی ارشد تو خود خرید کے لایا تھا۔ وہ بھی بہت مسرور نظر آ رہا تھا۔ بس ایسے لگ رہا تھا جیسے اللہ نے کوئی بہت بڑی نعمت عطا کر دی ہو اور تھا بھی ایسے ہی۔ میری سائیکل کا اگر پیڈل ٹوٹ جاتا تو کئی کئی ہفتے بغیر پیڈل کے، پیڈل کی کِلّی پر پاؤں گھماتے گزر جاتے تھے۔ شاید 2 روپے کا پیڈل ملتا تھا اُن دِنوں!

1979 میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر لیا تو میں نے اپنی توجہ ڈی۔ ایل۔ ایل پر مرکوز کر دی۔ نوکری تو جاری تھی ہی لیکن پڑھائی چھوڑ دینے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ لہٰذا ایل۔ ایل۔ بی کا

رزلٹ آنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں ڈی۔ایل۔ایل کے لیے داخلہ لے لیا۔یہی وہ ایّام تھے جب میرے ماموں سرفراز علی بھٹی نے میرے سامنے تجویز رکھی کہ اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ اُنھوں نے کہا کہ نوکری سے گزارہ ہو رہا ہے اور تعلیم مکمل ہوگئی ہے۔ باجی (میری امّی) کے فوت ہو جانے کے بعد گھر میں کسی لڑکی کی ضرورت بھی ہے۔اِس کے علاوہ بھی اُنھوں نے بہت سارے دلائل دیے جو وزن رکھتے تھے۔ میرے اپنے گھر سے تو کوئی مجھے کہنے والا نہ تھا، اور وہ اِس بات پر ناراض بھی تھے کہ میں اِس سلسلے میں اُن کی مرضی کے مطابق نہیں چل رہا تھا۔لہٰذا میں نے پہلی بار سنجیدگی سے سوچا اور اِس نتیجہ پر پہنچا کہ شادی تک 'حادثات' ہوتے رہیں گے۔لہٰذا ماموں کے کہنے پر فرحت (تب ماموں زاد اور پھر بیوی) سے بات چیت کی اور بات تقریباً فائنل ہوگئی۔اِس فیصلہ سے جو واحد نقصان ہوا وہ یہ تھا کہ نوکری نہ چھوڑی جاسکی اور پریکٹس کا آغاز نہ کیا جاسکا۔

فرحت اور ممانی (والدہ فرحت) دونوں ہی ذرا مختلف سی خواتین تھیں۔ پاکستان سے دُور رہنے کی وجہ سے وہ ہمارے معاشرے میں کچھ مِس فِٹ (Misfit) سی تھیں۔ یہ انداز اگر نقصان دِہ ہوتا ہے تو بعض اوقات سود مند بھی۔فرحت کی عمر اُس وقت 23 سال تھی لیکن اُس نے ایک نہایت مدبّرانہ فیصلہ کیا اور وہ یہ کہ چونکہ وہ دل کے والو کی مریضہ ہے اِس لیے اُسے شادی سے قبل ماہرینِ امراضِ قلب سے مشاورت کر لینی چاہیے۔لاہور میں اُن دِنوں دل کا کوئی ہسپتال نہ تھا لہٰذا تفصیلی صلاح مشورے کے لیے NICVD کراچی چلی گئیں۔ وہاں کے ماہرین نے بتایا کہ والو کا مسئلہ تو بہرحال موجود ہے لیکن یہ مسئلہ شادی یا بچوں کی پیدائش کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہے۔

**میرا ننّھا فرشتہ:** 23۔اکتوبر، 1981 کو شادی ہوئی تو فرحت (میری شریکِ حیات) بہت خوش نظر آئی۔انسانی عقل وخرد کئی سوالوں کے سامنے عاجز آجاتی ہے۔ مجھے بھی اس کی بے پایاں مسّرت کا راز آج تک نہیں مل سکا۔فرحت وصال وفراق کی میری کئی داستانوں سے واقف تھی اور اس نے 23۔اکتوبر کی رات اُن کا ذکر بھی چھیڑا۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان۔وصل بھی تو اللہ کی پیدا کردہ ایک نعمت اور عطا ہے، یہ بھی فانی ہے۔سو ماضی کی داستانیں محو ہوتی گئیں۔اُس نے کئی بار مجھ سے پوچھا کہ کبھی 'اُس' سے ملاقات

ہوئی یا کبھی 'وہ' ملی؟ میں کبھی جھوٹ کا سہارا لے کر اور کبھی کھرا کھرا سچ کہہ کر جواب تو دیتا رہا اور اُسے بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ ہر چیز فانی ہے، تاریخ بھی کچھ ہی دَور کی زندہ ہے۔ بس بھول جاؤ، بھول جاؤ اور بھول جاؤ۔ حال کو دیکھو اور اسی میں زندہ رہو۔ اِمروز اہم ہے، لیکن لاکھ کوشش کے باوجود 'وہ' ہمارے گھر سے نہ نکل پائی۔ چار عشرے بیت گئے۔ پیرانہ سالی عافیت کی تلاش اور جستجو میں رہتی ہے اِس لیے 'وہ' جبر سے بھی نہ نکالی جا سکتی تھی۔

شادی کے اگلے برس اللہ نے ہمیں ایک بیٹا عطا کیا۔ اُس کی پیدائش کچھ قبل از وقت تھی اور ہم میاں بیوی کے لیے عہدِ ابتلاء کا آغاز بھی کچھ قبل از وقت تھا۔ بہت پیارا سا، بہت خوب صورت سا بچہ...... ...... فرحت تو نہ دیکھ سکی لیکن میں اُسے دیکھنے بار بار نرسری کی طرف بھاگتا تھا۔ فرحت خود ذہنی اور جسمانی اذیت کی انتہا پہ تھی۔ وہ گنگا رام ہسپتال لاہور کے پرائیویٹ روم نمبر 10 میں پڑی بار بار مجھے پوچھتی رہی کہ 'وہ کیسا ہے؟' میرا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ اُس کے لیے دُعا کرو۔ موت وحیات کی 48 گھنٹے کی کشمکش کے بعد ہمارا بیٹا جدھر سے آیا اُدھر لوٹ گیا۔

بیٹے کی پیدائش کے روز موت فرحت کو چھو کر گزر گئی۔ ربِّ رحیم اُس روز بہت غصے میں لگ رہے تھے۔ مجھے کسی طور اطمنان حاصل نہ ہو رہا تھا۔ آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑا ہر شخص سہما ہوا تھا۔ ذرا آہٹ ہوتی تھی تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ ہر لمحہ نئی خبر مل رہی تھی۔ ڈاکٹر ہاجرہ جو آپریشن میں مصروف تھیں، مجھے پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ زچہ کی زندگی خطرے میں ہے۔ کسی نے مجھے کہا کہ کسی اچھی خبر کی توقع عبث ہے ........... تو پھر یہاں کیا کر رہا ہوں میں، یہ سوچ کر میں کمرہ نمبر 10 کی طرف لَوٹ گیا ...........

کمرہ اس وقت خالی تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ میری آواز دُور تک جا رہی تھی لیکن میں اس سے بے نیاز ہو کر چیختا رہا کہ یا اللہ! معاف فرما دے، یا اللہ! رحم فرما دے، یا اللہ! غلطیوں سے درگزر فرمائیں۔ اے اللہ! تجھے تیرے محبوب کا واسطہ فرحت کو زندگی عطا فرما دے۔ اے اللہ! اسے موت کے منہ سے نکال لے۔ میں پاگلوں کی طرح با آوازِ بلند پکارے جا رہا تھا۔ ہر لفظ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تھا۔ اے اللہ! میں تجھ سے فرحت کی بھیک مانگتا ہوں۔

اچانک کمرے میں ارشد (میرا چھوٹا بھائی) داخل ہوا اور اُس نے یہ نوید سُنائی کہ معاملہ ٹھیک سے نمٹ گیا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے قرآن پاک میں پڑھا تھا:

''اور ہم ضرور تمھیں کسی قدر خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان کے ساتھ آزمائیں گے۔'' (2: 155)

آج میں سوچ رہا ہوں کہ اِس دُعا میں اگر میں نے نومولود کو بھی شامل کیا ہوتا تو اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

دو روز بعد 9 بجے رات بہت تیز طوفان آیا............ طوفانِ باد و باراں۔ میں فرحت کے پاس کمرہ نمبر 10 میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر طوفان کی شِدّت جاننے کے لیے کمرے سے اُٹھ کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ مزنگ روڈ پر گزرتی ٹریفک خوف کا شکار تھی۔ ہر کوئی جائے پناہ کی تلاش میں تھا۔ فرحت کی آواز آئی، ''اندر آجائیں، آپ باہر کیا کر رہے ہیں؟'' میں ابھی اُس کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ ایک نرس اجازت طلب کر کے اندر آئی۔

''آپ کا بیٹا اللہ کو پیارا ہو گیا ہے، اُسے نرسری سے لے آئیں'' اُس نے کہا۔

یاد آیا: اَلَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ۔ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

طوفان کی شِدّت میں کمی آئی تو میں ماموں منور کے گھر کی طرف چل دیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ طوفان نے ماحول کو خوفناک بنا رکھا تھا۔ میں نے ماموں کو جگایا۔ پھر انھیں ساتھ لے کے دوسری گلی میں خالو رشید کے گھر گیا۔ اُنھیں نیند سے بے دار کیا اور واپس گنگا رام ہسپتال آ گیا۔ فرحت اپنی والدہ کی موجودگی کے باوجود تنہا اور اُداس ہی لگ رہی تھی۔ میں نے اُس کے پیلاہٹ بھرے چہرے کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کچھ کہہ سکی اور نہ میں۔ وہ سمجھ گئی کہ میرے لال کو اللہ کے سپرد کرنے جا رہا ہے۔

نرسری سے بچے کو لیا۔ اُسے ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ سوچتا رہا اور سوچتا ہی رہا کہ ............ میں یعقوب تو نہیں ............ تو پھر یہ یوسف کیوں ہے؟ ............ خیال آیا کہ اللہ کے نزدیک اس کی تخلیق کا مقصد کیا تھا؟ ............ جواب ملا:

''ہم ضرور آزمائیں گے تم کو''

پھر مزید کچھ خیال آیا۔

جواب ملا:

''اور اگر ہم دِکھا دیں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت، پھر وہ چھین لیں اُس سے تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے''(11:9)

صبر کا دامن چھوٹنے لگا تو ............

جواب ملا:

''صابروں کو بے حساب اجر دیا جائے گا''(39:10)

سو بیٹے کو اُٹھایا اور میانی صاحب قبرستان کی طرف چل دیا۔ ماموں منور کے پیچھے خالو رشید خوب صورت لباس میں ملبوس نومولود کو بارش سے بچاتے ہوئے لیے بیٹھے تھے اور میں اکیلا تھا ............ یقین کریں میں سچ مُچ اکیلا تھا ............ ہم دھیرے دھیرے میانی صاحب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رات 12 بجے گورکن کو ڈھونڈا۔ غازی علم دین شہید روڈ والے گیٹ سے چند گز آگے ایک ننھی سی قبر تیار کی۔ یوسفِ ثانی کو لحد میں اُتارا تو خیال آیا کہ یعقوب کی آنکھوں کے نیچے آنسوؤں نے اگر لکیریں بنا دی تھیں تو یعقوب کا کیا قصور؟

جواب ملا:

''ہم ضرور آزمائیں گے تم کو''

''میرے بیٹے! اللہ حافظ............ تمھارا بھی اور میرا بھی''

ساڑھے بارہ بجے رات تک ہم سب پوری طرح بھیگ چکے تھے۔ ماموں اور خالو گھر کی طرف روانہ ہو گئے اور میں گنگا رام ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ کے کمرہ نمبر 10 میں پہنچ گیا۔ سردی کی وجہ سے مجھے بخار ہو چکا تھا۔ ہسپتال میں مزید قیام کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ اگلے روز ہم گھر روانہ ہو گئے ............ خوفناک یادیں جو بظاہر تو نومولود کے ساتھ دفن کر دی گئیں لیکن چار عشروں کے بعد بھی مزنگ روڈ یا غازی علم دین شہید روڈ سے کبھی گزر ہوتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ 'کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ'

کا اطلاق دُکھوں پر نہیں ہوتا۔

انسان کتنا بے بس ہے! .................. بے بس ہی تو ہے۔

اِس حادثہ سے میری جیب خالی ہوگئی، بیوی کے زیورات بِک گئے اور میں ایک بار پھر غریب ہو گیا۔لیکن کیا کیا جائے ،نصیب تو نہیں بدلا جا سکتا۔کوئل کی آواز کتنی بھلی لگتی ہے، اُس کا نصیب ہے۔ گدھے کی آواز بھی اللہ نے بنائی ہے اور اللہ اسے ناپسند بھی کر رہا ہے۔ یہ اُس کا نصیب ہے۔ اِس ناانصافی، یا ناانصافی تو مناسب نہیں،اس تقسیم پر شدتِ کرب بعض وقت پاگل کر دیتی ہے۔۔۔
اُس مالک کی مرضی ہے۔ہمیں جدوجہد کی ہدایت کی گئی ہے، وہ میں کرتا رہا ہوں اور اب تک کر رہا ہوں .................. بس یہی میرے بس میں ہے۔

1981 میں صدر ضیاء الحق نے، نہ جانے کن محرکات کی بنا پر، یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب یومِ آزادی سرکاری کی بجائے عوامی سطح پر منایا کریں گے۔ اِس فیصلہ سے پاکستان میں ایک نئے کاروبار نے جنم لیا۔ پورا ملک اور بالخصوص لاہور سبز ہلالی پرچموں سے ڈھانپ دیا گیا اور نوجوان اپنی سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر پرچم لہرائے گھوم رہے تھے۔ یہ پاکستان میں بارہ ربیع الاوّل کے بعد سڑکوں پر منایا جانے والا دوسرا تہوار بن گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب کے بار جولائی اگست میں کسی سڑک پر جھنڈیوں، جھنڈوں کا سٹال لگایا جائے، لہٰذا میں دفتر سے نکلتا اور سیدھا گنپت روڈ، اُردو بازار چلا جاتا۔ جتنے پیسے جیب میں ہوتے اُن کا سامان خریدتا۔ بورا کندھے پر رکھ کر لاری اڈے چل پڑتا اور شیخوپورہ جا کر چھوٹے بھائی کے حوالے کر دیتا۔بعض اوقات اِتنی سیل (sale) ہوتی کہ سڑک کنارے پڑے پھٹے تقریباً خالی نظر آتے۔ میں بورا پلٹتا تو وہ کہتا کہ بھائی! یہ تو ابھی بِک جائے گا۔ یہ سُن کر میں اُسی وقت دوبارہ لاہور روانہ ہو جاتا اور سارے دن کی فروخت سے آئی رقم سے سامان خرید کر رات کو واپس شیخوپورہ پہنچ جاتا۔صبح میں دفتر کے لیے نکلتا اور وہ یومِ آزادی کے سامان کا بورا پھٹے پر سجانا شروع کر دیتا۔ 1982 میں صرف تین ہفتوں کے اِس کاروبار سے میرے پاس ہزاروں روپے جمع ہو گئے اور ایک بار پھر کچھ سکون نصیب ہوا۔ یہ سلسلہ دو تین سال چلتا رہا۔

زندگی دھیرے دھیرے معمول کی طرف لوٹ آئی اور اگلے برس (16۔اپریل،1983 کو) اللہ نے ہمیں ایک بیٹی عطا فرمائی۔ پریگننسی کے چھوٹے موٹے مسائل اب کے بار بھی رہے لیکن اللہ جب کچھ دینے اور لینے کا ارادہ کر لے تو کون دم مارے۔اِس بیٹی کا نام فرحت نے اسلامیہ کالج لاہور کی اپنی ایک کلاس فیلو دوست کے نام پر سیمل رکھا۔ یہ لڑکی بہت دیر بعد پنجاب کی MPA بنی۔ یہ نام کئی وجوہات کی بِنا پر کئی سال بعد بدلنا پڑا۔ نیا نام ایمن جاوید رکھا گیا۔2023 میں جب یہ یادیں مَیں قلمبند کر رہا تھا تو وہ ایم اے ایجوکیشن اور ایم اے اُردو کر کے اپنا پرائیویٹ تعلیمی ادارہ چلا رہی تھی۔ایڈمنسٹریشن کا ڈھنگ اسے خوب آتا ہے۔ ماشاءاللہ ایک بیٹے (موسیٰ) کی ماں ہے لیکن بہت سی دوسری ٹیچرز کی طرح اپنے بیٹے کو اپنے سکول میں نہیں رکھا ہوا۔ یہ بچہ بلا کا ذہین اور باتونی ہے۔میرا خیال ہے کہ اس کے لیے وکالت کا پیشہ موزوں رہے گا۔

**1982 کا دوسرا حادثہ:** 1982 میں میرے بیٹے کی قبل از وقت پیدائش اور پھر وفات ہوئی، اور پھر اسی سال اِسی طرح کا ایک دوسرا حادثہ بھی پیش آیا اور وہ یہ کہ بڑے بھائی ڈاکٹر شوکت علی کو اللہ نے طویل مدت کے بعد دوسرا بیٹا عطا فرمایا۔ گھر میں کئی من لڈو تیار کروائے گئے۔ جب لڈو محلے اور برادری میں تقسیم کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ نومولود فرہاد کو ٹیٹنس کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ بچے کو میو ہسپتال لاہور منتقل کیا گیا لیکن اللہ کی رضا کے آگے کس کی چلتی ہے۔تیسرے روز وہ اللہ کی طرف واپس لوٹ گیا۔

خاندان کے دو بیٹوں کی المناک موت پر ابّا جی بہت رنجیدہ اور غمگین رہنے لگے، لٰہذا دو برس بعد 1984 میں جب وہ حجِ بیت اللہ کے لیے گئے تو اُنھوں نے میرے لیے بیٹے کی پُر زور دُعائیں کیں۔فرحت اُن دِنوں امید سے تھی۔ یوں اللہ نے ہمیں 1984 میں بیٹے کی نعمت سے مالا مال کیا۔الحمد للہ ثُمَّ الحمدللہ۔نام رکھا گیا فیصل جاوید۔رہائش اُن دِنوں شیخوپورہ میں تھی اور دفتر داتا دربار روڈ لاہور پر۔دو بچے اور روزانہ کا لاہور کا کرایہ ………… اخراجات ایک بار پھر بڑھے تو فیصلہ کیا کہ میں اور فرحت دونوں مل کر کوئی چھوٹا سا ٹیوشن سنٹر کھول لیتے ہیں لیکن اس کے لیے جگہ کا مسئلہ درپیش تھا۔سوچا کہ چھوٹے بچوں کو ہی تو پڑھانا ہے آخر گھر میں کیا حرج ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا، حالت تو یہ ہو چکی تھی کہ کبھی بچوں، ایمن

اور فیصل کے لیے کوئی چیز خرید نے کو دل چاہتا تو پرور دِگار کی تقسیم پر افسوس ہوتا۔

1984 میں ہی بہر حال گھر میں بچوں کو پڑھانا شروع کیا۔ انکم میں چند سو روپے اضافہ ہوا تو احساس ہوا کہ اس محنت سے شاید اب دن پھر جائیں۔ بچوں کی تعداد بڑھتی گئی اور آمدن میں اضافہ ہوتا گیا لیکن اِس سے ایمن اور فیصل نظر انداز ہونے لگے۔

ہم سادہ ہی ایسے تھے ، کی یونہی پذیرائی
جس بار خزاں آئی ، سمجھے کہ بہار آئی (فیض)

1985 بھی تقریباً اِسی بے سروسامانی میں بیت گیا۔ نوکری چھوڑ کر وکالت کے میدان میں اُترنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھر کے چار افراد وکالت چل نکلنے تک کیسے گزارہ کرتے۔ سو فرحت کے تعاون اور محنت کے نتیجہ میں سفید پوشی کا بھرم برقرار رہا اور جیسے تیسے کام چلتا رہا۔ 1985 کے آخری روز بس ہم اِس بات پر ہی خوش تھے کہ جنرل ضیاء کا مسلط کردہ ساڑھے آٹھ سالہ طویل ترین مارشل لاء بالآخر اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ 20 سالوں سے ملک پر نافذ ایمرجنسی ختم کر دی گئی۔ اور اِس خوشی میں 31۔ دسمبر، 1985 منگل کے روز ملک بھر میں عام تعطیل بھی کر دی گئی۔

ایک ایسا انسان جو بمشکل گزر بسر ہی کر سکے، اصولی طور پر اسے سیاست یا ملکی معاملات سے کوئی دلچسپی تو نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن کیا علاج کیا جائے اِس دلِ بے تاب کا کہ اس نے ملک کو ماں ہی سمجھا اور قوم کو حرمت کا نام ہی دیا۔ یہ دل تو سڑکوں پہ ہاتھ پھیلاتے ایک بچے کو دیکھ کر تڑپ جاتا تھا سو پاکستان کا بوجھ کم ہونے سے خوشی تو ہونی تھی۔

پاکستان سے عذاب کا یہ جو جزوی خاتمہ ہوا اس پر دو آراء میرے پاس محفوظ ہیں جو آپ کی نذر ہیں:

''مارشل لاء کے بعد نافذ کی جانے والی جمہوریت عجائباتِ عالم میں شمار کی جا سکتی ہے۔''

............ نوابزادہ نصر اللہ خاں

''وفاقی پارلیمانی نظام اپنی اصل شکل میں بحال نہیں ہو سکا'' ............ ائیر مارشل اصغر خاں

1986 کے آغاز میں زندگی کچھ اِس طرح کی سہاگن نظر آ رہی تھی، جس کی مانگ میں کوئی سندور بھرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ کوئی ایسا ہوتا تو پھر تھا نا۔ جو پہننے کو ملا پہن لیا، جو کھانے کو میسّر ہوا کھا لیا۔ کبھی گھر سے صبح فرحت کچھ دو پہر کے لیے دے دیتی تھی جو لنچ کا کام دیتا اور جس روز اُس کی طبیعت کچھ خراب ہوتی تو لنچ کیا ناشتہ بھی رہ جاتا۔ دفتر میں چائے وغیرہ سے گزارا کر لیتے یا کبھی بھاٹی گیٹ کی مشہور حلیم آ جاتی۔ اُن دِنوں محمد یونس نام کا ایک دانش ور دوست بہت کام آیا۔ وہ خوب صورت شخصیت کا مالک اور مہذّب انسان ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے۔

لاہور اور شیخو پورہ اُن دِنوں مجھے دو شہر نہیں بلکہ چکی کے دو پاٹ لگ رہے تھے، اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں روزانہ ان دونوں کے درمیان پِس رہا ہوں۔ شدید سردی اور شدید گرمی میں سفر جاری رہتا تھا۔ دونوں شہروں کے درمیان اُن دِنوں ٹوٹی پھوٹی بسیں ویگنیں ہی چلتی تھیں۔ مئی جون کے مہینوں میں دوپہر تین بجے جب چرند پرند بھی پناہ کی تلاش میں ہوتے تھے اور لاہوری دوست اپنے گھروں میں گھس جاتے تھے تو میں شیخو پورہ کی ٹرانسپورٹ کا متلاشی ہوتا تھا۔ اگر کوئی بس روانگی کو تیار مل جاتی تو ایسے لگتا جیسے قارون کے خزانوں کی چابیاں مل گئی ہوں۔ بہت پریشانی میں ناصر کاظمی کا یہ مقطع میں اکثر گنگنایا کرتا تھا:

وقت اچھا بھی آئے گا ناصؔر غم نہ کر، زندگی پڑی ہے ابھی

1986 کی ڈائری کے اوراق کبھی اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُن دِنوں پاکستان کے سیاسی حالات سے میری دلچسپی کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ تاہم یہاں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ کہ:

"فیصل جاوید اب کچھ باتیں کرنے لگ گیا ہے۔"

24۔ مئی کے صفحہ پر کچھ اُلٹی سیدھی لکیریں ہیں۔ نیچے لکھا ہے:

"سیمل جاوید تین سال ایک ماہ اور ایک ہفتہ کی ہو گئی ہے لیکن تحریر کی خوب صورتی Pitman کو مات دے رہی ہے۔ درج بالا تحریر اُس کی ہے۔"

اور یہ کہ: "مالی حالت میں بہتری آئی ہے۔"

ڈائریز کے اوراق اپنے عہد کے بہترین عکاس ہوتے ہیں۔ مختلف جگہوں پہ کچھ اِس طرح کے اشعار نظر آ رہے ہیں:

نادم کیے پہ اب مِرے احباب کچھ تو ہیں
آنکھوں میں چاہتوں کے بسے خواب کچھ تو ہیں
شاید پلٹ پڑیں وہ ندامت کے بوجھ سے
اِمکان اِس کا ہے ابھی ، اسباب کچھ تو ہیں
ترکِ وفا سے اب میں تمھیں روکتا نہیں
لیکن جدائیوں کے بھی آداب کچھ تو ہیں

وہ جدا ہو کے سرِ شام کدھر جائے گا
اشک بن کے مِری آنکھوں میں ٹھہر جائے گا
شام کو شام اُتر آئے گی آنگن میں مِرے
کوئی سایہ نہ سرِ بام نظر آئے گا

کوئی پتھر نہیں آویزاں مِرے سینے میں ایک دل ہے سو کسی آس پہ مر جائے گا
آج کرتا ہے جو تجھ سے محبت فرحت دیکھنا ، کل کو یہی شخص مُکر جائے گا

تِرا جمال تو پھوٹے ہے آسمانوں سے بھلا زمیں میں تُو کیسے سما گیا جاناں
نہ جانے کون سے لمحے تُو سامنے آ جائے اِسی امید پہ کاٹا یہ رت جگا جاناں

قلم کو جب سے بنایا ہے تیشۂ فرہاد طریقِ عشق کی پچھلی روایتیں ٹوٹیں
قدم تلے بھی تو سایہ نہ مل سکا پر تو رَہِ حیات میں ایسی تمازتیں ٹوٹیں

عروجِ شوق کا موسم کہاں سے لاؤں میں وہ ایک موج تھی ، دریا میں کھو گئی ہو گی

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تِری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

تاہم سیاست سے دلچسپی پوری طرح بھی ختم نہ ہوئی اور نہ ہی کوئی محبِ وطن شخص مکمّل طور پر بے نیاز ہوسکتا ہے۔9۔اپریل،1986 کے صفحہ پر درج ہے:

''لاہور میں آنسہ بےنظیر بھٹو کے استقبال کی تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ لاہور کے مغربی حصے میں جشن کا سماں ہے۔ وہ ایک طویل لیکن غیر مسلسل جلاوطنی کے بعد صبح 6 بجے لاہور آ رہی ہیں۔ کل 2 بجے مینارِ پاکستان پر ایک جلسۂ عام سے خطاب کریں گی، جب کہ جمیعتِ علمائے پاکستان، تحریکِ استقلال کے تعاون سے موچی گیٹ میں جلسہ کر رہی ہے۔ اُن کا وقت بھی 10۔اپریل، 2 بجے ہی ہے۔''

ڈائری کا یہ ورق بتا رہا ہے کہ پاکستان میں اُن دِنوں سیاسی اُونٹ کس کروٹ بیٹھ رہا تھا۔ شاہ احمد نورانی اور ائیر مارشل اصغر خاں جیسے جہاندیدہ اور دانش ورلوگ غلطیاں کر رہے تھے۔ اُنھیں 10۔اپریل کو لاہور میں جلسہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ مجھے تو ٹھیک سے یاد نہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ آج کا کوئی قاری یہ کہے کہ J.U.P پہلے سے تاریخ مقرر کر چکی تھی۔ اگر ایسا بھی تھا تو پھر بھی جلسہ مؤخر کرنے میں کوئی عار نہ ہونی چاہیے تھی۔

اگلے روز یعنی 10۔اپریل، 1986 کو محترمہ بےنظیر بھٹو کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ اِس طرح کی کوئی مثال پاکستان کی تاریخ میں پہلے سے موجود تھی نہ اس کے بعد دیکھی گئی۔ شام کو اُنھوں نے مینارِ پاکستان گراؤنڈ میں ایک بہت بڑے جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ اس جلسہ اور استقبال پر تبصرہ کرتے ہوئے اُس رات بی۔بی۔سی نے کہا کہ:

''بادشاہی مسجد کے میناروں سے جہاں تک نظر جاتی تھی، انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔''

دوسری طرف موچی دروازہ لاہور میں ہونے والا J.U.P کا جلسہ انسانوں کے سمندر میں ہی کہیں بہہ گیا اور میں سوچتا رہا کہ جن کمزور پہلوؤں کی طرف مجھ جیسے نوجوان طالب علم کی نظر گئی، ہمارے منجھے ہوئے سیاستدان اُنھیں کیوں نہ دیکھ سکے۔

لاہور کے 10۔اپریل کے عظیم الشان جلسہ کے صرف تین روز بعد بےنظیر بھٹو نے شیخوپورہ میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔13۔اپریل کی میری ڈائری کا ورق ہے:

''آج آنسہ بے نظیر بھٹو نے شیخوپورہ میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ جلسۂ عام چوک پیر بہار شاہ میں ہوا۔ خاصا پُر رونق جلسہ تھا۔ بے نظیر صبح 10 بجے کی بجائے شام پونے چھ بجے شیخوپورہ پہنچی۔ بے نظیر کو اِتنا قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع ہے۔ خوب صورت لڑکی ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے۔''

# یہ بیٹی بھی کیا ہوتی ہے

میرے مالی حالات جیسے بھی رہے، 1984 سے 16۔ اپریل کو گھر میں ایک نئے 'تہوار' کا سماں بندھنے لگ گیا۔ 16۔ اپریل بیٹی سیمل جاوید، پھر ایمن جاوید اور اب ایمن عدیل کی سالگرہ کا دن ہے۔ بڑا ہُو کا عالم ہوتا رہا۔ اُس روز سارا خاندان اکٹھا ہو جاتا تھا۔ ساٹھ ستر افراد کے ہجوم میں کیک کاٹا جاتا۔ گھر کو سجایا جاتا، تالیوں کی گونج اُٹھتی تو کچھ دیر کے لیے غمِ دُنیا، غمِ روزگار اور غمِ یار پرائے ہو جاتے۔ 1986 میں سیمل کی تیسری سالگرہ کی تقریب ایک جشن کی شکل اختیار کر گئی۔ نجانے کیسے، مہمانوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔ سہ پہر کے وقت رنگ برنگ جھنڈیوں اور خوب صورت غباروں کے درمیان بچوں کی بھاگ دوڑ لبھا رہی تھی۔ ٹیپ ریکارڈر پر سالگرہ کے گیت بلند آواز میں چل رہے تھے اور خاندان بھر کے بچّے اُچھل کُود میں مصروف تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے آسماں سے فرشتوں کا نزول ہو رہا ہو۔ آج پیرانہ سالی میں وہ منظر یاد آتا ہے تو سوچنے لگتا ہوں کہ بیٹی بھی 'کیا' ہوتی ہے اور 'کیوں' ہوتی ہے؟ انسان اِس 'کیا' اور 'کیوں' پہ کب تک سوچے؟ سوچ تو تھک جائے گی۔ سوالیہ نشان نہیں مِٹے گا............ اب تک تو نہیں مِٹا۔

انسان اپنی آرزوؤں کا خون کر کے کچھ پس انداز کرنا چاہتا ہے۔ اس ضابطے کو بھی کچل دیتا ہے کہ اِمروز ہی اہم ہے۔ ہر لمحہ مضطرب رہتا ہے بلکہ اضطراب کو خود ہی مہمیز کرتا رہتا ہے۔ تین سال کی بیٹی کو 20/25 کی دیکھتا ہے۔ ناگہانی آفات سے ڈرتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ انسان، انسان سے ڈرتا

ہے۔ اِس لیے کہ انسان فضاؤں کا سینہ چیرنے میں مصروف ہے۔ یہ گہرے سمندروں میں آبی مخلوق کی طرح زندہ رہ کر فخر محسوس کرتا ہے لیکن شومیٔ قسمت کہ یہ زمین پر سیدھا چلنا بھولتا جا رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ دو نکتوں کے درمیان مختصر ترین راستہ سیدھا راستہ ہی ہوتا ہے پھر بھی یہ زِگ زیگ (Zigzag) بنا کر مسرّت وحظ حاصل کرتا ہے، کیا کیا جائے!

میں بیٹی کی بات کر رہا تھا۔ بیٹی ہر گھر میں ہے۔ ہر گھر ہی پریشان ہے۔ کیا اِس معاشرے کی سربراہی کسی بھیڑیئے، کُتے، سور یا سانپ کے پاس ہے جہاں بیٹی کو جانا ہوتا ہے۔ آدم زاد ہی تو سوسائٹی کا میکر (Maker) ہے، پھر بھی خوف کے خوفناک سائے! ایں چہ معنی دارد؟ ........... جواب گُم است۔ نہ بیٹی اگلے گھر میں بیٹی بن کر رہنے کے لیے تیار ہے اور نہ گھر اسے بیٹی بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ ہم بیٹی کے لیے تو عدلِ فاروقی کے طالب ہیں، بہو کے لیے جہلِ عرب کے متلاشی۔ یہ کیا ہوا؟

ہم پائی پائی اکٹھی کر کے بیٹی کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ پھر جو کمی رہ جاتی ہے، وہ دوستوں سے قرض لے کر پوری کرتے ہیں۔ قرضِ حسنہ نہیں ملتا تو کسی سود خور سے 'سود و زیاں' کے چکر شروع کر دیتے ہیں۔ جب سب کچھ جمع ہو جاتا ہے تو اچانک کوئی ڈاکو، اِن (in) ہوتا ہے۔ یہ ڈاکو اگر لغت کا ڈاکو ہو تو انسان صدمہ بھول جاتا ہے اور اگر یہ کسی دوسرے روپ میں ہو تو بندہ روز مرتا ہے، روز جیتا ہے۔ بلکہ ہر روز کئی بار جیتا ہے اور کئی بار مرتا ہے۔

# ٹریڈ یونین

میں جن ایّام میں کسی بہتر ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، واپڈا نے میری ٹرانسفر ریجنل آفس میں کر دی۔ یہ دفتر اُن دِنوں ایریا الیکٹریسٹی بورڈ لاہور کہلاتا تھا اور پرانی انارکلی کے گنجان آباد علاقہ میں واقع تھا۔ جس سیٹ پر مجھے تعینات کیا گیا وہ مالی فوائد کی حامل تو تھی ہی لیکن زمانے بھر کی رُسوائی بھی اُسی کے اندر سموئی ہوئی تھی۔ میں نے میاں افتخار احمد ڈپٹی ڈائریکٹر (ایڈمن) سے بات کی لیکن آرڈر پر عمل درآمد رُکوانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 23۔دسمبر، 1986 کو جائننگ (joining) ہو گئی۔

ہم سمجھے تھے صیّاد کا ترکش ہوا خالی
باقی تھا مگر اِس میں ابھی تیرِ قضا اور (فیض)

میاں افتخار احمد انتہائی نیک سیرت انسان ہیں۔ اُن کی دلچسپی مجھے وہاں پھنسانے میں نہیں تھی بلکہ میرے پیش رو کو وہاں سے نکالنے میں تھی، لہٰذا اُنھوں نے میرے ساتھ بھر پور تعاون کیا۔ ایک پیار کرنے والی اور مہذّب شخصیت آغا محمد نصراللہ خاں مرحوم کی تھی۔ آغا صاحب کی تعلیم صرف میٹرک تھی اور وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم رہ چکے تھے۔ میٹرک تعلیم کے باوجود اُنھیں انگلش ڈرافٹنگ میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔

اِس سیٹ پر تہذیب و تمدّن کے نکتۂ کمال کے باوجود، اور حلال خوری کی کوشش کے باوجود جیب میں اِتنے پیسے آجاتے تھے کہ مالی مسائل ختم ہو گئے۔ انسان کا پیٹ تو قبر کی مٹی ہی بھرتی ہے لیکن کم از کم یہ ضرور ہوا کہ میں سڑکوں پر جھنڈیوں کے اسٹال اور شام کو ٹیوشن سنٹر چلانے کی اذیت سے بچ گیا، بلکہ اس کے لیے وقت ہی نہ بچا۔ غمِ یار تیرا شکریہ .................. وہ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ ڈیل کارنیگی سے پوچھا گیا:

''کبھی آپ پریشان ہوتے ہیں؟''

جواب ملا: ''میرے پاس پریشان ہونے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔''

شیخوپورہ سے کھانا اُٹھا کر لے جانے کی ضرورت ختم ہو گئی۔ دوپہر کو اکثر و بیشتر پرانی انارکلی کے عبدالرّحمٰن ہوٹل سے کھانا کھاتے۔ واپسی پر چوک سے 'بابا جلیبی والا' سے جلیبیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ چھٹی کے وقت یوسف فالودہ شاپ سے فالودہ خوری (یا شاید فالودہ نوشی) بھی مرغوب مشغلہ بن گیا۔ جس دن جیب میں پیسے وافر ہوتے تھے، چند قدم آگے بڑھ کر غلام رسول کے مرغ چنے بھی ترجیحات میں شامل ہوتے۔

نیلا گنبد انارکلی کا غلام رسول چنے والا اور پرانی انارکلی کا عبدالرّحمٰن ہوٹل کسی لاہوری سے نا آشنائی نہیں رکھتے۔ وہاں میرے نانا اور ماموں، اور دادا اور والد کھانا کھاتے رہے ہیں۔ عبدالرّحمٰن ہوٹل

تو اب ماہ وسال کی بھینٹ چڑھ چکا ہے لیکن غلام رسول چنے والا پوری آب وتاب کے ساتھ نیلا گنبد میں سائیکل مارکیٹ کے بالمقابل سارا دن دونوں ہاتھوں سے نوٹ اکٹھے کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ ابھی کچھ دیر قبل تک ہم دوست کہا کرتے تھے کہ یہاں دس روپے کا ایک چنا بکتا ہے۔

ریجنل ہیڈکوارٹر میں پوسٹنگ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ واصف صاحب اور ساغر صدیقی کے ساتھ جُڑی یادیں تازہ ہوتی رہیں۔ اور ہاں مجھے یاد آیا اِسی علاقہ میں لاہور کا ایک اور تحفہ بھی ہوا کرتا تھا۔ اے جی آفس چوک سے دو سڑکیں مال روڈ کی طرف جاتی ہیں۔ دونوں ہی کی لمبائی کوئی دو سو گز ہے۔ ایک ہائی کورٹ چوک کی طرف اور دوسری نیلا گنبد کی طرف جاتی ہے۔ نیلا گنبد کی طرف جانے والی سڑک میکلیگن روڈ کہلاتی ہے۔ اس کے عین وسط میں سڑک کے مغربی جانب ایک بہت بڑا درخت ہوتا تھا جس کے نیچے گرمیوں میں ایک 70/75 سالہ بزرگ فالودہ بیچا کرتا تھا۔ اُس کی ریڑھی کے اِرد گرد صبح سے شام تک ہر وقت چالیس پچاس سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں کھڑی رہتی تھیں اور لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ وہ پیالی میں صرف قلفہ ڈال کر دیتا تھا اور فالودہ سویّاں لوگ اپنی مرضی سے جتنی چاہتے ڈال لیتے تھے۔ بابا جی پیالیوں میں قلفہ ڈالتے جاتے اور با آوازِ بلند کہتے رہتے: ’’کھالو، کھالو۔ تھوڑا ہی چِر رہ گیا اے۔ ایہنے میرے نال ای ٹُر جانا جے۔‘‘ اِس پوسٹنگ کے دوران بابا جی فالودے والے کہیں نظر نہ آئے جو ستر کی دہائی کے اواخر تک وارننگ دے دے کر کہا کرتے تھے کہ اِس فالودے کو میں نے ساتھ ہی لے جانا ہے۔

پرانی انارکلی کے کھانوں کے حوالے سے ایک اور بات یاد آئی۔ عزیزی ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی کتاب ’خاکہ مستی‘ کی تقریبِ پذیرائی میں جن لوگوں کو دعوت دی گئی اُن میں نامور مصوّر اسلم کمال بھی شامل تھے۔ کھانوں کا ذکر چل نکلا تو میں نے اُن سے کہا کہ زندگی تو میں نے بھی لاہور ہی میں گزاری ہے لیکن چلیے آپ بتائیے کہ لاہور میں سب سے لذیذ کھانا کون بناتا ہے؟ اُن کا برجستہ جواب تھا: ’’عبدالرّحمٰن پرانی انارکلی والا۔‘‘

ریجنل ہیڈکوارٹر کی پوسٹنگ میں یوں بھی ہوتا رہا کہ صبح آٹھ بجے دفتر میں بیٹھنا ہوا اور رات آٹھ بجے

پوری جدوجہد کر کے فائلز کے انبار سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔تین گھنٹے کی روزانہ مسافت اپنی جگہ، لیکن عہدِ جوانی میں انسان یہ سب کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی رکھتا ہے اور صلاحیت بھی۔میں نے دل و جاں سے محنت کی، اور اتنی محنت کی کہ میرے سینئر حیران رہ گئے۔ایک عجیب معاملہ وہاں یہ بھی ہوا کہ مجھے اپنے رُفقائے کار سے بہت پیار ملا، جس کے لیے میں نے کوئی شعوری کوشش ہرگز نہ کی اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت تھی۔

واپڈا کی سی۔بی۔اے یونین کا یہ طریق کار تھا، اور شاید اب بھی ہے، کہ یہ ہر طاق سال میں اپنے اندرونی انتخابات کرواتی ہے۔ ہر ریجن میں ایک مکمل با اختیار یونین ہوتی تھی جو پاکستان واپڈا ہائیڈرو الیکٹرک سنٹرل یونین نسبت روڈ لاہور کی چھتری تلے اپنی سرگرمیاں جاری رکھتی تھی۔1986 میں لاہور میں اِس طرز کی کوئی تنظیم نہ تھی اور شاید مرکزی یونین اس کی ضرورت اِس لیے محسوس نہ کرتی تھی کہ مرکزی یونین کے دفتر، ہیڈ کوارٹر (واپڈا ہاؤس) اور ریجنل ہیڈ کوارٹر یعنی ایریا الیکٹریسٹی بورڈ واپڈا کے درمیان صرف 2/3 کلومیٹر کا ہی فاصلہ تھا۔

1987 میں میری کارکردگی، میرا طریقِ کار، رُفقائے کار کے ساتھ میرا رویّہ اور میری شبانہ روز محنت بے حد پسند کی جارہی تھی۔یہ طاق سال تھا اور سنٹرل یونین تنظیم سازی میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھی۔اُن ایّام میں مرکزی یونین کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل آغا بدرالاسلام ابدالی میرے پاس تشریف لائے اور بڑی رازداری سے پوچھنے لگے کہ کیا مجھے معلوم ہے کہ میری اِس پوسٹنگ کے محرکات کیا ہیں؟ میرے 'نہیں' کے جواب پر کہنے لگے کہ چلیے کوئی بات نہیں۔اُنھوں نے بات آگے بڑھائی اور کہا کہ ''اب آپ کو ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ہمیں آپ جیسے تعلیم یافتہ اور جرأت مند نوجوانوں کی شدید ضرورت ہے۔الحمدُ للہ، آپ کے کام پر آپ کی گرفت مضبوط ہوچکی ہے ............ مَیں لمبی بات نہیں کرتا۔ہمیں کسی رائے شماری کی بھی ضرورت نہ ہے .................. مَیں خان صاحب (بشیر احمد خاں بختیار مرکزی صدر) سے نوٹیفیکیشن جاری کروا دیتا ہوں۔بس آپ ہاں کرنے والے بنیں۔''

میں نے بشیر احمد بختیار مرحوم کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔بحیثیت ٹریڈ یونینسٹ اور

بحیثیت کارکن تحریکِ پاکستان اُن کی شخصیت سے متأثر تھا۔ مرکزی سیکرٹری جنرل خورشید احمد تو بین الاقوامی شہرت کے ٹریڈ یونینسٹ تھے، اُنھیں بھی کافی حد تک جانتا تھا۔ من میں بات آئی کہ یہ لوگ کبھی بھی مجھے غلط درس نہیں دیں گے اور یوں میں نے ابدالی مرحوم کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر:

عاجزی سیکھی ، غریبوں کی حمایت سیکھی　　یاس و حرمان کے، دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا　　سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے
(فیض)

جن دنوں یونین سازی کا کام مکمل ہوا اور یونین کے ہیڈ کوارٹر سے نوٹیفکیشن جاری ہوا، اُن دِنوں ایریا الیکٹریسٹی بورڈ کے چیئرمین ایک سخت گیر انسان تھے۔ اُن کی بابت یہ رائے بنی ہوئی تھی کہ اُن کے لیے زبان اور قلم کو قابو میں رکھنا کوئی امرِ لازم نہ ہے۔ لٰہذا مجھے اُن کے پرسنل اسسٹنٹ الحاج بشیر احمد رندھاوا نے نہایت شفیقانہ انداز میں کہا کہ یونین تو بن گئی ہے، اب میں اِس بات پر اصرار نہ کروں کہ نوٹیفکیشن کی کاپی چیئرمین صاحب کی ڈاک میں رکھنی چاہیے۔ اُنھوں نے مجھے بہت قائل کرنے کی کوشش کی لیکن میرا ایک ہی جواب تھا کہ میں نے کوئی غیر قانونی اور غیر آئینی کام نہ کیا ہے لٰہذا اِس پہ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ضد پر یونین سازی کا لیٹر چیئرمین صاحب کو پیش کر دیا گیا اور تنظیم سازی کا عمل مکمل ہو گیا۔ چیئرمین صاحب نے اسے معمول کی ایک یاداشت کے طور پر ہی لیا اور اُن کے بارے لوگوں کی رائے غلط ثابت ہو گئی۔

# واپڈا کے امراضِ قلب کے مریض

1988 کے پہلے چھ ماہ ہی آرام سے گزرے ہوں گے کہ تقدیر کو اپنی بھول کا احساس ہوا۔ یہ اصغر علی جاوید اب سکون سے ہے، تو کیوں؟ فرحت (میری بیوی) جو مدت سے M.V.D (دل کے والو کا مرض) کا شکار تھی، کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ وہ پہلے ہی ڈاکٹر زبیر صاحب کے زیرِ علاج تھی۔ اُن سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ اب والو کی تبدیلی کے سِوا کوئی چارہ کارگر ثابت نہیں ہو گا۔ لاہور میں اُن دِنوں امراضِ قلب کا سِرے سے کوئی ہسپتال ہی نہ تھا لٰہذا مریضوں کے سامنے دو راستے ہوتے تھے۔ پہلا نیشنل

انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیووسکولرڈیزیز (NICVD) کراچی اور دوسرا آرمڈ فورسز انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی (AFIC) راولپنڈی۔

واپڈا کا اُن دِنوں NICVD کراچی سے معاہدہ تھا۔ لہٰذا جب میں نے اربابِ اختیار کے آگے دستِ سوال دراز کیا تو اُنھوں نے فوراً کراچی جانے کا مشورہ دیا۔ کراچی تو میرے بڑوں نے بھی نہ دیکھا تھا۔ اب دل کی ایسی مریضہ جس کے لیے ایک قدم چلنا بھی محال ہو، اُسے لے کر اِتنا سفر کرنا تو مجھے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ میں نے واپڈا ہاؤس میں متعلقہ ڈائریکٹر صاحب سے عرض کی کہ سر! کراچی تو میں نہیں جا سکتا۔ اُنھوں نے خوب صورت انگریزی میں جواب دیا کہ ''نہ جاؤ، میرے لیے تو نہیں جانا تم نے۔'' میں نے پھر عرض گزاری کہ اگر آپ مجھے AFIC راولپنڈی ریفر کر دیں تو میرے دُکھوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ "You are wasting my time." اُنھوں نے جواب دیا۔

میں نے بڑے ہی حوصلے سے انگریزی کے لیے مشہور اس ڈائریکٹر کی بدتمیزی برداشت کی اور باہر آ کر چیئرمین واپڈا کے نام ایک درخواست تحریر کی۔ اُسی وقت چیئرمین کے سیکرٹری سے ملا اور ضروری دستاویزات کی نقول کے ساتھ درخواست چیئرمین آفس میں پیش کر دی۔ جنرل زاہد علی اکبر چیئرمین دفتر میں موجود نہ تھے لیکن طریقِ کار کے مطابق شام کو ڈاک اُن کے گھر بھیج دی گئی۔ اگلے روز 11 بجے جب میں اپنی عرض داشت پر چیئرمین صاحب کے حکم کے بارے جاننے کے لیے واپڈا ہاؤس پہنچا تو پتہ چلا کہ اُنھوں نے میری بات سے اتفاق کر لیا ہے اور اب واپڈا کے جراحتِ قلب کے کیس AFIC راولپنڈی بھیجے جائیں گے۔

جنرل اکبر کی اِس مہربانی کے بعد فرحت کو AFIC پہنچانے کی ذمہ داری میرے کزن اور مہربان دوست طارق نوید نے قبول کی۔ واپس آئے تو اُن کے ہاتھ میں -/85000 روپے کا ڈیمانڈ نوٹس اور 30۔ اکتوبر، 1988ء کی سرجری کی تاریخ کی پرچی موجود تھی۔ بفضلِ تعالیٰ واپڈا نے ادائیگی کر دی اور ہم چیک لے کر AFIC پہنچ گئے۔ طارق اور بھابھی (بیگم ڈاکٹر شوکت علی) کمال مہربانی کرتے ہوئے

ہمارے ساتھ رہے۔

ہر میاں بیوی کی طرح مجھے اور فرحت کو بھی ایک دوسرے سے شکوے رہے لیکن کوئی 'گِلہ' ہے اور اللہ کی کس نعمت کی کتنی اہمیت ہے اس کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب وہ چھین لی جاتی ہے یا چھن جانے کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ پھر ہی پتہ چلتا ہے کہ مالک و خالقِ کائنات نے یونہی بندے کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے نہیں کہہ دیا کہ ''تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟'' اللہ نے اپنی جنت میں موجود تمام نعمتوں میں اچھی خوب صورت عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ عورتیں نیچی نگاہ والی ہیں اور اُن میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ جب وہ بندگانِ خدا کو عطا کی جائیں گی تو اُس وقت تک اُنھیں کسی نے چُھوا تک نہیں ہوگا۔ طے ہوا کہ عورت ایک نعمت ہے۔ رہی بات یہ کہ عورت زبان درازی یا چھوٹی موٹی غلطیاں کرتی ہے تو اِس پر بھی محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی پالیسی جاری فرما دی تھی۔ پوچھا گیا کہ عورت کو ایک دن میں کتنی بار معاف کر دیا جائے؟

جواب ملا: ''ستر بار۔''

اور اس ستر بار سے مراد بھی حسابی عدد 70 نہیں ہے بلکہ یہ اس کا محاوراتی استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے ناقابلِ شمار۔

اکتوبر، 1988 میں مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے MVR کا یہ کیس مجھے زندگی بھر کی تنہائی کا عذاب دے جائے گا۔ اللہ کی بنائی اور اسمبل کی ہوئی ایک چیز ہے Mitral Valve۔ اب اسے کوڑے میں پھینک کر آدمی کا بنا ہوا والو لگایا جائے گا۔ فہمِ مخلوق کو دانشِ خالق سے کیا نسبت؟ وہ تو لکھے کو بھی مٹانے پر قادر ہے۔ وہ بگڑی کو سنوارنا چاہے گا تو اُسے روکنے والا کون ہے اور قسمت میں یہ ہے کہ سیمل اور فیصل کو مجھے ہی اپنے کاندھوں پہ اُٹھائے رکھنا ہے تو پھر اُس کے سوا کون ہے جو لکھے کو بدل دے۔ لہٰذا سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دیا۔

دی گئی تاریخ پر بوجوہ سرجری نہ ہو سکی۔ اِس پریشانی میں جب میں اور برادرِ عزیز طارق نوید AFIC کے سینئر کارڈیک سرجن بریگیڈیئر ایم۔ آر۔ کیانی کو اُن کے کلینک پر ملے تو دو فائدے حاصل ہوئے۔

پہلا یہ کہ تاخیر کی وجہ معلوم ہوگئی اور دوسرا یہ کہ ایک انتہائی نیک اور ہمدرد انسان سے شرفِ ملاقات حاصل ہو گیا۔ ایک دو روز کی تاخیر سے فرحت کو آپریشن کے لیے بلایا گیا تو یہ وہ دن تھا جب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ذکرِ الٰہی کسے کہتے ہیں اور اللہ نے کیوں کہا ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اُس کی حمد و ثنا بیان کرو۔'' اللہ کا نہ تو اِس میں کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی اُسے اس کی حاجت۔ وہ بے نیاز ہے اور مکمّل بے نیاز، ہر چیز سے بے نیاز۔ پھر کیوں کہا ہے کہ مجھے کثرت سے یاد کرو۔ حیرت ہے ایک بار نہیں بلکہ کم و بیش ایک سو بار کہا ہے۔ پروردِگار کے ذکر کے کیا مفاہیم ہیں اور اُس نے کیوں کہا کہ مجھے پکارو، اُس روز سے پہلے تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' طارق نے یک دم خاموشی توڑی۔

''کچھ نہیں تو''

''یار! اللہ پہ بھروسہ کرو، وہ بہتر کرے گا۔''

گویا اللہ کے سِوا بھی کسی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ میں پھر سوچنے لگا۔

جواب ندارد۔

''ڈاکٹر کیانی صاحب آپریشن تھیٹر میں پہنچ گئے ہیں'' نجانے طارق کو کیسے پتہ چلا۔ ''اگلے چند منٹ میں فرحت کو بلایا جا سکتا ہے .................. چلو مل کر آئیں۔'' طارق نے میرا لرزتا ہوا ہاتھ تھاما اور مجھے کھینچ کر آپریشن تھیٹر میں لے گیا۔ فرحت ایک خاص گاؤن میں لپٹی ایک بیڈ پر پڑی تھی اور ایک سڑیل سی نرس اُسے ٹیکہ لگا رہی تھی۔ فرحت کا جسم کانپ رہا تھا اور کلمہ طیبہ کے ورد کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ ملحقہ کمرے سے اچانک کیانی صاحب وارد ہوئے۔

''فرحت! کیا ہو رہا ہے آپ کو؟'' سرجن کے لہجے میں محبت کی بلا کی چاشنی تھی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا اِن شاءاللہ ........... پریشان نہیں ہونا۔'' فرحت تھوڑا سا مسکرائی لیکن زبان پہ کلمہ طیبہ جاری رہا۔ اب اُس کے ورد کی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔

مہربان سرجن نے نرس سے کوئی سوال کیا۔ نرس کا جواب تھا ''Yes sir'' ''اب ہمیں باہر چلے

جانے کی ہدایت کی گئی۔ میں نے فرحت کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ خاموشی کی زبان سے کہہ رہی تھی ’’اللہ حافظ، تمھارا بھی، میرا بھی‘‘ .................. پھر اُس کے لب تھوڑے سے ہلے ۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ کہہ رہی ہو کہ فیصل اور سیمل کا خیال رکھنا۔ بفضلِ تعالیٰ کامیاب سرجری کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں منتقل ہوئی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ Pre Operation Room میں تم نے میرے ساتھ آخری بات کیا کی تھی؟ جواب ملا کہ ’’میں نے کہا تھا کہ میرے بعد میری بیٹی سیمل اور بیٹے فیصل کا خیال رکھنا۔‘‘

میں نے باہر آ کر درود شریف اور استغفار کا وِرد شروع کر دیا۔ جو کیفیت کچھ دیر پہلے فرحت کی تھی، وہ اب میری تھی۔ اللہ سے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ کئی باریوں ہوا کہ پتہ ہی نہ چلا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ اچانک یاد آتا کہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ طارق دائیں بائیں گھومتا رہا۔ مجھے پانی، چائے اور جوس کا بار بار پوچھتا رہا۔ اُس روز اگر بیوی کی قدر و قیمت کا احساس ہوا تو دوست جیسی نعمت کی اہمیت کا بھی پتہ چل گیا۔

موت کا سفر اور سفر کی موت .................. کون نہیں پناہ مانگے گا ............ میں بھی خوف زدہ تھا ............ مخلوق اپنے خالق کے رازوں کو کب جان سکی ہے! وہ محبوب سے لمبی خندق کھدواتا ہے اور پھر عکرمہ سے خندق پار کروا کے یہ بتاتا ہے کہ کوشش فرض ضرور ہے لیکن اصل ہتھیار توکّل ہی ہے۔ پھر خندق کھودنے والوں کے کلیجے مُنہ کو آ جاتے ہیں ............ حوصلے جواب دے جاتے ہیں۔ ایک نیا عمل شروع ہوتا ہے .................. امرِ الٰہی ہوتا ہے ............ کُن کا ڈنکا بجتا ہے اور اللہ اپنے بندوں کو بحرِ تشکیک میں غرق ہونے سے بچا لیتا ہے .................. تیز آندھی آتی ہے .................. خندق کے اُس پار ہر چیز فنا اور خندق کے اِس پار بقا ہی بقا .................. کُن کا کام، ’کام کرنا‘ تھا ............ بس کام مکمّل ہوا۔

’’اے اللہ! کہہ دے کُن ............ میں بھی تو تیرا بندہ ہوں نا!

کہہ دے نا میرے اللہ! .................. اس کا کہنا تجھے ہی زیب دیتا ہے میرے اللہ! .................. جو

حق تیرا ہے، بس تیرا ہے .................. کس کی مجال ہے دَم مارے!'' درود اور استغفار کے دوران معلوم نہیں میں نے کیا بولنا اور کیا سوچنا شروع کر دیا .................. تقریباً پانچ گھنٹے بیت گئے .................. طارق میرے سر پہ کھڑا تھا۔

''مبارک ہو بھئی!''

''کس بات کی ........... کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''فرحت کو آپریشن تھیٹر سے C.C.U منتقل کر دیا گیا ہے .................. میں نے کوریڈور میں اُس کا چہرہ دیکھ لیا ہے .................. یقیناً وہی تھی۔''

''اچھا؟ .................. آپریشن کامیاب ہو گیا؟؟'' میں نے بے تابی سے جاننے کی کوشش کی۔

اَلحمدُ لِلّٰہ ................ ثُمَّ الحمدُ للہ۔

ظہر کا وقت ہونے کو تھا۔ میں اور طارق مسجد کی طرف چل دیے.................. مسجد میں بیٹھے ہر چیز سہانی، خوب صورت اور مہربان نظر آ رہی تھی ........... اللہ جو مہربان تھا۔

16۔نومبر، 1988 کے پاکستان کے عام انتخابات، جن کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو مسلم دُنیا کی پہلی خاتون وزیرِ اعظم بن کر سامنے آئیں، کی خبریں میں، طارق اور میجر لیاقت AFIC کے آفیسرز وارڈ میں ہی سُنتے دیکھتے رہے۔

**حقائق ، حقائق ہیں:** اوائل 1988 میں خان عبدالولی خاں کی کتاب 'Facts Are Facts' میرے مطالعہ میں آئی ۔ مجھے اِس کتاب کے مطالعہ سے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ یہ 'Untold Story' تو تھی لیکن جب اِسے سونا تولنے والے ترازو پہ تولا تو پتہ چلا کہ یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔'Facts are Facts' خان صاحب مرحوم کا حق تھا اور اس پر ردِّعمل ہر پاکستانی بلکہ ہر قاری کا حق تھا۔ لہٰذا میں نے اس پر اپنا ردِّعمل قلم بند کیا اور روزنامہ 'نوائے وقت' کے حوالے کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اخبار چونکہ نظریۂ پاکستان، دوقومی نظریہ اور عظمتِ قائدِ اعظم کی علم برداری کا دعویدار ہے لہٰذا یہ اسے بخوشی شائع کر دے گا، لیکن نوائے وقت نے بوجوہ اسے شائع کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ اُن دِنوں

لاہور میں 'نوائے وقت' اور 'مشرق' ہی ہوتے تھے لہٰذا میں نے وہ مسوّدہ روزنامہ 'مشرق' کو بھیج دیا۔ اس مضمون کی پہلی قسط اتوار 4۔ستمبر، 1988 کو 'مشرق سپیشل' میں ''تخلیقِ پاکستان ایک فطری عمل تھا ...... 'حقائق، حقائق ہیں' کا تجزیہ'' کے عنوان سے شائع ہوگئی۔ دوستوں کی طرف سے بھرپور پذیرائی حاصل ہوئی اور عام قارئین کی طرف سے اظہارِ پسندیدگی کی خبر 'مشرق' کے دفتر سے مل گئی۔

مضمون کا دوسرا حصہ 18۔ستمبر کو 'صوبہ سرحد کے ریفرنڈم پر چالیس سال بعد اعتراضات کیوں؟' کے عنوان سے شائع ہوا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ یہ کسی روزنامہ میں میرا پہلا سیاسی مضمون تھا۔ والد صاحب اور بڑے بھائی ڈاکٹر شوکت علی کی طرف سے شاباش ملی۔ یونین ہیڈکوارٹر سے دادو تحسین کے جذبات مجھ تک پہنچے تو میں نے خود کو ایک نیا اصغر علی جاوید محسوس کیا .................. طاقت ور کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے والا اصغر علی جاوید .................. ایک ایسا زیردست جو زبردست کو بے لگام ہونے سے روک سکے۔ یوں پاکستان کے سب سے بڑے ادارے کا اُبھرتا ہوا تعلیم یافتہ ٹریڈ یونینسٹ حالاتِ حاضرہ کے نبّاض اور کالم نگار کی حیثیت سے بھی پہچانا جانے لگا۔ اِس صورتِ حال نے بہت سارے حاسدین بھی پیدا کر دیے۔

**میجر ثاقب اور 'شیطانی آیات':** دفتر میں ذمہ داریوں کے بوجھ کے باوجود میں نے اخبار کے لیے مضامین اور کالم کا سلسلہ بند نہ ہونے دیا جو کئی وقفوں کے ساتھ تادمِ تحریر جاری ہے۔ چار عشروں پر محیط اِس سرگرمی نے مجھے کوئی فائدہ نہیں دیا، کسی بھی طرح کا۔ میں اگر اِسے باقاعدگی سے اپنائے رکھتا تو شاید کالم نگار کی حیثیت سے پہچان بھی ہوتی لیکن میں ایسا کر نہ سکا یا شاید مجھ میں اِس کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پھر میری پہچان سیرت نگار کی حیثیت سے نہ بنتی۔

1989 کی ابتداء میں ایریا الیکٹریسٹی بورڈ لاہور میں اللہ تعالیٰ نے مجھے میری حیثیت سے زیادہ نوازا ہوا تھا۔ حاسدین کی تعداد میں اضافہ تو ایک لازمی امر تھا، دوست بھی بہت اچھے اچھے نصیب ہوئے۔ میجر عبدالرّحیم ثاقب، ایم۔آر۔عباسی، پرویز احمد اور ڈاکٹر جاوید اقبال جیسے دانش ور لوگوں سے آشنائی اسی دور میں ہوئی۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے میرے یا میجر ثاقب کے کمرہ میں چائے پیا کرتے تھے۔

وہاں کچھ دیر حالاتِ حاضرہ پر گفتگو بھی ہو جاتی اور اگر میں نے کوئی نیا افسانہ لکھا ہوتا تو وہ بھی وہیں پڑھا جاتا ۔ مجھے اُس دور کے میجر ثاقب کے یہ جملے بہت یاد آتے ہیں ۔

''نزول ہو رہا ہے تم پر نزول .......... سمیٹ لو .......... سنبھال لو .......... یہ سلسلہ ہمیشہ نہیں رہنا۔''

''تمھیں معلوم ہی نہیں ہے تم کیا ہو .......... اپنی ذات کو دیکھو .......... جانو .......... سمجھو۔'' مجھے یاد ہے میں نے جب اپنا افسانہ ''بسنت کور، خدا حافظ'' پڑھا تو میجر ثاقب نے کہا تھا کہ ہاتھ آگے کرو، اِنھیں چومنا ہے۔ میں میز کے دوسری طرف سے اپنی کرسی سے اُٹھا اور اُسے گلے لگا لیا۔

یہ ثاقب بھی کمال کا آدمی تھا۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر ماں کا بیٹا، گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے اُردو اور پھر گولڈ میڈلسٹ۔ آرمی میں گیا لیکن بھاگ آیا، ورنہ جنرل ضرور بنتا۔ بڑا پیار کرنے والا انسان تھا۔ اُس نے ایک روز ملعون سلمان رُشدی کی رُسوائے زمانہ کتاب 'شیطانی آیات' (The Satanic Verses) کا ذکر کیا۔

''یار! وہ پڑھی ہے تم نے، یا دیکھی ہے کہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں تو.......... سُنا ہے کوئی بے ہودہ سا ناول ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ڈھونڈو پھر کہیں سے اُسے .......... اور پڑھو اُسے .......... تم ضرور پڑھو اُسے۔''

''مروا نہ دینا کہیں ، پاکستان میں پابندی ہے اُس پر۔'' میں نے میجر ثاقب کے سامنے "The Satanic Verses" کے مطالعہ پر آمادگی ظاہر نہ کی لیکن اُس کی تلاش ضرور شروع کر دی۔

پھر یوں ہوا کہ چند روز بعد میرے دفتر میں میرے ایک رفیقِ کار کے ساتھ ایک صاحب تشریف لائے جن کے ہاتھ میں ایک کتاب بھی تھی۔ اُنھوں نے کہا کہ ''مَیں ناصر رانا ہوں .......... پروڈیوسر ریڈیو پاکستان لاہور .......... اور یہ رہی "The Satanic Verses" ''

.......... یوں مَیں 'شیطانی آیات' کے حصول میں کامیاب ہو گیا۔

ناصر رانا سے میری دوسری ملاقات 29 سال بعد 2018 میں میرے گھر میں ہوئی۔ نوجوان

ناصر رانا اب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے اور پرنسپل گورنمنٹ کالج شرق پور کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

'اسٹانک ورسز' کے مطالعہ کے بعد مَیں سوچتا رہا کہ جس قوم کا 'ادب' ایسا ہے اُن کی 'بے ادبی' کیسی ہوگی۔ بہرحال قلم تھام لیا اور 'اسٹانک ورسز' کے مرکزی خیال 'آقائے دوجہاں اور کثرتِ ازواج' پر لکھنا شروع کیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں میرے مضامین اُن دِنوں روزنامہ 'مشرق' میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ لہٰذا اپریل 1982 کے دوسرے عشرہ میں چند مضامین بعنوان 'دہر میں اِسمِ محمدؐ سے اُجالا کردے'، 'مشرق کے حوالے کر دیے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جس روز ایڈیٹوریل انچارج نے یہ کہا کہ ''پالیسی اجازت نہیں دیتی''۔ 'نوائے وقت' سے تو مجھے پہلے ہی کوئی اُمید نہ تھی۔ اُن دِنوں پروفیسر عبدالجبار شاکر ڈائریکٹر لائبریریز پنجاب کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ مَیں نے اپنی بےبسی کا ذکر شاکر صاحب سے کیا تو کہنے لگے کہ مضامین کا مسوّدہ مجھے دِکھاؤ۔ میں نے مضامین اُن کے حوالے کیے تو چند روز بعد اُنھوں نے دیباچہ کے ساتھ مضامین مجھے واپس کیے اور کہنے لگے کہ انھیں کتابی شکل میں مارکیٹ میں لانا ہے، لہٰذا کتابت شروع کروا دو۔ شاکر صاحب نے شاید سوچا ہی نہ ہو کہ اس کے پاس پیسے کہاں سے آئیں گے۔

پھر میں نے اس کتاب کا مسوّدہ لاہور کے تین پبلشرز کو دِکھایا، جن میں سے ایک میرے حقیقی پھوپھا بھی تھے۔ تینوں حضرات نے اوراق کو اُلٹ پلٹ کیا؛ کچھ غیرضروری سوالات کیے اور مسوّدہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے میرے مُنہ پہ دے مارا۔ ہر نفی میں مجھے جو قدرِ مشترک نظر آئی وہ حقارت اور بیزاری کی انتہا تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں نے اُن کے سامنے کوئی کشکول رکھا اور اُنھوں نے یہ کہتے ہوئے میرے کشکول کو ٹھڈا مار دیا ہو کہ شرم نہیں آتی، ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے پھر رہے ہو۔ اِس سے میرے اندر بے قدری کا احساس، جو پہلے ہی موجود تھا، اُس میں کئی گُنا اضافہ ہو گیا۔ دوسری بات جو مشترک تھی وہ یہ سوال تھا کہ کیا پہلے میری کوئی کتاب مارکیٹ میں موجود ہے؟

مَیں نیم مایوس اور پریشان تھا اور مجھے اپنی بےقدری پہ رونا آ رہا تھا۔ حیران تھا کہ دو سو صفحات

کی ایک ایسی کتاب جو اُس وقت کے ایک زبردست burning issue پر تھی اور جس میں عظمتِ اسلام اور شانِ مصطفیٰؐ بیان کی گئی تھی کی اشاعت پر سرمایہ دار اِتنے محتاط کیوں تھے۔ وارث شاہؒ نے کیا خوب کہا تھا:

گُنگا نہیں، قرآن دا ہوئے حافظ، انھاہ ویکھدا نہیں ٹُٹّا نیاں نوں

اُستاذی واصف علی واصفؒ نے بھی درست ارشاد فرمایا کہ ''جس ہیر کو وارث شاہ مل گیا، وہ ہیر گمنامی کے اندھیرے سے ایسے نکلی کہ ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر طلوع ہوئی۔ وارث شاہ کے دم سے ہیر حق ہوگئی۔ اس کی داستان، اُس کا عشق زبانِ زدِ خاص و عام ہے۔ اب وہ ہیر روح کی فریاد ہے ............... عشق وحُسن کے رشتوں کا تجزیہ کرتی ہے ............... طالبانِ حق کے لیے ایک استعارہ ہے لیکن سوچنے والی بات ہے کہ کتنی ہی ہیریں اپنے وارث شاہ کے انتظار میں خاموش بل کہ فراموش ہوگئیں۔''

جو قصّہ میں نے لکھا وہ کسی ہیر کا تو نہ تھا لیکن اِس قصّہ کے مرکزی کردار کے ایک جُنبشِ ابرُو پر دُنیا کی ساری ہیریں ہی نہیں سارے رانجھے بھی قربان ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ میرا ہیرو، میرا ہی محبوب نہ تھا بل کہ ربِّ کائنات کا بھی محبوب تھا لیکن محتاط' پبلشرز نے اسے اِس لیے شائع کرنے سے انکار کر دیا کہ مَیں وارث شاہ نہ تھا۔ گم نام، بل کہ بے نام ادیب تھا اور زیادہ درست تو یہ ہے کہ ادیب تھا ہی نہیں۔ پھر میرے پاس رانجھا، چوچک، سَیدا، کیدو، قاضی، بال ناتھ، سہتی یا 'رابیاں صیر فاں' کے کردار بھی نہ تھے۔ مَیں نے جو ابواب باندھے، وہ یہ تھے:

مستشرقین کا اندازِ نظر۔

عورت، دَورِ جاہلیت میں۔

پردہ، عورت اور اِسلام۔

عورت، مغرب کے آئینے میں۔

کثرتِ ازواج کا مقدمہ۔

محسنِ انسانیتؐ اور میل اِلی النّساء

چند ایّام خاموش رہنے کے بعد میں نے مسوّدہ حبیب بنک بلڈنگ چوک اُردو بازار لاہور کے ایک مشہور کاتب کے حوالے کر دیا، یہ سوچے بغیر کہ کتاب کی اشاعت کے اخراجات کہاں سے آئیں گے۔ بے شک غربت انسان کو مقہور و مجبور کیے رکھتی ہے لیکن اِس سے مقیاسِ ذہانت متأثر نہیں ہوتا۔ مَیں نے اپنے معمول کے اخراجات اور گھر سے باہر کے 'چائے پانی' میں کمی کرنے کی بھرپور کوشش کی اور کاتب کا محنتانہ محفوظ کر لیا۔ ازاں بعد کاغذ اور پرنٹنگ وغیرہ کے اخراجات کا بھی اللہ نے بندوبست کر دیا۔ پھر جلد ہی اس کی گیارہ سو کاپیاں تیار تھیں۔ کتاب کا نام رکھا گیا 'عورت، مغرب اور اِسلام'۔

اب میں نے تیار کتاب کے ساتھ ایک بار پھر بُک سیلرز کا طواف شروع کیا۔ یوں مال روڈ پر 'ماورا' اور اُردو بازار میں مکتبہ تعمیرِ انسانیت اس کے سیل پوائنٹ بن گئے۔ مؤخرالذّکر نے تو اس کی تین سو کاپیاں خرید لیں۔ اب تک اِس کی ہزاروں کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں اور یہ کتاب دُنیا بھر میں اپنے قارئین رکھتی ہے۔ امریکہ کی ایریزونا اور مشی گن یونیورسٹیز میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ اُن کی لائبریریز میں موجود ہے۔ ٹورنٹو یونیورسٹی کینیڈا کے نصاب میں شامل ہے اور ورلڈ کیٹ پر موجود ہے۔ علاوہ ازیں بھی دُنیا بھر کے بڑے تعلیمی اور تحقیقی اداروں نے اِسے عزت بخشی ہے یا شاید اِس نے اُنھیں عزت بخشی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر اسے روزنامہ 'مشرق' یا 'نوائے وقت' شائع کر دیتے تو شاید آج یہ قصّہٴ پارینہ بن چکی ہوتی لیکن اب یہ کتاب میرے مرنے کے بعد بھی مجھے زندہ رکھنے کا سامان بن چکی ہے، اِن شاءاللہ سبحانہٗ وتعالیٰ۔ یہ کتابی شکل میں میری پہلی کاوش تھی جو دُنیا کے سامنے آئی۔

جوں ہی آپ Net پر Aurat, Maghrib aur Islam by Asghar Ali Javed سرچ کریں گے، اللہ کی عطا آپ کے سامنے آنے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقالہ بعنوان 'عورت، مغرب اور اسلام' از ثروت جمال اصمعی اِس سے طویل مدت بعد 2012 میں بھی شائع ہوا تھا۔

**ثاقب کی قدر ناشناسی:** مجھے سن تو ٹھیک سے یاد نہیں ہے البتہ اِتنا یاد ہے کہ اُن دِنوں واپڈا کے ریجنل سربراہ، چیئرمین ایریا الیکٹریسٹی بورڈ واپڈا لاہور، سیّد تنظیم حسین نقوی تھے۔ ایک روز دفتر کے

فلور سے ہمارے ایک دیرینہ ساتھی مشتاق صاحب حسبِ معمول پان چباتے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ دیکھیے جاوید صاحب! آپ ہمارے منتخب نمائندے بھی ہیں اور میجر ثاقب صاحب سے آپ کی ذاتی دوستی بھی ہے۔آپ میرا کام کروائیں۔مَیں بڑی امید سے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔

تمہیدی کلمات کے بعد اُنھوں نے بتایا کہ بیٹا فارغ ہے،بس کرکٹ گردی میں وقت ضائع کر رہا ہے۔آپ برائے کرم اُسے اسسٹنٹ لائن مین بھرتی کرا دیں۔

''لیکن بھرتیوں کا میجر ثاقب سے کیا تعلق ہے، وہ تو ایڈمن کے آدمی نہیں ہیں۔'' میں نے وضاحت چاہی۔

''دراصل، میں چاہتا ہوں کہ وہ سپورٹس مین کوٹہ کے تحت آئے۔اُنھوں نے یاد دِہانی کروائی کہ میجر صاحب لیسکو کرکٹ ٹیم کے مینجر بھی ہیں، اور نئے کھلاڑی اُنھی کے سفارشی نوٹ پر ٹیم میں شامل ہوتے ہیں۔'' مشتاق صاحب نے وضاحت کر دی۔

میں نے مشتاق صاحب کو اُسی وقت ساتھ لیا اور ساتھ والے کمرے میں میجر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ مشتاق صاحب نے اُنھیں بتایا کہ اُن کا بیٹا کرکٹ کھیلتا ہے اور اچھا باؤلر ہے۔ میں نے بھی ایک ٹریڈ یونینسٹ کے انداز میں پُر زور سفارش کی لیکن میجر صاحب کا جواب یہ تھا کہ ہر والد اپنے بیٹے کے بارے میں اچھی رائے ہی رکھتا ہے۔ ویسے بھی فی الوقت ٹیم میں نئے کھلاڑیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے میجر ثاقب کا یہ انداز پسند نہ آیا اور میں مشتاق صاحب کو sorry کہتا ہوا اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

گھڑی کی سوئیوں کو تو چلنا ہی ہوتا ہے اور روز وشب کو ماضی میں بدلنا ہی ہوتا ہے۔ایک روز دورانِ چائے میجر ثاقب نے پاکستانی ٹیم کی گزشتہ روز کی پرفارمنس کا ذکر کرتے ہوئے نہایت جذباتی انداز میں کہا:

''یار، کمال باؤلنگ کی اُس لڑکے نے اپنے پہلے ہی میچ میں۔لاہور ہی کا رہنے والا ہے وہ۔''

''کون لڑکا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''یار وہ ثقلین مشتاق''۔

''میجر ثاقب! ضروری نہیں کہ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کی تعریف کر رہا ہو تو وہ غلط ہی ہوتی ہے۔ ہر بیٹے کا کوئی نہ کوئی باپ ہوتا ہے۔ آپ کے ناروا بیان کے مطابق تو دُنیا کا کوئی بیٹا بھی لائقِ تحسین نہ ہوگا۔''

''کیا مطلب تمھارا!''

''یہ وہی لڑکا ہے جسے آپ نے اسسٹنٹ لائن مین کے طور پر بھی لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بین الاقوامی شہرت حاصل کر لینے والے اِس عظیم الشّان باؤلر کو آپ کی مجرمانہ غفلت نے ہمارے ہاتھوں سے نکال دیا۔ کہیے کیا کہتے ہیں آپ؟''

اُس روز مشتاق صاحب کی جو دل آزاری ہوئی تھی، اُس کا قلق مجھے ہمیشہ رہا۔

**اَللّٰہُ لَطِیفٌ بِّعِبَادِہٖ:** سینہ جتنا بھی اُبلتا رہا اور زندگی جس نہج پر بھی چلتی رہی، مَیں نے مطالعہ قرآن سے کبھی رُوگردانی نہیں کی۔ اِس سلسلے میں میرا کوئی اُستاد نہیں ہے۔ یہ میری بدقسمتی سمجھیئے۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ مجھے قرآنی مضامین بار بار پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اُن دِنوں میرا موضوع مطالعہ خیر الرّٰزِقین کی رزاقیت تھا۔ مَن کے کارخانے میں تیار شدہ یہ زہر رگِ جاں میں اُتر چکا تھا کہ اُس خیر الرازقین کی نظر مجھ پہ کیوں نہیں پڑتی۔ دھکے ٹُھڈے کھاتے آدھی طبعی عمر بیت چکی تھی لیکن تنگیِ رزق ابھی تک سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ مَیں رزاقیت کے پروردگار کے قریب ہوتا رہا اور اِس کھوج کاری میں رہا کہ وہ رِزق کیسے دیتا ہے۔ بالآخر یہ کھلا کہ اللہ نے اپنی کتاب میں 31 جگہوں پہ اپنے رازق ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان میں 14 مقامات پر یہ اِرشاد فرمایا ہے کہ وہ سبحانہٗ وتعالیٰ رِزق اُسے دیتا ہے جسے چاہتا ہے............ اچھا، یہ کام تو خراب ہو گیا۔ کوئی فارمولا، کوئی ضابطہ اور کوئی طریقِ کار تو نہیں بتایا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ جواب ملا: سورۃ الشُّورٰی کی آیت نمبر 19 پڑھا کرو ''اَللّٰہُ لَطِیفٌ بِّعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ، وَھُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ☆ (42:19)۔ یہ 1990 کے موسمِ بہار کی بات ہے جب مَیں نے اِس آیتِ مبارکہ کا باقاعدہ وِرد شروع کیا۔ میں جب اپنی یادداشتوں کو دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ 1990 کے چاول کے سیزن میں میرے گھر کے ایک کمرہ میں 150 من چاول پڑے تھے جو میں نے، ظاہر ہے اپنی جیب سے کاروبار کے لیے خرید کیے۔ اُس سال حکومتی پالیسی کی وجہ سے چاولوں کا بھاؤ خوب بڑھا اور معقول

منافع حاصل ہوا۔ یہ سلسلہ 1991 میں بھی جاری رہا۔ میں نے اس سیزن میں زیادہ چاول خریدااور اُسے تھوک کی بجائے پرچون میں فروخت کیا جس سے منافع بہت بڑھ گیا۔ مارچ 1992 میں مَیں نے نئ سوزوکی مہران کار خرید لی جو میرے خاندان کی پہلی کار تھی۔ اُن دِنوں شِدّت سے احساس ہوا کہ بلاشبہ رزق اللہ ہی دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ البتہ رزاقیت کی آیاتِ مبارکہ کو لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے ساتھ جوڑ کر پڑھا جائے، کہ رازق تو پرندوں کا بھی وہی ہے لیکن وہ اُن کے گھونسلوں میں اُن کی خوراک نہیں رکھتا، حالانکہ وہ ہم انسانوں سے زیادہ اللہ کو پکارتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو سورۃ الحج کی آیت نمبر 18 پڑھ لیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

''(اے محبوبؐ!) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے۔ اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی۔ اور بہت سے ایسے بھی ہیں کہ اُن پر ٹھہر چکا عذاب (22:18)

تا دمِ تحریر تین عشروں کی طویل مُدّت بیت چکی ہے۔ جب بھی رزق میں تنگی محسوس کرتا ہوں مَیں وِرد شروع کر دیتا ہوں:

اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ☆ (42:19)

پھر میرا پروردِگار نواز دیتا ہے، جتنا اُس کا جی چاہتا ہے۔

**میں اور کرم سنگھ** : 1993 میں الیکٹریسٹی بورڈ واپڈا (اب لیسکو) کا دفتر 34۔ نکلسن روڈ لاہور پر واقع تھا۔ لاہور اور شیخوپورہ کے درمیان چلنے والی پبلک ٹرانسپورٹ مینارِ پاکستان تک ہی رہتی تھی اور شیخوپورہ میں ''لاری اڈا'' اور ''لہور ٹیشن، لہور ٹیشن'' کی صدائیں بلند کرنے والے کنڈیکٹرز بنولحیان کی طرح بد عہدی کرتے ہوئے مسافروں کو زبردستی مینارِ پاکستان کے پہلو سے گزرتی راوی روڈ پر اُتار دیتے۔ مَیں مینارِ پاکستان سے ریلوے اسٹیشن جانے والی ٹرانسپورٹ کے حصول کے لیے سڑک پر چلنے کی بجائے کوئی اڑھائی تین فٹ اونچی سڑک سے مینارِ پاکستان گراؤنڈ میں چھلانگ لگا کر مطلوبہ سٹاپ پر پہنچ جاتا۔ اُس روز چھلانگ لگاتے ہی میری نظر پارک میں ٹہلتے، سامنے سے آتے ایک بوڑھے سردار جی پر پڑی۔

''ست سری اکال'' نہ جانے کیوں میری زبان سے نکل گیا۔

''جو بولے سونہال'' کہتے ہوئے سردار جی آگے نکل گئے۔

سردار جی کی بے مہری پرمَیں نے ابھی کچھ قیاس نہ کی تھی کہ اُس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''گل سُن پُتری............... کِدّھر جا رہیا ایں''؟

''بابا جی! آفس جا رہا ہوں............... ریلوے اسٹیشن کے بالکل ساتھ نکلسن روڈ پر واپڈا کا لاہور ریجن کا دفتر ہے۔ وہاں نوکر ہوں میں۔''

''ہُن کِتھوں آ رہیا ایں؟''

''اپنے گھر سے، شیخوپورہ سے۔''

''فیر تاں گورو جی دا گوانڈی ہویا نا!............... مَیں گورو رنجیت سنگھ دی مڑھی تے سلام کر آیا ہاں...... ایوں دِل کیتا منٹو پارک وچ پھرن نوں ............... پُتر! دفتروں کویل نہ کرلویں''۔

مَیں نے اپنا وزٹنگ کارڈ جیب سے نکالا اور یہ گزارش کرتے ہوئے اُس کے حوالے کر دیا کہ اگر وقت ملے تو میرے دفتر ضرور آئیں۔

نمازِ ظہر کی ادائیگی کے بعد میں ابھی اپنے کمرہ میں پہنچا ہی تھا کہ میرے سرکاری لینڈ لائن فون پر کال آئی:

''مَیں کرم سنگھ بات کر رہا ہوں، آپ اصغر علی جاوید ہیں نا!''

''جی، میں اصغر علی جاوید ہوں لیکن ............... آپ ............... میرا مطلب ہے آپ!''

''پُتری! سویرے منٹو پارک وچ نہ توں ناؤں پُچھیا، نہ میں دسیا''

''جی، جی، جی، سردار جی! پہچان گیا ہوں۔ واقعتاً صبح مجھ سے غلطی ہوئی۔''

''میں تمھارے آفس آ رہا ہوں''

''جی آیاں نوں سردار جی! میں اُڈیکن ہار آں۔''

کوئی نصف گھنٹے بعد کرم سنگھ 34۔ نکلسن روڈ لاہور پہنچ گیا۔ میں نے نہایت احترام کے ساتھ اُس کا استقبال کیا۔ اپنے ہاتھ سے اُس کے لیے چائے بنائی اور کوئی ایک گھنٹہ اُس سے گپ شپ ہوتی رہی۔ اُس کی

گفتگو بعض وقت عسیر الفہم ہوتی تھی اور کچھ عجیب سے جذبات اُس کے چہرے سے عیاں ہو جاتے تھے۔

اُن دِنوں بھارت میں خالصتان تحریک کا بڑا چرچا تھا اور وہ بار بار خالصتان کا ذکر بھی کرتا رہا۔

''تمھارا کیا خیال ہے، ہندوستانی سکھ خالصتان کے مطالبہ میں حق پر ہیں؟''

کرم سنگھ نے نجانے کیوں پوچھ لیا۔

''سردار جی! مَیں نے اِس تحریک کا کوئی خاص مطالعہ نہیں کیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''دیکھنا! 1947 میں جو قوم گھاٹے میں رہی وہ سکھ قوم ہے۔ پاکستان بننے کا فائدہ ہندو کو بھی ہوا اور مسلمان کو بھی۔ سکھ کا پنجاب دولخت ہو گیا۔ گورونانک پاک تو پاکستان میں تھا۔ پھر معلوم نہیں ہمارے سکھ بزرگوں نے کن حالات میں اور کیونکر ہندوستان کی طرف ہجرت کرنا پسند کیا۔''

''بابا جی! ایہہ گل تاں اپنے بزرگاں نوں پُچھو۔'' مَیں نے جواب دیا۔

''گورو برار کی شہادت کے بعد ہندوستان میں رہنا تو بالکل اچھا نہیں لگا۔ پاکستان آتا ہوں تو واپس لوٹنے کو جی نہیں چاہتا۔ کل انارکلی گھومنے کے بعد مَیں گورنمنٹ کالج گیا تو زمانہ طالب علمی کا ایک ایک لمحہ یاد آ گیا۔ راوین ہوں میں بھی''۔

''بابا جی! یہ گورو برار کون تھے؟ کیسے شہادت ہوئی اُن کی؟''

''گورو جرنیل سنگھ برار............... 6۔جون،1984 کو امرتسر میں شہید کر دیے گئے۔''

''سردار جی! یہ وہی تو نہیں ہیں جنھیں لوگ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے نام سے یاد کرتے ہیں؟''

''ہاں بچّے! ٹھیک سمجھے تم۔''

''اچھا یہ بتائیں کہ کل کا آپ کا کیا شیڈول ہے؟''

بوڑھے کرم سنگھ کے چہرے پر گہری اُداسی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر نہایت ہی رنجیدہ لہجے میں کہنے لگا:

''گُرو جانے پُتر جی!''

''پھر بھی کچھ تو پروگرام ہوگا آپ کا!'' مَیں نے استفسار کیا۔

''تم پاکستانی گورو جرنیل سنگھ اور خالصتان کی بات سُننا اور کرنا کیوں پسند نہیں کرتے؟''

کرم سنگھ نے کچھ جذباتی سے لہجے میں کہا۔

''باباجی! دراَصل مَیں آپ کو ایک کتاب گفٹ کرنا چاہتا ہوں، اِس لیے پوچھ رہا تھا۔''

اور اگلی صبح کرم سنگھ مجھے ملنے اور کتاب لینے کے لیے خود ہی چلا آیا۔ مَیں اپنی لائبریری سے خواجہ افتخار کی 'جب امرتسر جل رہا تھا' دفتر ساتھ لے گیا تھا جو بڑے ادب سے مَیں نے اُسے پیش کر دی۔ کرم سنگھ نے مجھے گلے لگایا، میرا مُنہ سر چوما اور دُعائیں دیں۔ اُس روز اُس نے اُردو اور پنجابی ادب پہ کچھ بات چیت کی اور کچھ خاندانی حالات پر۔ رُخصت ہونے لگا تو مَیں نے خواہش ظاہر کی کہ کبھی پھر پاکستان آنا ہو تو شرفِ ملاقات بخشیئے گا۔

''جیوندے رَئے تے'' کہتے ہوئے اور کل والی متانت وسنجیدگی چہرے پہ سجائے کرم سنگھ میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

**کرم سنگھ سے دوسری ملاقات اور بسنت کور:** کرم سنگھ سے میری ملاقات گزشتہ سال تو اتفاقیہ ہوئی تھی لیکن اِس بار وہ 'ست سری اکال'' کہنے خاص طور پر میرے پاس آیا۔ ننکانہ صاحب میں بابا گورونانک کی سالانہ تقریبات سے فارغ ہو کر وہ لاہور واپس آ چکا تھا اور اگلے ہی روز اُسے ہندوستان واپس جانا تھا۔ لاہور میں اُس کی مصروفیات صرف رنجیت سنگھ کی مڑھی پر حاضری تھی لیکن باتوں باتوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شالامار باغ کی سیر کے لیے بھی بے چین ہے۔ پھر بھی وہ تسلی سے گپ شپ کرتا رہا اور اِس دوران لسّی کے دو بڑے گلاس پی گیا۔

گزشتہ برس کی دو دِن کی رفاقت میں مجھے اِتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کا طالب علم رہا ہے۔ اُس کا آبائی گاؤں ننکانہ صاحب (ضلع شیخوپورہ) سے کچھ فاصلے پر تھا۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ ہندوستان جانے کا خواہش مند نہ تھا لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ وہ مجبور ہو گیا۔ اپنی جسمانی قوت کی شہرت کا ذکر اُس نے بڑے فخر سے کیا تھا اور اُردو ادب سے اپنی گہری وابستگی ظاہر کی تھی۔ وہ بغیر میرے پوچھنے کے یہ بھی بتا گیا تھا کہ پاکستانی پنجاب چھوڑ کر جانے والے بہت سے سکھوں کی طرح وہ امرتسر کے محلّہ شریف پورہ میں آباد ہو گیا تھا اور آج تک وہیں ہے۔ اُس کی ماں قیامِ پاکستان کے وقت راستے میں ہی قتل کر دی گئی تھی اور باپ اتفاق سے اُس دِن مرا تھا جس دن ہندوستان کے ایک سابق وزیرِ

اعظم لال بہادر شاستری۔ اُس کے تعارف میں خاص بات یہ تھی کہ اُس نے ساری زندگی بیاہ نہیں کیا۔

گفتگو کے دَوران کئی بار میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ کرم سنگھ مجھے ملنے کیوں چلا آیا ہے؟ جو کتاب مَیں نے اُسے پچھلے سال تحفہ میں دی تھی اُس کے بعد ہرگز توقع نہ تھی کی وہ مجھے ملنے آئے گا۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ تعلیم یافتہ اور عمر رسیدہ سِکھ زندگی کی تقریباً ستر بہاریں دیکھ چکا ہے۔ اگر مَیں کتاب کا ذکر چھیڑوں تو اس میں کسی بدمزگی کا امکان کم ہی ہے اور مَیں نے جرأت سے کام لیتے ہوئے پوچھا:

''سردار جی! وہ کتاب امرتسر پہنچ گئی تھی؟''

سردار جی نے یہ سُنتے ہی ایک زوردار قہقہہ لگایا کہ جیسے وہ کب سے اِس سوال کا انتظار کر رہا تھا اور اَب یہ سوال کر کے گویا مَیں کسی کی گرفت میں آ گیا ہوں۔

''جب امرتسر جل رہا تھا'' یہی تھی نا تمھاری کتاب؟ سردار جی نے تصدیق چاہی۔

''میری نہیں سردار جی! مصورِ حقیقت خواجہ افتخار کی'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں امرتسر پہنچ گئی تھی۔ لسّی کا گلاس ملے گا؟'' سردار جی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''لسّی تو لاہور کی سوغات ہے جی۔ کیوں نہیں ملے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

یوں کرم سنگھ پوری قوت سے یہ تأثر دینے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ کتاب پر کچھ نہیں کہے گا یا کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ جان لینے کے بعد کہ بات بنتی نظر نہیں آتی میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

''آپ کے خالصتان کا کیا بنا؟'' مَیں نے سوال کیا۔

کرم سنگھ پہلی بار اِتنا جذباتی نظر آیا اور ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں کہنے لگا ''لے کے رہواں گے پُتری'' اُس نے بات آگے چلاتے ہوئے کہا کہ ''زندگی میں دوسرا مقصد ہی کیا ہے۔ زندگی برباد کی ہے۔ قوم کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ گھر نہیں بسایا، دیس بساؤں گا۔''

وقت کافی گزر چکا تھا۔ اب وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا: ''بارہ بج گئے ہیں۔''

''کِس کے؟'' مَیں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

سردار جی نے پھر زور سے قہقہہ لگایا اور اُٹھتے ہوئے کہنے لگا کہ ''مڑھی پر مَیں اکیلا جاؤں گا البتہ شالامار باغ ہم اکٹھے جائیں گے۔ تم دو گھنٹے بعد مڑھی کے باہر مینارِ پاکستان کے صدر دروازے پر پہنچ جانا۔''

''جو حکم سردار جی! ............ سردار جی، دو گھنٹے بعد دو بجے کا وقت ہوگا۔''مَیں نے پھر شرارت کی۔
سردار جی کتنی ہی دیر مسکراتے رہے اور کہنے لگے کہ ''پھر تو تمھارے بھی بارہ ہی بجے ہیں۔'' تھوڑے توقف کے بعد کہنے لگا''اچھا پُتری! دو بجے وہاں پہنچ جانا۔''
''گُرو کی کِر پا سے''مَیں نے کہا۔
''اِن شاء اللہ'' سردار جی نے جواب دیا۔

..............................................

''ست سری اکال''مَیں نے جاتے ہی بلند آواز سے کہا۔
ٹھیک دو بجے مَیں بیرونی جنگلے پر جُھکے ہوئے اور مینارِ پاکستان کی طرف گھور گھور کر دیکھتے ہوئے سردار جی تک حسبِ وعدہ پہنچ گیا۔''جو بولے سونہال'' کہتے ہوئے سردار پیچھے کی طرف گھوما تو مجھے ندامت سی محسوس ہوئی۔ وہ تو کوئی اور تھا۔مَیں نے چہرے سے حماقت کے تأثرات سمیٹے ہوئے کہا:
''سردار جی! یہ سرے سکھ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں؟''
''ایہو گل تے میں سمجھا ندا مر چلیاواں''
گویا سردار جی دھڑلّے سے کہہ رہے ہوں کہ اُنھیں فخر ہے کہ سارے سکھ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔
''آپ کے خالصتان کا کیا بیا؟''مَیں نے وقت گزارنے کے لیے سوال کیا۔
''کسی اخبار سے آئے ہو کیا؟''سکھ یاتری نے پوچھا۔
''نہیں جی، کرم سنگھ کا انتظار کر رہا ہوں۔بس وقت گزارنے کے لیے بات کر دی ہے''مَیں نے جواب دیا۔
''کرم سنگھ؟ شریف پورے والا؟''سکھ یاتری نے وضاحت چاہی۔
''جی جی سردار جی! وہی شریف پورے امرتسر والا''میں نے تصدیق کی۔
''روندا اہنا اے کِدرے بسنت کور نوں ............ جھلا مسلمان چھوکری نال عشق کر بیٹھا سی۔ بھلا کوئی دھرم وی چھڈ دا اے؟''
''لے اوہ کرم سنگھ ٹُریا آوندا ای'' سردار نے مڑھی کی طرف والی سڑک پر کرم سنگھ کی طرف اِشارہ کیا۔
میں نے جنگلے کے ساتھ کھڑے سِکھ کو خدا حافظ کہا اور تیز تیز قدموں سے کرم سنگھ کی طرف بڑھنے لگا۔

''السلام علیکم'' کرم سنگھ نے پہل کی۔

''وعلیکم السلام۔کیا حال ہے؟''میں نے جواب دیا۔

کرم سنگھ کچھ مغموم سا تھا لیکن مَیں نے اس کی وضاحت اِس لیے نہ چاہی کہ ہم بھی اپنے بزرگوں کی قبروں سے واپسی پر کچھ اِسی طرح کی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔

''چلیں شالامار باغ؟''میں نے سوال کیا۔

''نہیں پُتری! ننکانہ صاحب (شیخوپورہ)۔''اُس نے جواب دیا۔

''پروگرام بدل گیا؟''میں نے پوچھا۔

''نہیں، بدلا نہیں، بدل دیا گیا۔تم سُن تو نہیں سکو گے لیکن مڑھی سے اب بھی آواز آ رہی ہے کہ کرم سنگھ بابا جی کو آخری بار پرنام کرآؤ اور بسنت کور کو بھی آخری بار مل آؤ۔اب تم دوبارہ یہاں نہیں آسکو گے۔مَیں یہ دونوں کام تو کرآیا ہوں لیکن اب حکم ہے کہ آخری بار یہ فرض ادا کر کے جاؤں۔''اُس نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر پہلے پُرعزم اور باہمت نظر آنے والا سکھ سردار اب سچ مُچ ستر سال کا نظر آنے لگا تھا۔ مَیں ابھی اپنی پریشانی چھپانے کی ناکام کوشش کر ہی رہا تھا کہ اُس نے لاری اڈا کی طرف سے آتی ہوئی ییلو کیب کو اِشارہ کر کے روک لیا۔

''ننکانہ صاحب چلو گے؟''سردار جی نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''معلوم ہے ننکانہ کتنی دُور ہے؟''ڈرائیور نے جواباً سوال کیا۔

''ہاں مَیں وہیں پیدا ہوا تھا''سردار جی کچھ غصّے میں تھے۔

اُس نے پچھلا دروازہ کھولا۔ مجھے گاڑی میں دھکا دیا۔میرے بائیں جانب خود بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو ننکانہ صاحب چلنے کا حکم دیا۔ننکانہ میں بابا گورونانک کی سالانہ تقریبات میں شرکت کرنے والے کچھ سکھ یاتری ابھی وہاں موجود تھے۔سکھ یاتری بابا جی کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے عجیب وغریب انداز اپنا رہے تھے۔ایک سے زائد جگہوں پر گرنتھ صاحب مترنّم پڑھا جا رہا تھا کہ کرم سنگھ نے نہایت سنجیدگی سے کہا:''پُتری! بابا جی سب کے سانجھے بزرگ تھے۔ ہندوؤں، مسلمانوں، سِکھوں، سبھی کے۔'' گویا وہ مجھے کہہ رہا ہو کہ مجھے بھی اِن رسومات میں شریک ہو جانا چاہیے۔مَیں نے کرم سنگھ کی بات کی تصدیق کی اور

باباجی کی زندگی کے کئی ایک واقعات دُہرائے۔ کرم سنگھ یہ سُن کر ابھی اسی خوش گوار حیرت میں تھا کہ سامنے ٹیکسی کے پاس کھڑے ڈرائیور پر اُس کی نظر پڑی۔ اُس نے میری اُنگلی تھامی جیسے میں گاؤں سے آیا ہوا وہ بچہ تھا جو کسی بھی وقت میلے میں گم ہوسکتا ہے اور ٹیکسی کی طرف چل پڑا۔ ڈرائیور پہلے ہی اپنی سیٹ سنبھال چکا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُس نے ڈرائیور کو اُنگلی کے اِشارے سے ایک خاص سمت چلنے کو کہا۔

اب کرم سنگھ اگلی سیٹ پر تھا۔ اُس نے ڈرائیور کی پریشانی کو بھانپ لیا اور کہنے لگا ''فکر نہ کرو، پکی سڑک ہے'' اور اس کے بعد وہ بالکل خاموش ہوگیا جیسے بابا نانک نے اُس کی زبان بندی کر دی ہو۔ میرے تجسّس میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا کہ وہ باباجی کو سلام کرنے اور بسنت کور کو آخری بار ملنے آیا تھا۔ یقیناً اس سفر کی منزل اب بسنت کور ہی تھی۔ مَیں نے خاموشی توڑنے کی کوشش کی:

''سردار جی بسنت کور کا گاؤں کتنی دُور رہ گیا؟'' سردار جی خاموش رہے۔

مَیں نے ایک لمحہ کے بعد پھر سوال کیا ''سردار جی سفر کتنا باقی ہے؟''

''تھک گئے پُتر جی! سردار نے جواباً پوچھا۔

''نہیں سردار جی! ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ بس خاموشی سے ڈر لگ رہا تھا۔'' مَیں نے وضاحت کی۔

''سفر اچھا نہیں لگ رہا؟'' اُس نے سوال کیا۔

''کیوں نہیں سردار جی، کیوں نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس ہستی کو ملنے کے لیے میں بھی بے چین ہوں جسے ملنے کی آپ کو خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

'' ملنے کی نہیں، آخری بار ملنے کی کہو۔ مل کر تو ابھی کل ہی گیا ہوں۔'' سردار جی نے بات آگے بڑھائی۔

مَیں نے کہا ''سردار جی! وہم ہے آپ کا۔ آپ اِن شاء اللہ ابھی کئی بار یہاں آؤ گے۔''

کرم سنگھ نے پہلی بار پیچھے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ وہ زیرِ لب مسکرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم پرلے درجے کے احمق ہو۔

گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف بھاگ رہی تھی۔ کوئی پانچ منٹ بعد جب مَیں نے خود کو نارمل محسوس کیا تو کرم سنگھ ڈرائیور کا بایاں بازو دبا رہا تھا۔ ڈرائیور سمجھ گیا کہ رُکنے کا کہہ رہا ہے۔ کرم سنگھ کی خاموشی سے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا اور پھر ظلم یہ کہ وہ گاڑی ایک ویرانے میں قبرستان کے سامنے رکوا رہا تھا۔

قبرستان میں داخل ہوتے ہی انتہائی خلافِ توقع اُس نے بلند آواز میں ''السلام علیکم یا اہل القبور'' کہا پھر قطرہ قطرہ پانی دیتے ہینڈ پمپ سے ہاتھ مُنہ دھویا اور قبرستان کے اُس پار ایک پرانی قبر پر کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے وضو کے دوران کوشش تو کی کہ سُن سکوں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے یا کیا پڑھ رہا ہے لیکن قبر کافی دُور تھی۔ جب مَیں وضو سے فارغ ہو کر قبر پر پہنچا تو وہ آخری جملہ ادا کر رہا تھا۔

''تُو اپنا دھرم چھوڑ سکی اور نہ میں اپنا۔ تُو نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور مَیں نے اپنا۔ بسنت کور خدا حافظ اور السلامُ علیکم۔''

قبر پر ایک انتہائی بوسیدہ سی لوہے کی پلیٹ پر لکھا تھا:

''بھاگ بھری دُختر محمد دین

تاریخ وفات 16۔اگست 1947ء''

ننکانہ سے واپسی پر مَیں اور کرم سنگھ ایسے ہی رہے، جیسے ہم زندانِ خاموشاں کا حِصّہ بن چکے ہوں۔ کرم سنگھ سے آخری مکالمہ یہ تھا:

''ست سری اکال بابا جی!'' میں نے ٹیکسی سے اُترتے ہوئے کہا۔

''جیوندا رَے پُتری، اللہ حافظ!'' کرم سنگھ نے جواب دیا۔

اور اُس کے بعد میں زندگی بھر کرم سنگھ کو نہ دیکھ سکا۔

**ایک بار پھر لاء کالج میں:** زندگی میں دو بار لاء کالجز سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ پہلی بار ایل ایل بی کے لیے اور دوسری بار ڈی ایل ایل کے لیے۔ تیسری بار دسمبر 1993 کی ایک ٹھٹھرتی شام جب ہمارے طارق روڈ کے رہائشی ایک شریف الطبع نوجوان حافظ شوکت وحید میرے گھر آئے۔

''سر! آپ کے علم میں ہے کہ مَیں نے ایک لاء کالج کی بنیاد رکھی ہے؟'' حافظ صاحب نے مصافحہ کرتے ہی سوال کیا۔

''آپ اندر تشریف لے آئیں، بیٹھ کر بات کرتے ہیں''۔ میں نے اُنھیں پیش کش کی۔

اُنھوں نے وقت کی تنگی کا بہانہ کیا اور مختصراً اِس خواہش کا اظہار کیا کہ مَیں اُن کی ٹیم میں شرکت کروں۔ اُنھوں نے یہ دعوت بھی دی کہ مَیں کل شام محمڈن لاء کالج میں اُن کے دفتر میں اُن سے ملاقات کروں۔

اگلی شام میں حسبِ وعدہ محمڈن لاء کالج پہنچ گیا،لیکن لاء کالج میں یہ تیسری آمد بحیثیت لیکچرار تھی اور طلباء و طالبات نے مجھے پروفیسر جاوید کا نام دے دیا۔ پوری زندگی میرا قلم ہی میرے لیے تیشۂ فرہاد رہا ہے۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ کوئی کام ڈھنگ سے کرنا نہیں آیا۔ لاء کالج میں بھی مَیں نے اپنے مضمون 'برطانوی اور امریکی آئین' پر بھرپور محنت کی اور کالج انتظامیہ اور سٹوڈنٹس کے نزدیک لائقِ اعتبار گردانا گیا۔ جلد ہی صورتِ حالات یہ بنی کہ پریڈ نہ پڑھنے کے شوقین سٹوڈنٹس بھی میری گاڑی دیکھتے ہی کلاس روم میں پہنچ جاتے تھے۔

ایک اُستاد کی اپنے طالب علم کے ساتھ بہترین محبت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سینے میں محفوظ علم کے خزانے پوری دیانت داری کے ساتھ اُس تک پہنچا دے اور اِس میں کسی بخل اور کمزوری کا مظاہرہ نہ کرے۔ شاید مَیں ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کا احساس مجھے اُس وقت ہوا جب مَیں ریٹائرمنٹ کے بعد بحیثیت وکیل اپنے سٹوڈنٹس کے درمیان موجود تھا۔ ان بچّوں نے مجھے بے پناہ محبت دی۔

لاء کالج میں درس و تدریس کا سلسلہ سال ہا سال چلتا رہا، یہاں تک کہ فرحت نے ایک ایلیمنٹری سکول کی بنیاد رکھی اور مجھے مختلف امور میں اُس کی مدد کرنا پڑی۔

**بانو قدسیہ اور اشفاق احمد خاں:** رَہِ حیات کی تمازتوں میں جتنی بھی شِدّت آئی، مَیں نے قلم اور کتاب سے بیگانگی نہیں اپنائی۔ ملازمت کے دوران کالم نگاری اور افسانہ نگاری میں میجر عبدالرّحیم ثاقب اور مامون الرّشید عباسی کے علاوہ پروفیسر عبدالجبار شاکر ڈائریکٹر پبلک لائبریریز پنجاب میری حوصلہ افزائی کرتے رہے اور یہ سلسلہ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے ساتھ جاری رہا۔

1995 کے آغاز تک مَیں 16 افسانے تحریر کر چکا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ان کی اشاعت کا بندوبست ہونا چاہیے۔ میری خواہش تھی کہ اِن افسانوں پر بانو آپا یا اشفاق احمد خاں کی رائے حاصل کی جائے، لہٰذا مَیں نے فون پر اُن سے رابطہ کیا اور اپنے ایک رفیقِ کار سیّد جمیل حسین مرحوم کے ذریعے مسوّدہ اُنھیں ارسال کر دیا۔ تین ہفتوں کے بعد اشفاق احمد خاں صاحب نے فون پر ہدایت کی کہ مَیں مسوّدہ اور اُن کی رائے وصول کر لوں۔

''خان صاحب! مجھے بانو آپا سے بھی شرفِ ملاقات حاصل کرنے کی اجازت دیں۔''

مَیں نے مؤدبانہ گزارش کی۔

''ارے بھائی! اُنھوں نے ہی آپ کے افسانوں پر رائے زنی کی ہے۔آپ اُنھیں مل لینا۔'' خان صاحب نے جواب دیا۔

پھر طے شدہ وقت پر مَیں داستان سرائے ، ماڈل ٹاؤن پہنچ گیا................ سبحان اللہ، اُستاذی واصف علی واصف کے دو دیرینہ ساتھی اور انسان سے محبّت کا درس دینے والے دو پیارے انسان، اور اُن کے سامنے میرے جیسا حقیر اور نکمّا آدمی۔ قُقنس کی طرح خوش الحان اشفاق احمد خاں باتیں کیے جا رہے تھے اور مَیں ایسے تھا کہ گویا میری پلکوں کی جُنبش بھی کبائر میں لکھی جائے گی۔ کہنے لگے:

''واصف صاحب سے کیا تعلق تھا؟''

''میرے اُستاد تھے۔مَیں نے انگلش اُن سے پڑھی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہوں، لاہور انگلش کالج کے طالب علم رہے ہو؟''

''جی سر!''

واصف صاحب کو رخصت ہوئے کوئی دو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا، لیکن جب خاں صاحب نے گفتگو شروع کی تو اُن کا انداز ایسے تھا کہ جیسے واصف صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں اور ابھی وہ اپنے مخصوص انداز میں کچھ کہنا شروع کر دیں گے۔مَیں نے اُنھیں بتایا کہ بابا جی حضور کے ایک عقیدت مند میجر ثاقب میرے رفیقِ کار ہیں لہٰذا دفتر میں اکثر اُن کا ذکر رہتا ہے۔ مجھے وہ واقعہ بھی یاد آیا کہ کس طرح ضیاء شاہد مرحوم میجر ثاقب کو واصف صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ چلتے چلتے آپ یہ واقعہ میجر صاحب کی زبانی سُنیئے، جو اُنھوں نے اگلی صبح مجھے دفتر میں سُنایا تھا:

''مجھے ضیاء شاہد کئی روز سے کہہ رہا تھا کہ تمھیں بابا جی سے ملوانا ہے۔میرا جواب یہ ہوتا تھا کہ اتنے سینئر صحافی ہو کر بابوں کے چکروں میں پڑ رہے ہو، حیرت ہے تمھاری عقل پر۔کل جب اُس نے بہت اصرار کیا تو مَیں نے یہ شرط رکھی کہ مَیں تمھارے 'بابا جی' کو اِس صورت میں بزرگ تسلیم کروں گا، اگر وہ میرا نام بتا دیں تو............ جب ہم واصف صاحب کی بیٹھک میں پہنچے تو وہاں تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ جونہی مَیں جوتوں کے درمیان کچھ جگہ بنا کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو واصف صاحب نے گفتگو روک کر میری

طرف اِشارہ کیا اور کہنے لگے کہ ’’ثاقب! تم آگے آجاؤ‘‘۔

’’واصف صاحب کی زباں سے اپنا نام سنتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مَیں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ اِس اثناء میں حاضرین نے واصف صاحب کے بالکل سامنے میرے لیے جگہ بنا دی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں کوئی عام سامع نہیں بلکہ مُریدِ خاص ہوں۔‘‘

مَیں نے جب خاں صاحب سے کہا کہ ’’آپ کو وہ لمحات تو خوب یاد آتے ہوں گے جب واصف صاحب نے آپ کو بوریوں سے بنا لباس پہنا دیا تھا اور کہا تھا کہ اب نیلا گنبد سے لوہاری کی طرف براستہ انارکلی نکل جاؤ۔ آپ کو بانو آپا سے ڈانٹ بھی پڑی تھی۔‘‘ خاں صاحب کچھ مسکرائے اور کہنے لگے کہ ’’غلطی بھی تو میری تھی کہ میں نے واصف علی واصف بننے کی کوشش کی تھی۔‘‘

مَیں نے جب خاں صاحب سے کہا کہ میں بچپن میں اپنے گاؤں میں ٹرانسسٹر ریڈیو پر آپ کی بحیثیت تلقین شاہ گفتگو سے بہت محظوظ ہوتا تھا تو وہ بھی ماضی میں کھو گئے۔ کوئی چالیس منٹ کی نشست کے بعد بانو آپا نے ایک کمرشل سائز لفافہ میرے حوالے کیا اور کہا کہ ’’میری رائے اِس میں موجود ہے۔‘‘ مَیں نے اجازت طلب کی اور دُعائیں دیتا گھر لوٹ آیا۔ بانو آپا کی تحریر آج بھی میرے سامنے ہے اور میری روح کی تسکین کا سامان فراہم کر رہی ہے۔ اور ہاں یاد آیا اُس روز رُخصت ہوتے آپا جی نے کہا تھا کہ ’’جاوید! اِس کام (افسانہ نگاری) کو ترک نہ کرنا۔‘‘

**دُکھوں کے صحرا میں تنہا لڑکی:** صبح میں اور میجر ثاقب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور فیصلہ یہ ہوا کہ بانو آپا کی رائے پس ورق پر چھاپی جائے گی اور افسانہ ’دُکھوں کے صحرا میں تنہا لڑکی‘ ٹائٹل بنے گا۔ پھر ہماری توجہ امجد اِسلام امجد اور الیاس گھمن کی طرف مبذول ہوئی کہ اُنھیں بھی اس مسوّدہ کی ایک ایک کاپی دے رکھی تھی۔ الیاس گھمن نے تو اِن افسانوں کو بین السطور پڑھا اور بڑی حوصلہ افزا رائے ارسال کی اور ازاں بعد کئی افسانوں کا پنجابی ترجمہ ورھے وار ’ساہت‘ میں شائع بھی کیا۔ لیکن شام کو جب ہم امجد اِسلام امجد کی طرف علامہ اقبال روڈ والے گھر گئے تو اُن کی رائے کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہ تھی۔ میجر ثاقب اور امجد گورنمنٹ کالج لاہور کے کلاس فیلو تھے اور بڑی بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے۔ میرے افسانوں پہ اُن کی

بحث سے مُجھے ہُد ہُد، سلمان اور کوّے کی بحث یاد آ گئی لیکن اُس روز میجر ثاقب نے سلمان کی طرح ہُد ہُد سے کوئی جواز طلب نہ کیا اور وہ خود ہی نمٹتا رہا۔

چند روز بعد 'دُکھوں کے صحرا میں تنہا لڑکی' اشاعت کے مراحل طے کرتی ہوئی مارکیٹ میں آ گئی۔ احباب کی طرف سے پذیرائی نے مجھے افسانہ نگاری جاری رکھنے پر قائل کر لیا اور یہ سلسلہ ایک طویل مُدّت جاری رہا۔ 'دُکھوں کے صحرا میں تنہا لڑکی' میں شامل کچھ افسانے انگریزی، پنجابی، گُرمکھی اور سندھی زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ انڈیا میں جب 1997 میں ڈاکٹر نرمل سنگھ نے 'جُدائی' کے موضوع پر پچاس افسانوں کا مجموعہ ترتیب دیا تو اُن میں پاکستان سے جہاں اشفاق احمد کا 'گڈریا' شامل تھا، وہاں اِس حقیر کا 'بسنت کور، خدا حافظ' بھی اس میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ بعد کے کچھ افسانے بھی انگریزی، سندھی، پنجابی اور گُرمکھی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

اِس مجموعے میں شامل 'محسن محلّہ' اُردو ادب میں ایک نیا تجربہ تھا اور وہ یوں کہ اشفاق احمد خاں نے افسانے 'محسن محلّہ' کا جہاں اختتام کیا تھا، میں نے اُسی کہانی کو اُنھی کرداروں کی مدد سے اس تھیوری کے تحت آگے بڑھایا کہ کوئی بھی داستان، کبھی بھی، کہیں بھی ختم نہیں ہوتی اور یہ تھیوری میری اپنی ہی ہے۔ اب میرے 'محسن محلّہ' کو اشفاق صاحب کے بعد میں پڑھا جائے تو اُسی کا تسلسل معلوم ہوتا ہے اور اگر اِسے علیحدہ پڑھا جائے تو یہ ایک مکمّل ادبی اکائی نظر آئے گی۔ اشفاق صاحب نے جب یہ پڑھا تو بہت خوش ہوئے اور اِس نئے تجربہ پر مجھے شاباش دی۔ اِس مجموعے میں شامل 'طوائف'، 'رومانس کا سیزن' اور 'پتھر نگر میں شیشہ گھر' بہت پسند کیے گئے اور موٴخر الذّکر کو تو ایک نوجوان نقاد علی آصف نے جو انگریزی ادب کا اُستاد بھی ہے، 'کفن' کی جدید شکل قرار دیا۔

**بدترین اعصاب شکن ایّام:** اگرچہ میری ایک کتاب 'عورت، مغرب اور اسلام' مارکیٹ میں پہلے سے موجود تھی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے تھے لیکن فکشن میں پہلی کتاب 'دُکھوں کے صحرا میں تنہا لڑکی' ہی تھی۔ اس کی اشاعت نے میری نیک نامی اور عزت میں لازماً اضافہ کرنا تھا۔ اخباری کالم بھی

تسلسل سے شائع ہورہے تھے۔مَیں یونین کا چیئرمین بھی تھااور ایک اچھی سیٹ پر پوسٹنگ بھی تھی، اور اِن حالات میں طاق سال 1995 آ گیا۔مَیں گزشتہ صفحات میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ واپڈا یونین کے انتخابات ہرطاق سال میں ہوتے تھے۔ 1995 میں میرے خلاف کچھ اِس طرح کے جال بُنے گئے کہ ڈائریکٹرایڈمن فریقِ مخالف کی زبان بولنے لگا۔وہ لیفٹیننٹ کرنل کی پوسٹ کا آدمی تھااور چیئرمین صاحب سے کچھ قرابت داری کا دعویدار بھی تھا۔کرنل صاحب کا ایک پرابلم یہ بھی تھا کہ میجر ثاقب میرا دوست تھا جو اُس کے نزدیک ناپسندیدہ آدمی تھا۔اُن دِنوں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ ڈائریکٹرایڈمن نے ایک سٹینو گرافر کی طویل رُخصت کی درخواست نامنظور کردی۔ جب میں نے اُنھیں بتایا کہ اُس کی والدہ شدید بیمار ہےاوراُسے ہرحال میں چھُٹی درکار ہےتو اُنھوں نے پہلے تو ایک جنگلی بِلّے کی طرح خوفناک انداز سے میری طرف دیکھااور پھر فرمایا کہ ’’یہ تمھارے دائرۂ اختیار سے باہر کی باتیں ہیں۔‘‘میں نے اُنھیں بتایا کہ آپ کوسِول کا تجربہ نہیں ہےاور نہ ہی آپ نے ابھی تک نیشنل انڈسٹریل ریلیشنز آرڈیننس کا مطالعہ کیا ہے لٰہذا محتاط رویّہ اپنائیں اورسٹاف کے منتخب نمائندے کو اِس کا واجبی احترام دینے کی کوشش کریں،لیکن بات اُن کی سمجھ میں نہ آئی۔

مَیں گراؤنڈفلور پراپنے دفتر میں واپس آیااوراپنے پراگندہ ذہن سے اگلی پلاننگ پرغورشروع کردیا۔اِس غوروخوض کا نتیجہ یہ نکلا کہ صبح 8 بجے میرے دیوہیکل دفتر کے فرسٹ فلور پر ڈائریکٹرایڈمن کے کمرے کے باہرسینکڑوں کارکن ٹریڈیونین کی روایتی نعرہ بازی میں مصروف تھے۔’’زندہ باد‘‘اور’’مردہ باد‘‘ کی صدائیں دورونزدیک سُنی جارہی تھیں ................. اوربس مسئلہ حل ہوچکا تھا،لیکن اِس سے میرے اعصاب پر یہ بات طاری ہوگئی کہ اگرآنے والے انتخابات میں میراپینل ہار گیاتو ناراض ایڈمنسٹریشن مجھے ضرورکوئی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچائے گی،لیکن سخت فیصلوں کے ایّام بھی یہی تھے۔

اُنھی دِنوں 16۔مئی،1995 کو میں اپنی سرتوڑکوششوں کے نتیجے میں واپڈامنسٹریل سٹاف کا ایک ملک گیر کنونشن منعقد کروانے میں کامیاب ہوگیا۔مَیں ہیڈکوارٹر سے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے لیبر ہال پہنچا۔کنونشن میں صوبہ سرحد کے وفد نے بھرپور نمائندگی کی تھی ۔اُن کے نمائندگان نے اپنے خیالات کا اظہارکرلیا تو پنجاب/لاہورکی طرف سے مجھے تقریر کی دعوت دی گئی۔جونہی سٹیج سے میرا نام پکارا

گیا تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا اور زبردست نعرے بازی شروع ہوگئی۔ میری تقریر کے دوران بار بار ''اصغر جاوید، زندہ باد'' کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ جب میں نے واپڈا کے مینیجنگ ڈائریکٹر کو مخاطب کر کے یہ کہا کہ ''کیا آپ اپنی بیوہ ماں کو چند ہزار روپے کے عِوض گھر سے دیس نکالا دے سکتے ہو'' تو حاضرین زبردست جذباتی ہوگئے۔ (اِس جملے کا اُن ایّام کے کسی خاص مشہور واقعے سے تعلق تھا، جو مَیں بھول چکا ہوں۔ لیکن میری ڈائری پر یہ جملہ موجود ہے)

اس کنونشن اور پھر اس میں میری جان دار تقریر نے میری ٹریڈ یونین کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی اور میں پاکستان بھر میں وائٹ کالر سٹاف کے ایک سچے نمائندے کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ اِس طرح کی صورتِ حال میں حاسدین کا جنم فطری بات تھی۔ ایڈمنسٹریشن کے سربراہ سے تو پہلے ہی بگاڑ چل رہا تھا، اب ٹریڈ یونین کے کچھ 'بڑوں' نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اگر یہ ہیرو بن گیا تو 'ہیرو ورشِپ' بھی ہوگی، لہٰذا اُنھوں نے مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس محاذ پر جنگ میرے لیے ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ تیسرا خوفناک محاذ یہ کُھلا کہ سی۔ بی۔ اے کی اُمیدوار مخالف یونین، جسے جماعتِ اسلامی کی زبردست حمایت حاصل تھی، درست طور پر اِس نتیجہ پر پہنچ چکی تھی کہ اگر اصغر علی جاوید کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو پھر لاہور ریجن میں اُن کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔ یہ گروپ لڑائی جھگڑے پر آمادہ رہتا تھا اور آتشیں اسلحے سے لیس رہنا ان کے لیے باعثِ عزت وتکریم تھا۔ اُن کے ایک 'بڑے' حافظ صاحب سے میرا زمانۂ طالبِ علمی سے کچھ تعلق تھا لیکن میں نے اُن سے کبھی رابطہ نہ کیا۔ ان میں ملک محمد یوسف نامی ایک ٹریڈ یونین رہنما البتہ میری غیر معمولی عزّت وتکریم کرتا تھا اور مجھے مؤدبانہ انداز میں ملتا تھا۔ آج بھی میرے دل میں اُس کے لیے بے پناہ محبت ہے۔

کچھ اِسی طرح کے حالات تھے کہ الیکشن کی تاریخ سر پر آ گئی۔ 1993 میں منتخب ہونے والے میرے سیکرٹری سیّد نسیم حسن شاہ کی کارکردگی انتہائی ناقص رہی تھی، اِس لیے میرے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ اِس بار (1995 میں) اُسے اپنے پینل میں نہیں لیا جائے گا۔ اِس فیصلہ نے بحرانی کیفیت میں اضافہ کر دیا اور نسیم شاہ نے، جو ایک بڑے agitator کے طور پر جانا جاتا تھا، میرے خلاف انتہائی خوفناک مہم شروع کر دی۔ اُس کا پروپیگنڈا میرے اعصاب پر سب سے کاری ضرب تھی کیوں کہ وہ میری

کردار کُشی سے بھی باز نہ آ رہا تھا۔ یہ نہایت مشکل ایّام تھے۔

**پھر حالات بدل گئے:** 26۔جون، الیکشن کی تاریخ تیزی سے قریب آ رہی تھی اور ضروری تھا کہ جلد از جلد فضا ساز گار کی جائے۔ لہٰذا میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ یہ پلان تیار کیا کہ وہ نسیم شاہ کو آج شام بسلسلہ الیکشن ایک میٹنگ چیئر کرنے کی درخواست کریں۔ اندھے کو آنکھیں مل رہی تھیں، وہ فوراً تیار ہو گیا اور مسلم لیگ ہاؤس ڈیوس روڈ کے عقب میں مقررہ جگہ اور وقت پر پہنچ گیا۔ پلان کے مطابق میں بھی وہاں پہنچ گیا جس سے اُسے دال میں کچھ کالا محسوس ہوا لیکن پھر بھی میرے ساتھیوں کا وار خالی نہ گیا۔ اُنھوں نے اُسے، اور بظاہر مجھے بھی، اِس بات پر قائل کر لیا کہ وہ سیکرٹری شپ سے دستبردار ہوتا ہے اور وہ میرے امیدوار کی حمایت کرے گا۔ البتہ میرا امیدوار (اصغر علی جاوید پینل) الیکشن جیت کر اپنی نشست سے مستعفی ہو جائے گا۔ اور پھر یہی ہوا کہ میرا پینل ایک بار پھر تمام چاروں نشستیں جیت گیا اور یوں ہم نے جیت کی ہیٹ ٹرک مکمل کر کے اپنی کمزور ہوتی خود اعتمادی میں زبردست اضافہ کر لیا۔

ڈیوس روڈ سے جب رات 12 بجے میں اور جاوید وِرک شیخوپورہ کے لیے روانہ ہوئے تو طوفانِ بادو باراں نے گھیر لیا۔ لاہور میں اِس طرح کی بارش میں نے شاید ہی پہلے کبھی دیکھی تھی۔ تیزی سے چلتے گاڑی کے وائپر اور دائیں بائیں سے ٹکراتی تیز روشنیاں تو اپنی جگہ تھیں جنھوں نے مجھے تقریباً اندھا کر رکھا تھا، اس پر مستزاد آسمانی بجلی کی چمک اور تیزی سے جھولتے درخت کچھ اِس طرح کا منظر بنا رہے تھے کہ جیسے آسمان سے اُترنے والی ہر بجلی ہم پر ہی گرے گی اور ہر درخت ہماری ہی گاڑی کو چکنا چور کرے گا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ جاوید وِرک گاڑی کے شیشوں سے کچھ اِس طرح باہر جھانک رہا ہے جیسے چیتا اپنے شکار پر حملہ آور ہونے سے پہلے۔ ''او چیئر مینا! کِدّے لگا جانا ایں؟'' اُس نے اِس قدر خوفناک لہجہ اپنایا جیسے بیلن میں آ گیا باز واَب کُچلا ہی جائے گا۔

''کیا ہوا ہے تمھیں، گھر نہیں جانا کیا''؟ میں نے جواب دیا۔

''اوئے ایہہ پُل کیہڑا ای؟ نالے شیخوپورہ لاہوروں لہندے بنّے وے، تُوں تے چڑھدے ول ٹُریا جانا ایں''؟ اُس نے اپنے ٹھیٹھ روایتی لہجے میں کہا۔

اِس اثناء میں ہم فورٹریس سٹیڈیم پہنچ چکے تھے۔ وہاں سے گاڑی واپس کی اور تقریباً 40 منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد رات ایک بجے ہم مال روڈ سے لوئر مال کی طرف مُڑنے میں کامیاب ہوئے۔ اُسے رات 2 بجے میں نے شیخوپورہ میں شیرانی روڈ پر اُس کے گھر اُتارا تو میں تقریباً نیم مردہ تھا۔ الیکشن سر پر تھا لہٰذا صبح 7 بجے پھر دفتر روانہ ہو گئے۔ اُس رات کی مہم جوئی ایک طویل مُدّت تک یاد رہی۔ وہ رات جب جب بھی یاد آتی رہی، جاوید وِرک مزے لے لے کر یہ ضرور گنگناتا رہا:

زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

26۔ جون، 1995 کو تقریباً 3 بجے نتیجے کا اعلان کیا گیا تو خوش وخرم کارکنوں کے جلو میں پروگرام کے مطابق ہم دربار حضرت علی ہجویریؒ پہنچ گئے۔ نمازِ ظہر کچھ تاخیر کے ساتھ مسجد علی ہجویریؒ میں ادا کی گئی۔ جلوس تو وہاں منتشر ہو گیا لیکن میں کچھ دوستوں کے ساتھ اسی طرح ہاروں میں لدا پھندا اپنی چھوٹی بہن کے ہاں آوٹ فال روڈ پہنچ گیا۔ وہاں ہم نے چائے پی؛ بہن اور اُس کے بچوں سے مبارک باد وصول کی اور پھر رات کو گھر لوٹ آیا۔

**ایک سچا خواب:** اِس الیکشن میں میرے مقابلے میں چیئر مین شِپ کا امیدوار ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا لیکن وہ میدانِ سیاست کا شہسوار ہرگز نہ تھا۔ میرے دوستوں نے متعدد بار مجھے مشورہ دیا کہ انھیں اِس بات کو ہائی لائٹ کرنے کی اجازت دی جائے کہ یہ ایک بے وفا اور عہد شکن شخص ہے اور اِسی اصغر علی جاوید کو کندھوں پہ اُٹھائے پھرتا رہا ہے، لیکن میں نے اُنھیں منع کر دیا۔ اِس میں مصلحت یہ تھی کہ اگر اُس کی پوزیشن زیادہ کمزور ہوتی نظر آتی تو فریقِ مخالف کوئی دوسرا امیدوار لے آتے جو اس سے بہتر پوزیشن میں ہوسکتا تھا۔ اہلِ لاہور عمومی طور پر وفادار لوگ ہیں لہٰذا اُنھوں نے میرے ہی ایک دیرینہ ساتھی کا میرے مقابلے میں الیکشن لڑنا پسند نہ کیا اور جماعتِ اسلامی کی واضح حمایت کے باوجود اُسے شکست سے دوچار کیا۔ میں یہ الیکشن 67% ووٹوں کی واضح برتری سے جیت گیا۔

الیکشن ہی کی شام یعنی 26۔ جون کو ہی یہ نوجوان بلاخوف، تنِ تنہا، بغیر کسی اطلاع کے میرے گھر پہنچ گیا۔ میری بیگم اُسے ذاتی طور پر جانتی تھی اور وہ الیکشن کے حالات سے بھی مکمّل آگاہی رکھے ہوئے تھی۔ ہنستی

مسکراتی اور مبارک بادیں وصول کرتی فرحت نے جب اُس نوجوان کو دیکھا تو اُس کا انداز بھوکی شیرنی کا سا بن گیا۔

''کدھر آیا ہے یہ؟ کیوں آیا ہے یہ یہاں؟؟''

اُس نے گیراج میں کھڑے ہی باآوازِ بلند مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں بالائی پورشن میں تھا اور ظاہر ہے فرحت گیٹ کے سامنے گراؤنڈ فلور پر۔ مَیں نے اُسے آہستہ سی آواز میں کہا کہ اطمنان کر لو کہ وہ نیک نیتی سے آیا ہے۔ جونہی مَیں نے یہ جملہ ادا کیا تو نوجوان نے بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ میں ایک منٹ تو بالائی حِصّہ سے یہ منظر دیکھتا رہا اور پھر اُسے اُوپر بلا لیا۔

میرا دیرینہ اور بہترین دوست، جو اُس روز بدترین دشمن کا کردار ادا کر چکا تھا، روتا نہ رہا بلکہ بین کرتا رہا، بادی النظر میں اپنی ہار پر نہیں بلکہ اِس پچھتاوے پر کہ اُس نے میرے خلاف الیکشن کیوں لڑا............ لیکن یہ صرف میرا خیال ہے ................ میرا ذاتی خیال، ورنہ ڈاکٹر جاوید اقبال اور میجر ثاقب نے تو یہ کہا کہ اگر وہ جیت جاتا تو پھر بھی روتا ہوا اصغر علی جاوید کے گھر جاتا؟

یہ سب کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے چند روز پہلے خواب میں دکھا دیا تھا۔ اِس واقعہ کے بعد جب میرے عزیز دوست نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی، مَیں نے اُسے سچے دل سے معاف کر دیا لیکن وہ کبھی بھی ماضی کی طرح میرے قریب نہ ہو سکا۔ میرا رویّہ تو بقولِ شاعر یہ رہا:

کوئی احترام بھی تھا ، کہیں پسِ دشمنی
میں اِسی لیے کبھی کُھل کے وار کر نہ سکا

**ٹریڈ یونین سے کچھ دُوری:** ایسے لگتا ہے کہ اس الیکشن کے بعد، قلم کتاب سے میری دلچسپی بڑھنے کی وجہ سے ٹریڈ یونین میں میری دلچسپی کم ہونے لگی تھی۔ اب مَیں اپنے لیے نہیں بلکہ پسے ہوئے کم تنخواہ دار اور مظلوم طبقے کے لیے اس روگ کو پالے ہوئے تھا۔ میری 1997 کی ڈائری پر 9۔ جون کے صفحہ پر، جس روز ہمارے الیکشن تھے، بس اِتنا ہی لکھا ہوا ہے:

مکمّل جیت، الحمدُ للہ

اور ظاہر ہے مکمّل جیت سے مراد چاروں نشستوں کا جیت جانا ہی تھا البتہ 15۔جون کے صفحہ پر کچھ ریمارکس یہ بتا رہے ہیں کہ اِس بار میرے ووٹوں کی تعداد ماضی کی طرح 67% نہیں بلکہ کم تھی، البتہ میری ذاتی سیٹ، سربراہ پینل، اُسی طرح واضح اکثریت سے جیتی گئی۔

**واپڈا میں پہلا ریفرنڈم:** 29۔دسمبر، 1997 کو پاکستان کی ٹریڈ یونین تاریخ کے سب سے بڑے اور واپڈا میں پہلے سی۔بی۔اے ریفرنڈم کا انعقاد ہوا۔ اِس ریفرنڈم میں ہماری ہائیڈرو الیکٹرک سنٹرل لیبر یونین کو تقریباً 54,000 اور مخالف پیغام یونین کو تقریباً چالیس ہزار ووٹ ملے۔ ہماری یونین کی یہ لیڈ میرے، اور مرکزی سیکرٹری جنرل جناب خورشید احمد خاں کے اندازے سے بہت کم تھی۔ سو اُن جیت کے ایّام میں جہاں عام کارکن بھنگڑے ڈال رہے تھے، وہاں کچھ سنجیدہ لوگوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اس ریفرنڈم میں میرے پولنگ اسٹیشن کا نتیجہ یہ رہا:

ہماری ہائیڈرو الیکٹرک یونین: 330

مخالف پیغام یونین: 170

مَیں اُمید کر رہا تھا کہ ملک بھر سے اِسی طرح کے نتائج موصول ہوں گے، لیکن کچھ کمزور پالیسیوں کی وجہ سے متوقع تعداد میں ووٹ نہ ملے۔ اُس شام ایک دانش ور سینئر افسر نے مجھے مبارک باد کا فون کیا تو ساتھ یوں حیرت و استعجاب کا مظاہرہ بھی کیا:

''یار! یہ لوگ اِتنے ووٹ کیسے لے گئے؟'' یعنی مخالف یونین۔

**اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی:** 'عورت، مغرب اور اِسلام' کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد میری پہچان ایک قلم کار کی حیثیت سے بھی بن چکی تھی۔ اخباری کالمز اور پھر افسانوی مجموعے کی اشاعت کے بعد یہ حوالہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ ایک روز میجر ثاقب سے گپ شپ کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس گیا تو وہاں میرے ایک رفیقِ کار مقبول نور کے ساتھ ایک انجانی بزرگ شخصیت بھی موجود تھی۔ مَیں ابھی اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ دفتر کے تیسرے فلور سے آئے میرے رفیقِ کار نے اُس بزرگ کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ انھیں آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا، اگر وقت ہے تو کچھ بات چیت کر لیں۔

''ویلکم سر، ویلکم۔حکم کیجئے ، کیا خدمت ہے میرے لائق ؟''مَیں نے بزرگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہنے لگے:

''میرا نام اعجاز نصر اللہ ہے۔ بیرسٹر ہوں اور لندن میں پریکٹس کرتا ہوں ۔ پاکستان کے پہلے وزیرِ خارجہ اور حضرت قائدِ اعظمؒ کے معتمد ساتھی سر ظفر اللہ خاں میرے چچا تھے۔ کچھ ایّام کے لیے پاکستان آیا ہوں ۔مقبول نور نے آپ کا ذکر بہت محبّت اور احترام کے ساتھ کیا اور آپ کی ہمہ جہت شخصیت کی بہت تعریف کی ۔مَیں نے سوچا، آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرلیا جائے۔''

مقبول نور چونکہ احمدی تھا اور آنے والے معزز مہمان بیرسٹر اعجاز نصر اللہ، سر ظفر اللہ خاں کے بھتیجے تھے، اِس لیے مَیں نے خود کو مرزائیت پر گفتگو کے لیے ذہنی طور پر تیار کرلیا۔ دوسرا کام مجھے یہ سوجھا کہ مَیں اُنھیں میجر ثاقب کے کمرے میں لے گیا تا کہ مجھ پر اگر کوئی غیر متوقع کاری وار ہوتا ہے تو میجر ثاقب کی ذہانت اور خداداد صلاحیت میرے کام آئے اور میری علمی بے بضاعتی کہیں مجھے رُسوا نہ کر دے۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس 6 فٹ سے زائد کا لمبا تڑنگا 71 سالہ بیرسٹر خوب صورت انگریزی میں انتہائی باوقار طریقے سے گفتگو کر رہا تھا۔ ثاقب نے 5th فلور سے فہیم کو بھی بلا کر شریکِ گفتگو کرلیا۔ فہیم کے بارے اب بس اِتنا یاد ہے کہ وہ اُن دِنوں ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

میر سے اقبال تک اور سر ونسٹن چرچل سے سر ظفر اللہ خاں تک، بیرسٹر اعجاز نے اِتنی جاندار اور جامع گفتگو کی کہ وہ مجھے موبائل انسائیکلو پیڈیا محسوس ہونے لگا۔

''سر! اپنی جماعت کے اغراض و مقاصد کے بارے بھی کچھ کہیں گے؟'' نو جوان فہیم نے غیر ضروری سوال کر دیا۔

''آپ تحریکِ احمدیہ کی بات کر رہے ہیں؟'' بیرسٹر اعجاز نے جواباً استفسار کیا۔

''جی سر!''

''برخوردار! یہ تو ایک تحریک ہے۔ اسلام کی سر بلندی کے لیے، جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نام کی عظمت کے لیے۔''

''کچھ ختمِ نبوت کے بارے میں ارشاد فرمائیے۔''مَیں نے سوال کیا۔

’’ہر مسلمان کی طرح ہم بھی قائل ہیں جی اِس کے۔‘‘

’’تو پھر.................. پھر یہ.....................‘‘ اور میجر ثاقب نے اپنی انگشتِ شہادت ہونٹوں کو چھوتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

’’کہنے دیں اِنھیں میجر صاحب، کہنے دیں، بولنے دیں انھیں.................. انھیں ملنے کے لیے ہی تو آج حاضر ہوا تھا۔‘‘ بیرسٹر اعجاز نے کہا۔

’’سر! اِس جگہ پر ہم جس طرح کی گفتگو کر سکتے تھے، وہ سیر حاصل ہو گئی۔‘‘ میجر ثاقب نے جواب دیا۔

بیرسٹر اعجاز میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ وہ آج میرے لیے ایک کتاب تحفہ کے طور پر لائے ہیں اور اس کتاب کا نام ہے ’خاتم النبیین‘ یہ سر ظفر اللہ خاں کی تصنیف ہے، اور شاید یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حضرت قائدِ اعظمؒ کے معتمد دیرینہ ساتھی کی یہ کتاب پاکستان میں دستیاب نہیں ہے کیونکہ یہاں ہماری کُتب کی خرید و فروخت ممنوع ہے۔

’’جی، میرے علم میں ہے جی۔‘‘ مَیں نے لقمہ دیا۔

اُنھوں نے اپنے بیگ سے کتاب نکالی اور میرے حوالے کر دی۔ کتاب کا نام تھا:

MUHAMMAD

Seal of The Prophets

مَیں نے کتاب کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا بل کہ ایک نقاد کی طرح اسے بین السطور دیکھا۔ میرے من میں تھا کہ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی ’چوری‘ ضرور ملے گی لیکن یہ کہیں نظر نہ آئی یا شاید میرے جیسا کم فہم آدمی وہاں تک پہنچ ہی نہ سکا۔ جن دِنوں میں سیرت النبیؐ پر اپنی صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب پر کام کر رہا تھا تو زیرِ نظر کتاب ایک بار پھر میرے زیرِ مطالعہ آئی۔ مَیں پہلے ہی کی طرح اس سے محظوظ ہوا اور عمدہ معلومات حاصل ہوئیں۔ آج رُبع صدی کے بعد یہ کتاب تیسری بار میرے سامنے ہے اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ حضرتِ انسان کس بے دردی اور بے رحمی سے اپنے ہی ہاتھوں اپنے اعمالِ صالحہ کو دریا بُرد کر دیتا ہے، حقیر اور بے کار دُنیا کے لیے۔ یہ تلخابہٗ احساس کبھی کبھی تو مجھے مار ہی ڈالتا ہے۔

اُس روز ہم پانچ لوگوں کی طویل نشست ہوئی۔ ہم میں صرف بیرسٹر اعجاز ہی تھے جنھوں نے ہر بار محبوبِ

خدا حضرت محمدؐ کے نام مبارک کے ساتھ ہر بار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پڑھا، ورنہ باقی تمام غفلت کرتے رہے اور کبھی کبھار ہی درود پڑھتے رہے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ لوگ سیاسی مجبوریوں اور دُنیاوی طمع ولالچ کو قربان کر کے باللّسان اور بالقلب ہمارے آقا و مولاؐ کو اللہ کا آخری نبی اور نجات دہندہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور یوں یہ دُنیا کا واحد گروہ ہیں جو Muslim اور Non Muslim کے دونوں بڑے خانوں میں فِٹ نہیں ہو پائے اور دُنیا بھر کے مسلمان انھیں حقارت سے Not Muslim کے ناپسندیدہ نام سے یاد کرتے ہیں۔کیا خوب فرمایا ہمارے خالق و پروردِگار نے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ (63:6)

**تحقیق عمرِ عائشہ صدیقہؓ:** اُمُّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بوقتِ نکاح اور رخصتی، عمرِ مبارک پر ہمارے کچھ 'بڑوں' نے جو غیر ذمہ دارانہ رویّہ اپنایا ہے، اُس پر ہمیشہ دل خون کے آنسو روتا رہا ہے۔اِس طرح کی کوئی حرکت اگر جناب عمرؓ بن خطاب کے عہد میں ہوتی تو آپ ان 'بڑوں' کے سر اُڑانے کا حکم دے دیتے،لیکن ہم ہیں کہ بڑی ڈھٹائی اور تسلسل سے عالمِ اسلام کی سب سے بڑی عالمہ، اُمُ المومنین، زوجۂ مطہّرہ اور محبوبہءِ محبوبِ خدا کی ذاتِ پاک کے حوالے سے بے سروپا اُڑائے جارہے ہیں۔

جن دِنوں مَیں ملعون سلمان رُشدی کی ہرزہ سرائیوں پر کام کر رہا تھا، جو 'عورت، مغرب اور اِسلام' کے عنوان سے شائع ہوا تو مَیں نے صرف علامہ محمد بن سعد کے الفاظ نقل کر دیے جو ابوعبیدہؓ سے روایت تھے۔میرا موضوع چونکہ نبیِؐ رحمت کے نکاحوں کی ضرورت اور جواز تھا لہٰذا میں نے بھی سیّدہ صدیقہؓ کی عمرِ مبارک پر تحقیق پر کوئی توجہ نہ دی۔اب جبکہ مَیں نے رحمت اللعالمین نبیﷺ کی پوری حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ شروع کیا تو اِس مقام پر میں ہمیشہ ہی اٹکتا رہا کہ آخر 9 سال کی ایک لڑکی کو انسانیت کے سب سے بڑے معلّم نے کس طرح اپنی زوجیت میں لے لیا، پھر وہ لڑکی اپنے عہد کے ایک نام ور دانش ور، صاحبِ ثروت اور صاحبِ توقیر انسان کی بیٹی بھی ہو۔میں اکثر اِس بات پر ذہن کی پراگندگی کا شکار ہو جاتا کہ جن مستشرقین نے ہمارے آقا و مولاؐ کی ذاتِ پاک کو ہدفِ تنقید بنایا ہے، اُنھوں نے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے۔آخر یہ کیوں اور کیسے ہو گیا!

ایک روز میرے دفتر میں بیرسٹر اعجاز ہی کی طرح لمبے تڑنگے، خوب صورت، سفید شلوار قمیض میں ملبوس ایک باوقار صاحب تشریف لائے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اُنھیں لیسکو ہیڈکوارٹر میں کیا کام تھا یا کوئی کام تھا بھی یا نہیں۔ بہر حال میں اُن کے احترام میں کھڑا ہوا۔ اُنھوں نے مشفقانہ انداز میں مصافحہ کیا اور فرمایا ''عبدالرّسول۔''

''تشریف رکھیں۔'' مَیں نے مؤدبانہ لہجے میں عرض کی۔ اور ایک لمحہ کے لیے مَیں ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہوگیا۔ نام تو سُنا ہوا ہے۔ پھر یہ نام کامن بھی نہیں ............ منفرد سا، علیحدہ سا ...... ...... کسی عاشقِ رسولؐ باپ کا رکھا ہوا نام ................ اور ہاں یاد آیا، زمانہ طالبِ علمی میں تحریکِ پاکستان پر ایک کتاب پڑھا کرتے تھے، اُس کتاب کے مصنف کا نام بھی عبدالرّسول تھا اور مَیں نے یہ پوچھنے سے پہلے کہ وہ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں، اُن سے اس کتاب اور منفرد نام کا ذکر کر ہی دیا۔

''سر! تحریکِ پاکستان پر ایک بڑی مقبول کتاب کے مصنّف بھی آپ کے ہم نام ہیں............ پروفیسر صاحبزادہ عبدالرّسول صاحب۔''

''جی، مَیں وہی ہوں ............ آج کل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور کا چیئرمین ہوں''۔ مَیں کُرسی سے دوبارہ کھڑا ہوگیا؛ اُنھیں سلیوٹ کیا؛ وہ بھی کھڑے ہوگئے اور فرمانے لگے کہ بچّے باہر گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ دیکھو گرمی کا کیا عالم ہے ............ آپ کے لیے یہ کتاب لایا ہوں ............ میرا خیال یہ ہے کہ آپ اس کے بہتر مستحق ہیں۔'' اُنھوں نے میرے ہاتھ میں کتاب دی اور زوردار مصافحہ کرتے ہوئے جلدی سے رخصت ہوگئے۔ اُنھوں نے سادہ پانی کا گلاس بھی پینا گوارا نہ کیا۔

کتاب کی جِلد پر چَھپا تھا:

''کَشْفُ الْغُمَّۃ عَنْ عُمُرِ اُمِّ الْاُمَّۃؓ''

یعنی

تحقیقِ عمر عائشہ صدیقہؓ

تصنیف: حکیم نیاز احمد

ناشر: مشکور اکیڈمی کراچی

اندرونی ٹائٹل پر ایک طرف لکھا تھا:

''ہدیہ من عبدالستار آزاد اِلیٰ الشیخ صاحبزادہ عبدالرّسول صاحب

ثُمَّ مِنّی اِلیٰ علامہ اصغر علی جاوید صاحب۔

عبدالرّسول

بڑے سائز کے 404 + 192 = 596 صفحات کی ضخامت کی یہ کتاب ............

سبحان اللہ ............ صرف ایک تنقیح کہ کیا سیّدہ عائشہ صدیقہؓ کی رُخصتی کے وقت اُن کی عمرِ پاک 9 سال تھی؟ ............ نہیں، ہرگز نہیں تھی۔

کیا عرق ریزی ہے! ............ کیا معیار ہے محبت کا! کیا سرمایہ ہے آخرت کا! حکیم نیاز احمد! کس لمحے نظرِ کرم پڑ گئی آقاؐ کی آپ پر۔ اُن لمحوں کو سلام ............ آپ کے مقدر کو سلام۔ اللہ جنت میں آپ کے درجات بلند فرمائے۔

اِس کتاب سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ میں نے کئی بار عقیدت سے اِسے چوما ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ مجھے Satanic Verses کی طلب تھی تو پروفیسر ناصر رانا میرے پاس کیوں تشریف لے آئے، ہم تو ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے اور پھر جب سیّدہ عائشہ صدیقہؓ کی عُمرِ پاک پر تحقیق کی ضرورت تھی تو کس نے پروفیسر عبدالرّسول صاحب سے یہ کہا کہ یہ کتاب اصغر علی جاوید کو دے آئیں، ایک حقیر اور ناچیز شخص کو! میں بعض اوقات مفروضے قائم تو کرتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ میری کم فہمی کے سِوا کچھ نہیں۔

**سورۃ القدر کی تفسیر:** یہ اوائل 1997 کی بات ہے میرے دیرینہ دوست اور ایل۔ایل۔بی کے کلاس فیلو چوہدری محمد عبداللہ ایڈووکیٹ نے مجھے نہایت ہی تحیّر کے ساتھ یہ بتایا کہ کل رات اُن کے چچا حاجی محمد نواز ایم پی اے (سابق ضلعی صدر پاکستان مسلم لیگ ن) کے ہاں ٹھہرے ایک مہمان کے ساتھ بڑا عجیب معاملہ ہوا۔ اچانک اُس کے اِردگرد کرنسی نوٹوں کی بارش ہوگئی اور یہ سلسلہ کئی منٹوں تک جاری رہا۔ چوہدری صاحب نے بتایا کہ برسنے والے کرنسی نوٹ کروڑوں میں تھے۔ اِس خبر پر

مَیں نے کسی غیر متوقع ردِ فعل کا مظاہرہ نہ کیا چونکہ وہ زود رنج شخص ہیں اور میرے کسی جواب پر وہ ناراض ہو سکتے تھے۔

''کہو کچھ اِس پر'' چوہدری صاحب نے کہا۔

''کیا کہوں، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے'' میں نے جواب دیا۔

''مَیں نے سُنا ہے کہ اُس مہمان کا کسی زمانے کا آپ سے بھی تعلق ہے'' اُنھوں نے نئی بات کر دی۔

''اچھا کیا نام ہے اُن کا''؟ میں نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

''سیّد عبدالمنّان شاہ'' (یہ اصل نام نہیں ہے) ............ شاید ٹیچر ہیں یا ویسے ہی محکمہ تعلیم کے ملازم ہیں۔''

چوہدری صاحب نے شکل و شباہت کا ذکر کیا تو میرے ذہن میں ایک خاکہ اُبھرا کہ ہاں جب مَیں اور میرے والد مرحوم سِول کوارٹرز روڈ پر محنت مزدوری کیا کرتے تھے تو ساتھ والی دُکان پر شام کے وقت ایک نوجوان سکول ماسٹر آ کر بیٹھا کرتا تھا۔ دُکان والے مرزا صاحب کے ساتھ اُس کا کوئی رشتہ تو نہ تھا لیکن وہاں اُس کی دوستی بہت مضبوط تھی۔ گرمیوں میں وہ وہیں سو رہتا اور سرما میں مرزا صاحب اُسے اپنے گھر لے جاتے۔ اِس طرح وہ سیّد زادہ سکول ماسٹر مرزا صاحب کی فیملی کا ہی رُکن سمجھا جاتا تھا۔ دُکان کے تقریباً بالمقابل ایک بہت بڑی مسجد ہے اور اس سے ملحقہ ایک دینی مدرسہ بھی ہے، جس کا افتتاح جنرل محمد ضیاء الحق نے کیا تھا جو گیارہ برس سے زائد کی مُدّت تک پاکستان کا حکمران بلاشرکتِ غیرے اور صدر بالجبر بھی بنا رہا۔ نوجوان ٹیچر کبھی اس مسجد کو بھی اپنا مسکن بنا لیتا اور صبح و شام اِس مسجد کے خادم کا کردار بھی ادا کرتا رہا۔ اکثر اُسے جائے وضو اور مسجد کے صحن کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ اُس کا نام عبدالمنّان ہی تھا۔

کوئی پندرہ برس سے میرا اُس کا کوئی رابطہ نہ تھا اور اگر کہیں سرِ راہ ملاقات ہو بھی جاتی تو رسمی سلام دُعا سے آگے کبھی بات نہ بڑھی۔ چوہدری عبداللہ صاحب کی پُرتجسّس گفتگو کے بعد مَیں نے سیّد عبدالمنّان سے رابطے کا فیصلہ کر لیا اور اگلے روز مرزا صاحب کی دُکان پر پہنچ گیا۔ مرزا صاحب نے مجھے دیکھتے ہی ریفری اورٹن کی طرح فضا میں ہاتھ بلند کیے اور بسم اللہ کہتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ مَیں نے آمدن برمطلب کے مصداق فوراً مدعا بیان کیا تو کہنے لگے کہ وہ آج کل زیادہ وقت جُھگیاں (حاجی محمد نواز

(1) یہ اصل نام نہیں ہے

صاحب MPA کی آبادی) میں گزارتے ہیں۔البتہ آئیں گے تو اُنھیں آپ کا پیغام دے دوں گا۔

چند روز بعد سیّد عبدالمنّان میرے گھر پہنچ گئے۔ ابّا جی سے گپ شپ ہوئی۔ بھٹو کے خلاف تحریک کے دوران روڈ پر جو بیٹھک ہوتی تھی، اُس کا ذکر ہوا۔ کچھ حالاتِ دیگراں پر بات چیت ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہ عبدالمنّان نہیں ہے جو ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتا تھا اور بعض اوقات لطیفہ گوئی بھی۔ اب وہ ایک کم گو، دراز ریش اور انتہائی سنجیدہ انسان تھا۔ تجدیدِ روابط کے چند ہی ایّام میں یہ بھی کُھلا کہ اس کی باڈی لینگویج 'عاماں' والی نہیں ہے۔

وہ دسمبر کی ایک ٹھٹھرتی شام تھی کہ سیّد عبدالمنّان ایک بڑی چادر کی بُکلّ مارے میرے گھر کی کال بیل دبا رہے تھے۔ کھانے کا وقت تھا، سو ہم نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کچھ گپ شپ ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ طبیعت کی ناسازی یا شاید کسی دوسری وجہ سے گاؤں واپس جانے کے موڈ میں نہ تھے اور آج شب وہ میرے ہاں ہی ٹھہریں گے۔ اُس رات میں نے کافی دیر تک کافی کوشش کی کہ باتوں باتوں میں کوئی خاص بات سامنے آجائے لیکن ناکام ہی رہا۔

عجیب معاملہ ہے کہ جب سخن داں خاموش ہوجانے کے سوا کوئی چارہ نہیں پاتا تو پھر ایسے آوازے اُٹھتے ہیں کہ سخن ورانِ عہد چیزوں کو redefine کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خردمند انگشت بدنداں ہوتا ہے تو خرد کے باغی کا پہلا قدم اُٹھتا ہے۔ وہ ملامتی کہلانا پسند کرتا ہے لیکن عقل کے قابو میں نہیں آتا۔ وہ شمس کی طرح کھال اُتروا لیتا ہے، منصور کی طرح سُوئے مقتل چل نکلتا ہے اور حُسین لاہوری کی طرح داڑھی منڈوا لیتا ہے لیکن مجال ہے کہ راز زبان پر لائے۔

سیّد زادے کو بھی شعبدہ باز، جادوگر اور ڈرامہ باز کہا گیا۔ کہنے والوں نے ولیِ کامل اور خدا شناس بھی کہا۔ سچ کیا ہے، اللہ کے سِوا کوئی نہیں جانتا۔ اُس رات بھی یہ شعبدہ یا کرامت، جسے سیّد عبدالمنّان امتحان کہتا ہے، پوری شدت سے دیکھنے کو ملا۔ ہُوا یوں کہ رات تقریباً 2 بجے جب یخ بستگی اپنے عروج پہ تھی اُس نے میرے کمرے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا اور ''اُٹھو اُٹھو'' کی آوازیں بھی دیں۔ ہم میاں بیوی گھبرا کر اُٹھے تو دیکھا کہ وہ دروازے کے سامنے تقریباً حواس باختہ کھڑا ہے۔

''کیا ہُوا شاہ جی؟'' مَیں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''مجھے پانی پلاؤ، جلدی کرو، پانی پلاؤ مجھے'' جواب ملا۔

مَیں نے اُسے دروازے کے ساتھ پڑی کُرسی پر بٹھایا اور میری بیوی نے اُسے پانی کا گلاس پکڑا دیا۔

''اور لاؤ، جلدی کرو۔'' شدید سردی میں اُس نے دوسرے گلاس کا مطالبہ کر دیا۔ پھر تیسرے، چوتھے اور پانچویں گلاس کا۔ حتیٰ کہ ہم نے مزید پانی دینے سے انکار کر دیا۔ وہ پانی پی نہیں رہا تھا بلکہ حلق کے اندر انڈیل رہا تھا اور آدھا پانی اپنے کپڑوں پہ گرا رہا تھا۔ میں نے اُس کی ابنارمل حالت کو دیکھتے ہوئے پوری کوشش کی کہ وہ اُٹھ کر اپنے بستر پہ چلا جائے لیکن ہم اُسے بال برابر بھی ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کوئی نصف گھنٹہ دسمبر کی برفیلی رات میں ٹھٹھرنے کے بعد سیّد زادہ کرسی سے اُٹھ کر اپنے بستر کی طرف بڑھنے لگا۔ جونہی اُس نے پہلا قدم اُٹھایا تو اُس کے پاؤں کے ساتھ ہزار ہزار والے کرنسی نوٹوں کی لائن لگ گئی۔ وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا اور اُس کے ہر اُٹھتے قدم کے ساتھ انتہائی قرینے اور ترتیب سے نوٹوں کی لائن لگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں پہنچا تو اُس کے پیچھے نوٹوں کی بالترتیب دو سطریں موجود تھیں۔ ہم میاں بیوی نے نوٹ اکٹھے کیے اور اُس کے کمرے میں ڈھیر کر دیے۔ صبح ہم نے نوٹوں کی دفتریاں بنائیں اور وہ دو کروڑ روپے ایک الماری میں محفوظ کر دیے۔ دوپہر کو عبدالمنان شاہ کی رُخصتی کے وقت مَیں نے اُسے امانت ساتھ لے جانے کا کہا تو کہنے لگا کہ ''رکھ لو، کام آئیں گے۔''

''میرے پاس تو پہلے ہی میری ضروریات سے زائد موجود ہے، مَیں اِن کا کیا کروں گا۔'' میں نے عاجزی سے جواب دیا۔

چند ایّام کے بعد سیّد زادہ ایک دوست کے ساتھ میرے گھر آیا اور اپنی امانت لے گیا۔ کل جو مَیں نے چوہدری عبداللہ صاحب سے سُنا تھا اب میں نے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ میں نے زندگی بھر اپنے تحیُّر کی اِس انتہا کا اگر کسی سے ذکر کیا بھی تو سُننے والے نے معنی خیز اور طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ردِّ فعل کا اظہار کیا اور میرے حصّے میں ندامت ہی آئی۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ یہ اُسی سال کا واقعہ ہے یا اُس سے اگلے سال کا کہ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب مجھے عبدالمنّان شاہ کا فون آیا اور اُس نے کچھ ذو معنی سی گفتگو کرتے ہوئے کہا

کہ ''چلو آج تمھیں خانہ کعبہ اور روضۂ رسولؐ کی سیر کرائیں۔''میں نے حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوئے استفسار کیا کہ'' آج اور ابھی؟ یہ کیسے ممکن ہے؟؟'' کہنے لگا کہ''تم نے ریلوے روڈ پر چوہدری احمد حسن ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کا گھر دیکھا ہے؟''

''نہیں تو،لیکن پوچھ لوں گا ............... یا آپ سمجھا دیں۔''میں نے جواب دیا۔

وہ بڑا آسان ایڈریس تھا۔ میں نے گھر میں ہی نمازِ عشاء ادا کی اور حسبِ ہدایت فوراً چوہدری صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ ایک بڑے تہہ خانے میں کئی درجن افراد کے جمگھٹے میں عبدالمنّان موجود تھا۔ سلام عرض کرنے کے بعد مَیں بھی دیگر حاضرین کی طرح خاموش اور مؤدبانہ بیٹھ گیا۔ کچھ لمحات کے بعد اُس نے میزبان کو ہدایت کی کہ اب اس مقام پر آنا جانا بند کر دیا جائے۔ اُس نے حاضرین سے بھی کہا کہ اگر کوئی رُخصت ہونا چاہتا ہے تو ابھی چلا جائے، دورانِ ذکر یہ مشکل ہو جائے گا۔ ازاں بعد اُس نے حاضرین کو ہدایت کی کہ وہ جو کچھ ذکر کرے، سب اُس کے ساتھ با آوازِ بلند پڑھتے جائیں۔ اُس نے کہا''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔'' حاضرین نے اُس کے ہم آواز ہو کر بسم اللہ کا وِرد شروع کر دیا۔ ازاں بعد اُس نے درودِ پاک اور پھر مختلف اسمائے حسنیٰ کا وِرد کرایا۔ جب سیّد زادے نے''استغفر اللہ'' کا وِرد شروع کرایا تو تب تک حاضرین پر ایک خوف کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ نیم روشن تہہ خانے میں ہمارے درمیان ایک ان دیکھی مخلوق نشست میں شامل ہو رہی تھی۔ اُن کی تعداد اِتنی زیادہ تھی کہ ہر کسی نے یہ محسوس کر لیا کہ کوئی اُس کے ساتھ بیٹھنے کو جگہ بنا رہا ہے۔ اب حالت یہ تھی کہ ٹیم کی کمان، کپتان کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ چیخ و پکار ایسی کہ سُنی نہیں جا رہی تھی۔ ہم لوگ اللہ کے بالکل سامنے اور قریب تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری حالت دیکھ رہے تھے۔ اندر بھی وہی تھے، باہر بھی وہی تھے۔ ہر قلب پر اللہ پاک یہ نازل کر چکے تھے کہ 'مانگ لو، جو جی چاہتا ہے مانگ لو' اور مانگو کھل کے مانگو، یہ عطا کی ساعت ہے، فائدہ اُٹھا لو۔ لیکن ایسے میں دُنیا کسے سُوجھتی؟............ اگر میں؟''اَللّٰھُمَّ اِنَّكَ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّی، فَاعْفُ عَنِّی، یَا غَفُوْرُ'' پکار رہا تھا تو یقیناً دوسرے بھی اپنے اپنے انداز میں اُس معاف اور درگزر کرنے والے کو پکار رہے ہوں گے۔

اچانک چھت کی طرف سے ایک تیز روشنی ایک آواز کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر حاضرین

کی چیخیں نکل گئیں۔اُس روشنی میں کس نے کیا دیکھا، یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے،لیکن 'تَنَزَّلُ الْمَلَآئِکَۃُ وَالرُّوحُ' کی عملی تفسیر ہر کسی نے ضرور دیکھ لی تھی۔

سیّدعبدالمنّان شاہ سے کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ہے لیکن نہ جانے اب وہ روحانی معاملات پہ گفتگو کرنا کیوں پسند نہیں کرتا۔

## الیاس گھمن اور سیرت النبیؐ

**پہلی قسط، 1998:** یہ 1995 کے خزاں کی بات ہے کہ میرے دفتر میں اپنے ایک کام کے سلسلے میں الیاس گھمن صاحب تشریف لائے جنھیں میں نہیں جانتا تھا۔مَیں مصروف تھا لہٰذا مَیں نے اُنھیں کچھ دیر انتظار کرنے کا کہا۔ یاد نہیں، میری میز پہ کوئی افسانوی مجموعہ کیوں پڑا تھا، جس پر اُن کی نظر پڑی اور اُنھوں نے استفسار کیا کہ کیا میری لٹریچر سے بھی کوئی دلچسپی ہے۔ میں نے بتایا کہ بہت زیادہ دلچسپی ہے اور میرا اپنا بھی ایک مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔ یہ سُنتے ہی اُنھوں نے اپنا تعارف کرایا کہ ''مَیں الیاس گھمن ہوں ............ ایس ڈی او، سٹریٹ لائٹ سب ڈویژن شالامار ............ ملازمت کے ساتھ ساتھ دو پنجابی پرچے بھی نکالتا ہوں اور کئی ایک ٹائٹل میرے کریڈٹ پر ہیں۔''

''میرے پاس کیسے تشریف آوری ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''آیا تے اپنی فائل واسطے ساں پر لے کے کجھ ہور جاواں گا، ربّ نوں منظور ہوئیا تے۔'' الیاس گھمن نے جواب دیا۔

''جی آپ حکم کریں۔ میرے لائق کیا خدمت ہے؟''

الیاس گھمن نے مختصراً اپنے آنے کا مقصد بتایا۔مَیں نے اُن کی فائل پر نوٹنگ کی اور پھر ادب پر گفتگو شروع ہو گئی۔ اِس پہلی ہی ملاقات نے دوستی کے اٹوٹ رشتے کو جنم دیا۔ وہ چونکہ پنجابی سیوک ہیں لہٰذا اُنھوں نے آہستہ آہستہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ مجھے پنجابی بھی لکھنی چاہیے۔اُن کے اصرار کے نتیجے میں 1996 میں اُن کے ورھے وار 'ساہت' میں میرا پہلا پنجابی افسانہ شائع ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد نجانے اُن کے مَن میں کیا آیا کہ ایک روز کہنے لگے کہ ''ہمارے مہینہ وار 'رویل' میں دینی ادب پر کوئی کام نہیں

ہو رہا۔ مجھے ایک ایسے قلم کار کی تلاش ہے جس کی دین سے بھی دلچسپی ہو اور پنجابی سے بھی۔ مَیں بڑی سوچ بچار کے بعد اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ کام آپ کر سکتے ہیں، لہٰذا بسمِ اللہ کریں اور سیرت النّبیؐ سے ابتداء کریں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہو بھائی؟............ مجھے پنجابی آتی ہے نہ سیرت النّبیؐ کا مطالعہ ہے۔''

''مَیں ٹھیک آکھ رہیا ہاں، ایہہ کم تُسیں ای کرو گے ............ پنجابی آوندی نہیں تے فیر بول کِویں رئے او؟''

الیاس گھمن یوں اصرار کر رہے تھے کہ جیسے میرے انکار پر اُن کا کوئی نا قابلِ تلافی نقصان ہو جائے گا۔ مَیں نے اُس عہد کے کچھ بڑے پنجابی سیوکوں کے نام لے کر اُنھیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ کام اُن بڑے لوگوں کے کرنے کا ہے لیکن وہ بضد تھے کہ 'رویل' کے لیے پنجابی میں سیرت نگاری مجھے ہی کرنی ہے۔ ایک طویل نشست کے بعد جب میں نے حتمی انکار کر دیا تو وہ نیم مایوس واپس لَوٹ گئے۔

چند روز بعد الیاس گھمن نے پھر مجھ سے رابطہ کیا تو مَیں پریشان ہو گیا۔ مجھے حامی بھرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آ رہی تھی، لیکن اب کے بار وہ میرے دفتر سے اُمید و یاس کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ اُٹھے۔ مَیں دفتر سے فارغ ہو کر گھر کی طرف چلا تو کوئی انجانی سی پریشانی میرے دل و دماغ پر حاوی تھی۔ مَیں نے گاڑی کا لائٹر پُش کیا؛ سگریٹ سلگایا اور لمبے لمبے کش لیتا سوچ بچار کرنے لگا کہ آنے والے ایّام کیسے ہو سکتے ہیں۔ نوکری ہے، شام کو لاء کالج میں لیکچر ہیں، افسانہ نگاری چل رہی ہے اور کبھی کبھار کوئی اخباری کالم بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی نئی ذمہ داری کیسے قبول کی جا سکتی ہے۔ سیرت نگاری تو پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ ............ ذرا توازن خراب ہوا تو پھر بس ..................۔

گاڑی نہر پر پہنچی تو سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ مَیں نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور گاڑی کی رفتار کچھ سُست کر دی۔ کشمکش کی بظاہر کوئی بڑی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ تحت الشعور میں کیا تھا، کون بتاتا۔ دوسرا سگریٹ بھی ختم ہو گیا۔ ایک انجانی سی پریشانی تھی جس نے مجھے بے حال کر دیا تھا۔ الٰہی! یہ کیا ہے آخر؟ سوچ ہی رہا تھا کہ جواب ملا کہ سیرت نگاری سے اِس لیے انکار کر رہے ہو کہ کہیں کوئی پکڑ نہ ہو جائے، تو کیا اِس اِنکار پر تمھاری پکڑ نہیں ہو سکتی .................. بس خط کا جواب مل چکا تھا ............ مسئلہ حل ہو چکا تھا

............ دستِ تقدیر سے اپنا حصہ مل گیا............ خوش بختی لکھ دی گئی ............ حالت بدل دی گئی۔
مَیں نے فیصلہ کرلیا کہ مَیں پنجابی زبان میں محبوبِ ربّ کائنات کی باتیں کروں گا؛ باتیں سُناؤں گا؛ باتیں لکھوں گا اور مقدّر سنوارنے کی کوشش کروں گا۔ گھر پہنچتے ہی مَیں نے اپنے انضباطِ اوقات کی ترتیبِ نَو کی اور گھر میں موجود کتبِ سیرت کو محققانہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ فروری تا ستمبر 1998 میری پہلی ترجیح سیرت النبیؐ کا مطالعہ تھی۔ کوئی سات آٹھ ماہ کے بعد مَیں نے پہلی قسط الیاس گھمن کے حوالے کی جو 'رویل' کے اکتوبر 1998 کے پرچہ میں شامل ہوئی۔ 'سوہنے نبیؐ دی سوہنی سیرت' کے جلی الفاظ کے نیچے ادارتی نوٹ یوں تھا:

## سوہنے نبیؐ دی سوہنی سیرت

''اُڈیک دیاں گھڑیاں مُکیاں ............ ایس وارتوں مہینہ وار''رویل'' سوہنے نبی ﷺ دی سوہنی سیرت لڑی وار چھاپن دامان لے رہیا اے۔ پڑھن ہاراں ولّوں ایس سلسلے وچ ملے چِٹھراں توں ہو رہی منگ دا ادارے نوں پورا پورا احساس سی پر ایہہ موضوع جِنّا اہم اے اوہدے لئی کاہل وچ کُجھ کرنا ڈھکواں نہیں سمجھیا گیا۔ ایہدے وچ کوئی شک نہیں کہ پنجابی سنے دُنیا دیاں تقریباً ساریاں نِکیاں وڈیاں بولیاں وچ ای پاک سیرت بارے لکھیا کافی مواد مِلدا اے پر لوڑ ایس گل دی سی کہ حضور محمد ﷺ دی مبارک حیاتی بابت ہوئی جدید ترین کھوج توں پنجابی پڑھن والیاں نوں جانُو کرایا جائے۔ ایس نیک کم دی ذِمے واری محمڈن لاء کالج شیخوپورہ دے اُستاد تے جانے پچھانے سوجھوان اصغر علی جاوید ہوراں قبولی سی تے اوہ پچھلے کئی مہیناں توں جی جان نال ایہہ ذِمّے واری نبھاون وچ جُٹے ہوئے سن۔ ایسے لکھاری دی لکھی کتاب 'عورت، مغرب اور اسلام' نوں دینی کتاباں پڑھن والے سجن جاندے ای ہون گے۔ ایس توں وکھ قومی اخباراں وِچ وی اصغر علی جاوید ہوراں دے دینی تے سماجی معاملیاں بارے لکھے لیکھ چھپدے رہندے نیں۔ پاکؐ سیرت اُتے عالمی سطح تے جو کم ہویا اے اصغر علی جاوید جی دی اوہدے اُتے گُوڑھی نظر اے، ایس سبندھ وِچ انگریزی، عربی تے اُردو وِچ لکھیاں کتاباں نوں تاں اوہناں اُچیچے طور گھوکھیا ہویا اے۔ پر سچی گل اے سوہنے نبیؐ دا ذِکر کرن والے لکھاری دے من وِچ اوس اُچی ہستی دا ڈُونگھا

عشق ہونا سبھ توں ضروری ہوندا اے۔ آؤ پڑھیے کہ ایہ سچا عاشق اپنے مٹھڑے لفظاں نال کِویں مکی مدنی ماہی دیاں شاناں بیان کردا اے .................. اِدارا''

آیئے اس کے چند ابتدائی الفاظ کا بغرض ثواب مطالعہ کریں:

## ☆اصغر علی جاوید

''سردار مبارک ہووے، مبارک ہووے، مالکن ول چن ورگا پُتر ہویا اے ........... سچ سردار! چن ورگا، ڈاہڈا ای سوہنا جے۔''

بہشتی نوجوان عبداللہ دی کنیز برکہ (اُمِ ایمن) دا ساہ پُھلیا ہویا سی تے اوہ شدیناں وانگوں مکّے دیاں گلیاں وِچ دوڑی آوندی کعبۃ اللہ دا طواف کردے بُڈھے سردار تک پُجّی۔ اوہ اِکو ساہ وچ سارا کُجھ دسّ دینا چاہندی سی۔ چاواں رجدی برکہ دے پیر زمین تے نہیں سن لگ رہے تے اوس نوں واپس پرتن دی چھیتی سی۔ اوہ بولدی گئی ''آہا' کیڈا سوہنا بچہ اے، نرا ای چن تے نالے سردار! اوہدے چوں خشبو دیاں لپٹاں پیّاں آوندیاں نیں، مالکن دا سارا کمرا مہکدا پیا اے، سردار! چھیتی آؤ تہانوں مالکن نے سدّیا اے۔'' اوہ سردار نوں خُش خبری سنا کے نسدی نسدی پچھانہہ پرت گئی۔ ایوں جاپدا سی جِویں اوہدے جُسّے وچ بجلی بھری گئی اے۔

جناب عبدالمطلب لئی خُشی ماریاں ساہ لینا اوکھا ہو گیا سی۔ اکھاں وچ خُشی دے اتھرو لے کے اوہ بے اختیارے اگّے ودھ جاندے نیں تے کعبہ دا غلاف پھڑ کے اُچّی واج نال آکھدے نیں ''یااللہ! تیرا شکر کیہڑی زبان، کیہڑے اکھراں نال ادا کراں، تُوں میرے مرے ہوئے پُتر دے گھر دیوا بالیا اے، آمنہ نوں پُتر دِتّا ای تے مینوں وڈیری عمر دا آسرا، یا اللہ! توں ایہدی حفاظت کردا رہویں۔'' اوہ تھوڑا چِر دُعا منگدے رہئے تے فیر تیز تیز پَیر پٹُدے سیّدہ آمنہ دے گھر ول ٹُر پئے۔ اوہ گھر جیہڑا تھوڑا چِر اگدیں اوہناں نے اپنے باراں پُتراں وِچوں سبھ توں سوہنے پُتر عبداللہ نوں دِتا سی۔ رستے وِچ جناب عبداللہ ڈاہڈے یاد آئے۔ اوہ عبداللہ جیہڑے 24 ورھیاں دی عمر تیکر اپنی سیانف، اپنے حُسن تے جوانی پاروں سارے مکہ وچ یوسف ثانی دے ناں نال مشہور ہو گئے سن تے تاں ای بنوزہرہ دے سردار وہب بن عبدالمناف نے اپنی صورت تے سیرت وچ سوہنی تے سیانی دھی آمنہ دا رِشتا خُشی خُشی اوہناں نوں دِتّا سی۔ اگلے ای ورھے مکے دا یوسف، آمنہ دے سر دا سائیں، عبدالمطلب دا پُتر تے ایس کائنات وچ آون والیاں ہستیاں وچوں سب توں وڈی، سچی

تے اُچی ہستی دا والد صرف 25 ورھیاں دی عمر وچ
شام توں مدینے جاندیاں اپنے مالک تے خالق کول
جا پجُیا۔ ایہ خبر جناب عبدالمطلب نوں اجے تھوڑا چر
ای اگدیں اپڑی سی ۔ فیر اوہناں دی نشانی نوں ویکھ
کے عبداللہ کویں نہ یاد آوندے؟
عبدالمطلب سیّدہ آمنہ دے گھر اپڑدے نیں
تے سارا گھر خُشبو نال مہک رہیا سی ۔ اِک اجہی خشبو
سی جیہڑی پہلوں کدے سُنگھی سی نہ سُنی سی ۔ اوہ زچہ
خانے دے باہر ای کھلو جاندے نیں ، سیدہ آمنہ نوں
سردار دے آون دی خبر ہوندی اے تے برکہ دے
راہیں مبارک داسنیہا گھل دیاں نیں تے نال ای اندر
آون داوی آکھدیاں نیں ۔ سردار کمرے دے
اندر پَیر رکھدے نیں تے وکھرے ای رنگ
ویکھدے نیں ۔ نونہہ رانی ہشاس بشاش ، جیوں
بچہ جمن دی کسے تکلیف نال کوئی واہ ای نہ پیا
ہووے ۔ نویں جمے دامن موہنا چہرہ ، سرمگیں
اکھیاں ، چمکدار متھا تے مہکدا رجُسا ویکھ کے خُشی
نال اُچھل کھلوندے نیں ۔ بچے دا متھا چُمدے
نیں تے اوس نوں سینے نال لاکے بیت اللہ
واپس آوندے نیں ۔ تھوڑا چر دعا منگدے نیں
تے فیر امانت ، امانتدار دے ہتھ وچ جا دیندے
نیں ۔

جہاں تک مجھے یاد ہے 'رویل' اُن دِنوں دُنیا کے کوئی درجن بھر ممالک میں پڑھا جاتا تھا۔ مجھے الیاس گھمن نے بتایا کہ انھیں نومبر 1998 کے لیے جوڈاک موصول ہوئی ہے اُس میں اِس سلسلے کو بہت سراہا گیا ہے ۔ اس کی ایک جھلک نومبر کے 'رویل' میں شائع ہونے والے خطوط میں بھی نظر آتی ہے ۔ سیرت کی قسط وار اشاعت اتنی دیر جاری رہی جب تک الیاس گھمن 'رویل' نکالتے رہے ۔ سیرتی مضامین کے اِس سلسلے پر مرحوم پروفیسر عبدالجبار شاکر ، ڈائریکٹر پبلک لائبریریز پنجاب اور پھر خطیب فیصل مسجد اسلام آباد نے بھی گہری نظر رکھی ہوئی تھی ۔ وہ سیرت النبیؐ کے سنجیدہ قاری ، عمر میں مجھ سے سینئر لیکن ایل ایل بی کے کلاس فیلو تھے ۔ اُنھوں نے اس کاوش کے ڈکشن کو بہت پسند کیا اور بالآخر اُن کے ہی اشاعتی ادارہ 'کتاب سرائے' لاہور نے 2012 میں اِسے کتابی شکل دے دی ، اگرچہ وہ خود اس وقت تک دُنیا سے رُخصت ہو چکے تھے ۔

20x30/8 کے 686 صفحات کی ضخامت کی یہ کتاب 'حیاتی حضورؐ دی' کے عنوان سے شائع ہوئی ۔ پنجابی زبان سے محبت کرنیوالے قارئین نے اسے پنجابی کی ایک اچھی کتاب قرار دیا ۔ اگرچہ اِس سے پہلے پنجابی میں سیرت النبیؐ پر کچھ کام ہو چکا تھا جس کا ذکر مَیں نے کتاب مذکورہ میں شامل اپنے مضمون

'پنجابی زبان دا سیرتی سرمایہ' میں کیا ہے، لیکن میری سعی کو ایک تحقیقی کاوش کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ 'حیاتی حضور دی' کو اللہ اور اُس کے محبوبؐ نے کیا مقام دے رکھا ہے، یہ تو وہی جانتے ہیں لیکن یہاں اِسے ورلڈ پنجابی فورم، مسعود کھدّر پوش ٹرسٹ اور صدرِ پاکستان ایوارڈ سے نواز چکے ہیں۔ اِن ایوارڈز کے ساتھ جو زرِ نقد دی جاتی ہے وہ مصنف کی توہین کے لیے کافی ہوتی ہے۔ نجی اداروں کی تو کوئی مجبوری سمجھ میں آتی ہے لیکن صدرِ پاکستان کے ہاتھوں جس کتاب کو ایوارڈ دیا جاتا ہے اُسے پچیس تیس ہزار روپے کی 'زرِ خطیر' عطا کرنا خود صدرِ پاکستان کے لیے باعثِ تضحیک عمل ہے، اور کتاب بھی ایسی جو سب سے بڑے انسانؐ کی حیاتِ پاک کا احاطہ کرتی ہو اور جس کی بابت یہ بھی کہا گیا ہو کہ یہ پنجابی زبان کی تاریخ میں سیرت النبیؐ پر سب سے بڑی اور جامع کتاب ہے۔

# واپڈا (ترمیمی) آرڈی ننس 1998 اور ٹریڈ یونین

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کو آئین کے آرٹیکل (1)89 کے تحت حکم نامے (آرڈیننس) جاری کرنے کا جو اختیار حاصل ہے اُس کے تحت صدر نے 22۔دسمبر، 1998 کو جو حکم نامے جاری کیے اُن میں آرڈیننس نمبر xx آف 1998 کو پاکستان واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ترمیمی) آرڈیننس 1998 کا نام دیا گیا اور یہ فوری طور پر نافذ العمل ہو گیا۔ اِس ترمیمی آرڈی ننس کے ذریعے ویسٹ پاکستان ایکٹ XXXI آف 1958 کی دفعہ 17 میں ترمیم کر دی گئی اور اس میں دفعہ (I-A) کا اضافہ کر دیا گیا، جس کی رُو سے اتھارٹی (واپڈا) اپنے کسی بھی ملازم کو بغیر وجہ بتائے ملازمت سے (جبری) ریٹائر کر سکے گی یا چودہ ایاّم کے اظہارِ وجوہ کے نوٹس کے ساتھ برخواست کر سکے گی اور (I-B)17 کی رُو سے (I-A) کے تحت ریٹائرڈ کر دیے جانے والے ملازم کو ریٹائرمنٹ کے واجبات کے علاوہ تین ماہ کی اضافی تنخواہ بھی دی جائے گی۔ اس طرح مذکورہ بالا ترمیمی آرڈی ننس کی دفعہ 8 کے تحت ویسٹ پاکستان ایکٹ XXXI آف 1958 کی دفعہ 17 کے بعد 17A کا اضافہ کر دیا گیا، جس کے تحت ویسٹ پاکستان انڈسٹریل اینڈ کمرشل ایمپلائمنٹ (سٹینڈنگ آرڈرز) آرڈی ننس 1968 یا انڈسٹریل ریلشن آرڈی ننس 1969 کی دفعات کا اطلاق واپڈا کے ملازمین یا افسران پر نہیں ہو سکتا تھا۔

اِس ترمیم کا مطلب یہ ہوا کہ واپڈا میں نہ صرف جبری ریٹائرمنٹ یا برخواست کیے جانے کے مکروہ فعل کو قانونی شکل دے دی گئی بلکہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی عائد کر کے اِس کالے قانون کے بے دریغ استعمال کا دروازہ بھی کھول دیا گیا۔ یہاں اِس بات کا ذکر غیر ضروری نہ ہوگا کہ 1958 میں جب مقنّنہ نے قانون سازی کی تھی تو دفعہ 17 میں کالے قوانین کا حصّہ شامل نہیں تھا۔ ان کا دخول 1975 کے ایکٹ کے تحت کیا گیا تھا اور اس کا ظالمانہ استعمال بھی کیا گیا تھا۔ پھر واپڈا ملازمین کی طویل جدوجہد، عدالتی فیصلہ جات اور ماہرینِ قانون کی تنقید کے بعد اِس عذاب سے نجات حاصل کی گئی تھی۔ اب صدرِ محترم نے واپڈا کی ڈوبتی ناؤ کو بچانے کے لیے اور ''قوم کی تقدیر'' سنوارنے کے لیے ان کالے قوانین کا پھر سہارا لیا جو کسی بھی معاشرے میں بنظرِ تحسین نہیں دیکھا جا سکتا۔ تنظیم سازی شخصی آزادیوں کا حِصّہ ہے۔ اس کی سزا دینا انتہائی ظلم ہے۔ صحت مند ٹریڈ یونین سرگرمیاں اور اچھے صنعتی تعلقات تہذیب و تمدّن کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے حکمران جس آقا کے نام (امریکہ) کا راگ الاپتے نہیں تھکتے اُس میں یہ مثال موجود ہے کہ صدرِ امریکہ نے ایک وفاقی جج کی تعیناتی کی اور جب یہ تعیناتی آئینی تقاضوں کے مطابق سینٹ میں گئی تو وہاں محض اِس لیے اس کی توثیق نہ کی گئی کہ وہ جج ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے منافی بیان بازی کر رہا تھا۔

صدرِ مملکت اور حکومت کی جانب سے دوسری اہم کارروائی یہ کی گئی کہ ڈسکوز (واپڈا کی ڈسٹری بیوشن کمپنیاں) جنھیں کچھ دیر قبل تک ایریا الیکٹریسٹی بورڈ کہا جاتا تھا، کو فوج کے حوالے کر دیا گیا اور ہر کمپنی کا چیف ایگزیکٹو آفیسر ایک حاضر سروس بریگیڈئر مقرر کیا گیا جن کے زیرِ اثر واپڈا چیف انجینئرز نے کام کرنے سے معذرت کر لی اور اِن چیف انجینئروں کو دوسری جگہوں پر تعینات کر دیا گیا۔ ڈسکوز کے اِن سربراہان کے علاوہ فوج کے 250 افسروں اور 35000 جوانوں کی فوج ظفر موج کی واپڈا کا قبلہ درست کرنے کے لیے صف بندی کر دی گئی اور اس نے اوائل جنوری تک تمام ڈسکوز میں نظم و ضبط سنبھال لیا۔

فوج کی ''در۔آمد'' آئینِ پاکستان کی دفعہ 245 کے تحت کی گئی جو یوں ہے:

245(1) وفاقی حکومت کی ہدایات کے تحت مسلح افواج پاکستان کا دِفاع کریں گی بصورت بیرونی جارحیت یا جنگ کی دھمکی کے اور قانون سے مشروط، سِول پاور کی مدد کے لیے کارروائی کریں

گی، جب ایسا کرنے کا کہا جائے گا۔

(2) کلاز (1) کے تحت وفاقی حکومت کی دی گئی کسی ہدایت کی صحت یا جواز کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جائے گا۔

(3) آرٹیکل 245 کے تحت مسلح افواج جس علاقہ میں وقتی طور پر کارروائی کریں گی اُس میں ہائی کورٹ آرٹیکل 199 کے تحت اختیارِ سماعت نہیں رکھے گی۔

آئین کے آرٹیکل 245 کے اصل متن کو غور سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آئین ساز اِدارہ کے سامنے اِس طرح کی کارروائی کے لیے، فوج کو استعمال کرنا ہرگز نہیں تھا اور نہ ہی دفعہ 245 اِس بات کی اجازت دیتی ہے۔ یوں آئینی ماہرین کا یہ کہنا کہ فوج کو اِس طرح کے دیوانی معاملات میں ملوث کرنا غیر آئینی ہے، غلط نہیں لگتا۔

آئین کے آرٹیکل 89 اور 245 کے تحت کی گئی درج بالا کارروائیوں سے جو طبقہ سب سے زیادہ شبہات اور تفکّرات کا شکار ہوا وہ واپڈا کے ملازمین تھے جو اُن دِنوں واپڈا کے ٹریڈ یونین راہنماؤں کے چہروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ واپڈا ملازمین دو تنظیموں میں تقسیم ہیں۔ واپڈا کے پرانے کارکنوں، سیمی ٹیکنیکل ملازمین، اکاؤنٹس اور ریونیو سٹاف کی اکثریت پاکستان واپڈا ہائیڈرو الیکٹرک سنٹرل لیبر یونین کی حامی ہے۔ یہ یونین برِصغیر پاک و ہند کے مشہور ٹریڈ یونینسٹ اور تحریکِ پاکستان کے کارکن مرحوم بشیر احمد خاں بختیار کی جائز وارث ہے اور اِس کی قیادت اُن دِنوں (اور تا دمِ تحریر) تعلیم یافتہ اور اعتدال پسند ٹریڈ یونینسٹ جناب خورشید احمد کے ہاتھوں میں ہے۔

واپڈا کے وائٹ کالر سٹاف کی اکثریت کی ناراضی کے باوجود واپڈا کی تاریخ کا پہلا ریفرنڈم 29۔ دسمبر، 1997 کو اِس یونین نے واضح اکثریت سے جیتا اور یوں اجتماعی سودا کاری ایجنٹ (CBA) منتخب ہوگئی۔ حکومتی اِداروں نے اِس کی اعتدال پسند پالیسی کی بِناء پر ہمیشہ اِسے تحسین کی نظر سے دیکھا ہے لیکن اُس نواز حکومت کے دَور میں دُہرے رویّے دیکھنے میں آئے۔

واپڈا کی دوسری مقبول یونین جماعتِ اسلامی کے زیرِ اثر 'پیغام' کے نام سے کام کر رہی تھی اور تا دمِ تحریر اس کا وجود باقی ہے۔

واپڈا یونین پر پابندی کے بعد ملازمین ان دونوں تنظیموں کی طرف مُنہ اُٹھائے دیکھتے رہے۔ مذکورہ دونوں یونینز نے اگرچہ سپریم کورٹ تک رسائی کا عِندیہ دیا تھا اور آئینی ماہرین کے علاوہ متحدہ اپوزیشن کا رویّہ بھی مثبت نظر آتا تھا لیکن وہ لفظی جنگ ملازمین پر کالے قوانین کے اطلاق کو نہ روک سکی۔ اِس نیم آئینی اور نیم فوجی کارروائی کے نتیجے میں واپڈا کے بقایا جات اور لائن لاسز میں تو کمی ہوگئی لیکن خوف کی فضا بدتر ہوتی گئی۔ واپڈا کی کہانی کے اِس خطرناک موڑ پر آئی پی پیز سے صرفِ نظر ممکن نہیں جن کے معاملات کا غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہونا کافی حد تک ثابت ہو چکا تھا اور حکومت کے پاس کِک بیکس کی شہادتیں بھی موجود تھیں لیکن حکومت اِس سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ کر پائی جس کا نتیجہ حکومت کی مذکورہ کارروائیاں تھیں جو کسی بھی طرح قرینِ مصلحت نہ تھیں، اور اِس سے مستقبل میں سیاسی فضا بھی مکدّر رہوگئی۔

پاک فوج اپنے ساتھ اپنے طریقِ کار کے مطابق ''خفیہ والوں'' کو بھی لے کر آئی۔ لیسکو میں بھی یہ ایجنسی ایک میجر کی سربراہی میں سرگرمِ عمل رہی۔ اُن دِنوں پہلی بار احساس ہوا کہ خفیہ ایجنسیز جہاں بہت بڑے بڑے اور اہم معرکے سرانجام دیتی ہیں وہاں یہ اِرادۃً یا غیر اِرادۃً ''تعداد'' پوری کرنے کے لیے کچھ غلط بھی کرتی ہیں۔

ایک روز مَیں نے محسوس کیا کہ میجر طیّب بٹ ڈپٹی ڈائریکٹر مجھ سے کچھ گریزاں ہے اور وہ اپنے کمرے میں میری آمد کو کوئی خوش گوار بات نہیں سمجھتا۔ جب مَیں نے وضاحت چاہی تو کہنے لگا کہ وہ لیسکو اِنٹیلی جنس کی زد میں ہے اور اُسے اُس کے سابق فوجی افسر ہونے کا بھی کوئی لحاظ نہیں ہوگا اور یہ کہ اُس کے خلاف ایک رپورٹ بھی تیار کر لی گئی ہے لٰہذا وہ کسی بھی ٹریڈ یونین راہنما سے دُور رہنا ہی قرینِ مصلحت جانتا ہے۔ میجر طیّب بٹ سقوطِ مشرقی پاکستان کے وقت ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے بھارت میں اذیت برداشت کر چکا تھا۔ میرے خلاف بھی جو رپورٹس تیار ہوئیں، اُن میں سے ایک کی نقل براستہ واپڈا ہاؤس مجھ تک پہنچ گئی۔ مَیں اُس جھوٹ کے پلندے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جھوٹ کے علاوہ یہ رپورٹ بے مقصدیت، بے ترتیبی اور ناقص اُردو کا شاہکار بھی تھی۔ اُس کی اُردو سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی پرائمری پاس JCO نے بنائی تھی جسے مِن وعَن جنرل مینجر انٹیلی جنس کو بھیج دیا گیا۔

مذکورہ میجر صاحب، جو لیسکو میں ڈپٹی ڈائریکٹر اِنٹیلی جنس کہلاتا تھا، نے ایک روز مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور نہایت تحکمانہ انداز میں کہنے لگا کہ لاہور بھر میں لیسکو ملازمین نے جتنے گھر acquire کرر کھے ہیں اُن کی فہرست فوری طور پر اُس کے حوالے کردی جائے۔ مجھے اُس کا اندازِ گفتار ایک آنکھ نہ بھایا۔ وہ چونکہ یونی فارم میں نہیں ہوتا تھا اور اُس کی آمد کو بھی ابھی زیادہ ایاّم نہیں گزرے تھے اِس لیے اُس کی شخصیت سے لیسکو ملازمین زیادہ واقف نہ تھے۔ مَیں نے اِس عمومی صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُسے سوال کردیا کہ وہ کون ہے۔ اِس سوال پر وہ خفا ہو گیا اور کہنے لگا کہ ''مَیں تمھارا کورٹ مارشل کردوں گا ............ فوج میں صرف حکم کی تعمیل کی ضرورت ہوتی ہے، فہرست مہیا کرو۔''

''مَیں تمھیں فہرست نہیں دے رہا، تم میرا کورٹ مارشل کرو۔'' میں نے جواب دیا، اور یہ کہتے ہوئے مَیں اپنے کمرے میں واپس لوٹ آیا۔

میجر کی پوسٹ کا ایک افسر کوئی بڑا افسر نہیں ہوتا لیکن انٹیلی جنس میں ہونے کے ناطے اُس کے انداز ذرا مختلف تھے۔ مَیں نے محسوس کیا کہ وہ کسی 'مزید کارروائی' سے باز نہیں آئے گا لہٰذا مَیں نے کمرے میں آتے ہی ایک نوٹنگ کی کہ بغیر یونیفارم کے ایک شخص، جو خود کو میجر کہتا ہے، مجھ سے کچھ دستاویزات کا مطالبہ کر رہا ہے اور یہ کہ اُس کا رویّہ بھی جارحانہ ہے، لہٰذا بدیں امر دفتر کی راہنمائی کی جائے۔ یہ نوٹنگ بذریعہ ڈائریکٹر ایڈمن اُسی روز چیف ایگزیکٹو لیسکو تک پہنچ گئی۔ اگلے روز فائل واپس آئی تو بریگیڈیئر صاحب کے حکم کے ساتھ آئی کہ مطلوبہ فہرست ڈپٹی ڈائریکٹر اِنٹیلی جنس کو مہیا کردی جائے۔ مَیں نے ایک دو روز میں ملازمین کے لیے acquired buildings کی اِس فہرست کو update کیا اور اسی نوٹنگ کے ساتھ میجر صاحب کو بھیج دی۔ میرا خیال ہے کہ اِسی طرح کی کوئی نوٹنگ میجر صاحب کی طرف سے بھی بریگیڈیئر صاحب کو بھیجی گئی تھی اور یہ دونوں فائلز اُسی شام اُن کی میز پر اکٹھی ہو گئی تھیں۔

اِس کشمکش کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے لاہور میں پھیل گئی۔ ملازمین نے مِلے جُلے جذبات کا اظہار کیا۔ کسی نے کہا کہ اصغر علی جاوید آگ سے کھیل رہا ہے اور کسی نے کہا کہ اُس نے ملازمین کو خبردار کرنے کے لیے شعوری طور پر تاخیر کی ہے۔ تاہم لیسکو ایمپلائز میں مجھے ایک منجھے ہوئے، ہمدرد اور دلیر یونینسٹ کی حیثیت سے جانا جانے لگا دوسری طرف ایک آرمی آفیسر کی زبان سے ایک سِویلین کے

کے لیے یہ جملہ کہ ''میں تمھارا کورٹ مارشل کر دوں گا'' بھی دلچسپی کا باعث بنا رہا اور اس وجہ سے میجر صاحب کی فراست بھی زیرِ بحث رہی۔

صدارتی آرڈی ننس کے نفاذ اور ٹریڈ یونین پر پابندی کے بعد میرے ایک دیرینہ ساتھی، کہنہ مشق ٹریڈ یونینسٹ اور سابق سیکرٹری لیسکو سٹاف یونین سیّد نسیم محمود کو پوسٹ آؤٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ ان دِنوں کافی پریشان تھا کہ ابھی اُس کے خلاف 'مزید کارروائی' کی جائے گی۔ 9۔فروری، 1999 کو وہ صُبح گھر سے ناشتہ لینے نکلا تو مین ملتان روڈ پر چوبرجی کوارٹرز کے قریب اُس کی نئی موٹر سائیکل دیکھ کر سٹریٹ کرائمرز کے مُنہ میں پانی آ گیا۔ اُنھوں نے نسیم کو روکا اور وہ موٹر سائیکل لے کر جانے لگے تو اُس نے غلط فیصلہ کرتے ہوئے مزاحمت شروع کر دی۔ اِس مزاحمت کے نتیجے میں ڈاکو اُس کی جان بھی لے گئے اور موٹر سائیکل بھی۔ یہ خوفناک خبر مجھ پر بجلی بن کر گری اور اس نے میرے پہلے سے کمزور ہوتے اعصاب پر ایک کاری ضرب لگائی۔

میرے سامنے اِس وقت 10۔فروری، 1999 کا ورق کُھلا ہے:

''آج سیّد نسیم محمود کو میانی صاحب قبرستان میں منوں مٹی تلے دبا آئے۔ اللہ اُسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے .................. میانی صاحب مسجد کے ساتھ بائیں جانب جونہی میں قبرستان میں داخل ہوا تو مجھے اپنا وہ مرحوم بیٹا بھی یاد آ گیا جسے 17 برس قبل ایک گیلی بھیگی رات 1:00 بجے مَیں، خالو رشید مرحوم اور ماموں منوّر مختصر کفن دفن کے بعد میانی صاحب چھوڑ آئے تھے۔ اُس کی چند سانسیں اور صورت مجھے یاد آئے۔ اس جگہ اب بڑی بڑی قبریں تھیں۔''

میرا لیسکو یونین کا سربراہ ہونا، یونین پر پابندی، فوجی انتظامیہ سے کشیدہ تعلقات، انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر ایڈمن کے ساتھ میری دوستی کو فوکس کرنا اور اسے غلط رنگ دے کر رپورٹنگ کرنا اور اب نسیم کی موت، یہ سب کچھ ایسے معاملات تھے کہ انھوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اِنہی حالات میں 18۔ مارچ کو بالآخر مجھے پوسٹ آؤٹ کر دیا گیا۔ میری ٹرانسفر تو نوشتۂ تقدیر تھی چونکہ فوجی انتظامیہ کو لیسکو کا نظم ونسق سونپتے ہوئے جن 'غنڈوں' کی فہرست تھمائی گئی تھی، مَیں اُن میں نہ صرف شامل تھا بلکہ سرِ فہرست تھا۔ لیکن میاں افتخار احمد ڈائریکٹر ایڈمن نے اِس جبر کے ماحول میں بھی دوستی نبھائی اور میری پوسٹنگ میرے حسبِ

خواہش ایسی جگہ کر دی جو لیسکو میں گوشۂ گمنامی اور گوشۂ عافیت کے نام سے جانی جاتی تھی اور تادمِ تحریر اِس صورتِ حال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تاہم اگلے روز جب میاں صاحب نے مجھے جلد ڈیپارچر دینے کا کہا تو نہ جانے کیوں میں غمزدہ سا ہو گیا۔ پھر مَیں نے جلد ہی خود کو سنبھالا اور سمجھایا کہ ایسا ہوتا آیا ہے کہ مرنے والوں کو جلد از جلد دفنانا ہی قرینِ مصلحت جانا جاتا ہے۔ سو 24۔ مارچ کو مَیں نے لیسکو ہیڈ کوارٹر کو خیر باد کہہ دیا۔ مَیں جب اپنی ڈیپارچر رپورٹ تحریر کر رہا تھا تو مجھے یاد آیا کہ پرانی انارکلی سے اِس عمارت میں لیسکو HQ (تب ایریا الیکٹریسٹی بورڈ) کو مَیں نے شفٹ کرایا تھا؛ یہاں بھرتیاں میری مرضی سے ہوتی تھیں؛ ایک ہی گروپ میں کم و بیش ایک درجن employee's sons کو مَیں نے بھرتی کرایا اور مَیں ہی سٹاف اور آفیسرز میں یکساں مقبول ٹریڈ یونینسٹ تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ آرڈر شیٹ بھی گردش کرنے لگی جس پر جناب سیّد تنظیم حسین نقوی چیئرمین ایریا الیکٹریسٹی بورڈ نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ وہ اِن بھرتیوں کی منظوری دیتے ہیں لیکن آرڈر جاری کرنے سے پہلے یہ فہرست اصغر علی جاوید کو دکھالی جائے۔

25۔ مارچ، 1999 کو مَیں لاہور کی اس تاریخی عمارت ٹاؤن ہال، پھر جناح ہال کہلائی پر پہنچ گیا اور جہاں سے مال روڈ یا شاہراہِ قائدِ اعظم کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس علاقہ سے میری بہت شناسائی اور اُنسیت تھی۔ مَیں جس روز پٹرول بچانے کے چکر میں ذاتی گاڑی استعمال نہیں کرتا تھا اُس روز شیخوپورہ سے سرکاری ملازمین کو لاہور پہنچانے کے لیے مخصوص کوسٹر پر بیٹھتا اور سیکرٹریٹ سٹاپ پر جا اُترتا۔ سٹاپ کے بالکل بائیں جانب ایک چرخی دروازہ تھا جسے مَیں کئی دہائیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے صرف پیدل چلنے والے گزر سکتے تھے اور وہ بھی ایک وقت میں صرف ایک فرد۔

بچپن میں جب ہم پرانی ججی (اب ایوانِ عدل) ماموں منوّر علی بھٹی کو ملنے جایا کرتے تھے تو نہایت آسانی سے لوئر مال عبور کر کے اسی چرخی کو گھماتے ہوئے مَیں اور اشرف بھائی ٹاؤن ہال میں داخل ہوتے اور مین گیٹ سے باہر نکل کر مال روڈ پر جا چڑھتے۔ اُن دِنوں بھاٹی گیٹ سے چلنے والے تانگے جو ضلع کچہری، ایوانِ عدل، سیکرٹریٹ اور کرشن نگر سے گزرتے ہوئے سانده جاتے تھے، ابھی بھاٹی سے چلتے ہی تھے تو چرخی تک گھوڑوں کی ٹپ ٹپ کی آواز سُنائی دیتی۔ ہمیں اندازہ ہو جاتا کہ تانگے کے پہنچنے تک ہم آسانی سے سڑک عبور کر جائیں گے۔ کار اور موٹر سائیکل تو کہیں کہیں نظر آتی تھی البتہ آر۔ اے بازار اور

کرشن نگر کے درمیان چلنے والی لاہوراومنی سروس کی لال بس نمبر 1 کوئی نصف گھنٹے بعد مال روڈ سے لوئر مال کی طرف مڑتی تو سیکرٹریٹ سٹاپ چوکنّا ہو جاتا۔ اِس اومنی سروس کی کچھ بسیں ڈبل ڈیکر تھیں جن پر سفر کا اپنا ہی مزا ہوتا تھا۔

آج جناح ہال کا وہ چرخی دروازہ یاد آتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی لاہور کے تمام دروازے آنکھوں کے آگے گھوم جاتے ہیں۔ بھاٹی دروازہ، لوہاری دروازہ، شاہ عالمی دروازہ، موچی دروازہ، یکّی دروازہ، شیرانوالہ دروازہ، اکبری دروازہ کشمیری دروازہ، روشنائی دروازہ، ٹکسالی دروازہ اور دہلی دروازہ۔ اِن تمام 12 دروازوں سے کبھی نہ کبھی گزر ہوتا رہا بلکہ میرا تو اس دروازے میں سے بھی گزر ہوتا رہا جسے لوگ دروازہ مانتے ہی نہیں اور اُسے موری کہہ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جناح ہال کے مین گیٹ سے نکل کر جونہی ہم مال روڈ پر چڑھتے تو اشرف بھائی کا پسندیدہ عمل بھنگیوں کی توپ پر چڑھنا ہوتا تھا۔ مَیں پاس بیٹھا اُسے دیکھا کرتا تھا اور کبوتروں سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتا تھا۔ اس توپ کے دائیں طرف آرٹس کالج اور عجائب گھر، بائیں جانب پنجاب یونیورسٹی، عقب میں جناح ہال اور ناصر باغ اور سامنے بجانب مشرق مال روڈ سے نکلتا شہرہ آفاق انارکلی بازار۔ کیا مزہ ہوتا تھا وہاں توپ کے ساتھ، کبوتروں کے درمیان بیٹھنے کا۔

جناح ہال میں میری تعیناتی کا دورانیہ تقریباً پندرہ برس پر محیط ہے۔ یہاں پوسٹنگ کے دوران جن خوب صورت لوگوں سے راہ و رسم بنی اُن میں راؤ ضمیرالدین، جو ازاں بعد چیف ایگزیکٹو لیسکو بنے اور پیر فضل معبود کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ محبت اور خلوص میں گندھی ہوئی پیاری شخصیت عزیزی یونس، عزیزی معظم اور مقصود چیمہ کا شمار بھی ایسے بڑے لوگوں میں ہوتا ہے جنھیں بھولنا ممکن نہیں۔

# فاطمہ میموریل اسلامک سکول

یہی وہ ایّام تھے جب اِس سوچ میں شِدّت آ گئی تھی کہ اب صرف نوکری پر گزارا ممکن نہیں ہے۔ بچّے، بڑے ہو رہے تھے اور اب اُنھیں کالج یونیورسٹی کی جانب قدم بڑھانا تھے۔ ٹریڈ یونین پر پابندی لگ گئی اور لاء کالج میں لیکچرز سے مَیں معذرت کر چکا تھا۔ پوسٹنگ ایسی تھی کہ وہاں کام ہی نہیں تھا۔ لہٰذا مَیں نے فیصلہ کیا کہ فراغت اور تنگ دستی کے اِس دور میں کوئی ٹیوشن سنٹر یا سکول کھول لیا جائے۔ ہماری

رِہائش گھر کی بالائی منزل پرتھی اور زیریں حِصّہ بالکل خالی تھا۔مَیں نے کچھ تعمیر دوسری منزل پر کی ؛اپنی لائبریری کو بھی سکول کا حِصّہ بنایا اور 28۔فروری، 1999 کو ایک ایلیمنٹری اسکول کا افتتاح کر دیا۔ سکول کا نام رکھا گیا'فاطمہ میموریل اسلامک سکول'۔فاطمہ میری والدہ کا نام ہے۔1978 میں اُن کے وصال سے ہمارے ہجر کا سفر شروع ہوا تھا۔اِس دَوران کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جس دن اُن کی یاد نے تڑپایا نہ ہو اور اُن کی کمی محسوس نہ ہوئی ہو۔بقول جان ملٹن کے''آسمان کا بہترین اور آخری تحفہ ماں ہے۔''اقبالؒ نے'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کے عنوان سے جو'نوحہ' لکھا،اُس سے کون واقف نہیں۔

اُس روز میری ماں کا پیارا،معصوم اور بھولا بھالا سا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومتا رہا۔ حاجی محمد نواز صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو افتخار عارف کا یہ شعر یاد آ گیا:

دُعا کو ہات اُٹھاتے ہوئے لرزتا ہوں
کبھی دُعا نہیں مانگی تھی ماں کے ہوتے ہوئے

امّی کا چہرہ 1978 تک میری آنکھوں کے سامنے رہا۔1978 میں اُن کی موت کے بعد میرے دل اور میرے خوابوں میں رہا اور 1999 میں اسکول کے قیام کے بعد میرے ہاتھوں اور میرے قلم میں رہا ہے۔ وہ مجھے روزانہ یاد آتی ہیں اور بہت یاد آتی ہیں۔

جب بھی کشتی مِری سیلاب میں آ جاتی ہے
ماں دُعا کرتی ہوئی خواب میں آ جاتی ہے (منور رانا)

یہ ادارہ بفضلِ تعالیٰ رِزقِ حلال کا بہترین ذریعہ بنا اور تعطیلاتِ گرما سے پہلے ہی اِس میں 99 طلباء داخل ہو گئے۔فرحت نے اِس کی آبیاری کے لیے پوری توانائی صرف کی اور میری عدم موجودگی میں دفتری امور بھی سرانجام دینے لگی۔

فاطمہ بیگم نہ صرف والدہ کا نام تھا بل کہ یہ نام ذہن میں آتے ہی فاطمہؓ بنتِ محمد رسول اللہ ﷺ، فاطمہ بنتِ عبداللہ اور فاطمہ جناح جیسی عظیم ہستیاں بھی یاد آ جاتی ہیں۔اور پھر وہ بھی ہیں جنھیں ہم اہلِ اسلام نے بھلا دیا ہے۔کیا نام ور خواتین تھیں وہ،لیکن تاریخِ اسلام سے دُوری اور اسلاف سے محبت کے فقدان سے ہم نہ صرف غافل کی تعریف میں آتے ہیں بل کہ مجرم کہلائے جانے کے حق دار ہیں۔

فاطمہ نام کی ایک بڑی شخصیت سیّدہ فاطمہ بنت اسد کی بھی ہے جو جناب ابو طالب کی بیوی ہیں۔ طالب، عقیل، جعفر طیّار اور علی المرتضٰی کی والدہ ہیں اور جن کے بطن سے اُمِ ہانی، عمانہ اور ربطہ جیسی خواتین نے جنم لیا۔ یہی وہ فاطمہ ہیں جنھیں رسولِ رحمتؐ نے اپنی قمیضِ اطہر میں دفنایا اور فرمایا کہ ابو طالب کے بعد کسی نے ان سے زیادہ مجھ پر مہربانیاں نہیں فرمائیں۔

ایک فاطمہ بنت خطّاب تھیں جو عمرِ فاروقؓ جیسے بڑے آدمی کی بہن تھیں اور پھر اُن کے اِسلام کا باعث بھی بنیں۔ وہ عمر کے ہاتھوں لہولہان ہوتی رہیں لیکن اپنے استقلال میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔ ایک بڑا نام فاطمہ بنت قیس کا بھی ہے۔ نہایت عقل مند، ادیبہ، فاضلہ، صائب الرّائے، ثاقب الفکر اور ذی کمال صحابیہ تھیں۔ اُس عہد کی دانش ور خواتین میں آپ سرِ فہرست نظر آتی ہیں۔ پھر ظاہری حُسن و جمال نے اُن کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے تھے۔ آپ ابو عمرو کی زوجیت میں تھیں۔ اُنھوں نے طلاق دے دی تو فاطمہ نے رسول اللہؐ کے حکم کی اطاعت میں اُسامہ بن زیدؓ سے نکاح کر لیا۔

فاطمہ میموریل اسلامک اسکول تا دمِ تحریر یعنی رُبع صدی سے علم کی شمع منوّر کیے ہوئے ہے۔ مَیں ہر روز فاطمہ کا لفظ سینکڑوں بار پڑھتا ہوں اور مجھے ہر روز سینکڑوں بار فاطمہ بنت رسول اللہؐ، فاطمہ بنت اسد، فاطمہ بنتِ قیس، فاطمہ بنتِ خطّاب، فاطمہ بنت عبداللہ، فاطمہ بنت جناح اور اپنی پیاری اور شفیق والدہ یاد آجاتی ہیں۔ اور ہاں ترکی کی فاطمہ علیہ خانم کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہوگی جو مشہور مؤرخ جودت پاشا کی بیٹی اور ترکی، عربی، فارسی اور فرانسیسی زبانوں کی بڑی عالمہ تھی۔ یہی فاطمہ ہے جس نے پہلی بار فرانسیسی ادب کا ترکی میں ترجمہ کیا۔ مشہورِ زمانہ کتاب نساء الاسلام بھی اسی کی تصنیف ہے۔

جہاں تک میری معلومات ہیں فاطمہ میموریل اسلامک اسکول، واحد اسکول ہے جس نے PEC کے امتحان میں اسلامیات میں 100% اور انگلش میں 98% نمبر حاصل کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔

اب میری توجّہ کا مرکز و محور فاطمہ میموریل اسلامک اسکول ہی تھا۔ یہ جہاں مالی خوش حالی کا باعث بن رہا تھا وہاں معاشرتی قدر و احترام میں اضافے کا بھی سبب بنا۔ مَیں نے روٹی کے لیے امرودوں کا ٹوکرا اُٹھایا اور قلی کی نوکری کی تھی، اب تو مجھے سرکاری نوکری میں میز کرسی، کمرہ اور سٹاف میسّر تھا

اور ذاتی کاروبار میں بھی میز دستیاب تھی اور مفت میں 'سر' کا خطاب بھی۔اب اسکول میں جاوید کی بجائے سر جاوید تھا۔بس مَیں پوری طرح مطمئن تھا کہ گاڑی درست سمت پر درست رفتار سے چل رہی ہے۔

**لیبر اینڈ ویلفیئر کمیٹی لیسکو** : اپریل،1999 کے پہلے عشرہ میں یہ بات سامنے آئی کہ اقوامِ متحدہ کے ذیلی اِدارے ILO کے دباؤ پر واپڈا کی ڈسٹری بیوشن کمپنیز میں لیبر اینڈ ویلفیئر کمیٹیز تشکیل دی جا رہی ہیں۔ایسا ہونا اِس لیے قرینِ قیاس تھا کہ شریف حکومت ٹریڈ یونین پر پابندی عائد کر چکی تھی؛ واپڈا کا نظام فوج کے حوالے کر دیا گیا تھا اور ملازمین شدید تناؤ اور دباؤ کا شکار تھے۔یوں بھی بین الاقوامی چوہدراہٹ کی یہ پالیسی ہوتی ہے کہ تیسری دُنیا کے ممالک بالخصوص مسلم ممالک میں گائے کو اِتنا چارہ ڈالتے رہو کہ وہ دودھ دیتی رہے۔واپڈا ٹریڈ یونین کے اربابِ اختیار سے شریف فیملی کا قریبی تعلق بھی تھا۔دونوں خاندانوں کا تعلق پہلے امرتسر اور پھر گوالمنڈی سے تھا۔پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کے سربراہ جناب بشیر احمد خاں بختیار سے نواز شریف کا عقیدت کا رِشتہ تھا اور وہ گوالمنڈی میں بختیار صاحب کو ملنے آ جایا کرتے تھے۔اِس موقعہ پر ایک لطیفہ (یا شاید اسے لطیفہ نہیں کہنا چاہیے) یاد آ رہا ہے۔اور وہ یہ کہ ایک روز کسی کام کے سلسلے میں حاجی محمد نواز صاحب ایم پی اے صدر مسلم لیگ (ن) شیخوپورہ کو میری طرف آنا تھا۔خلافِ وعدہ وہ اُس روز میرے ہاں تشریف نہ لائے اور اگلے روز اس کی وضاحت یوں کی کہ اچانک میاں نواز شریف صاحب کی کال آ گئی تھی اور اُنھیں لاہور جانا پڑا۔اُنھوں نے بتایا کہ میاں صاحب کو بشیر بختیار صاحب کی عیادت کے لیے بھی جانا تھا لہٰذا اُنھوں نے مجھے اپنی گاڑی میں ہی بٹھا لیا اور راستے میں ہی ضروری گفتگو کر لی۔گوالمنڈی میں بختیار صاحب کی رِہائش پر پہنچے تو مَیں بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔بختیار صاحب کو نحیف و لاغر حالت میں دیکھ کر میاں صاحب کہنے لگے کہ ''خاں صاحب! اپنا کچھ خیال کرو، ایس قوم نوں تہاڈی بڑی لوڑ اے۔''

خاں صاحب نے برجستہ جواب دیا: ''نواز شریف! ایہہ قوم بڑی ............ اے، ایہنوں کِسے دی لوڑ نئیں۔'' شدید علالت اور پیرانہ سالی میں خاں صاحب کی زباں سے اس طرح کے جملے پر حاجی صاحب اور نواز شریف صاحب مسکرا ہی سکتے تھے لیکن اس سے دونوں خاندانوں کے بے تکلّفانہ تعلقات کی جھلک ضرور ملتی ہے۔

دوسری طرف یہ ایک خوفناک حقیقت بھی ہے کہ ہم بڑے لوگوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ایک اور واقعہ یاد آتا ہے کہ ایک سرکاری افسر کو محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے فون کیا اور پوچھا کہ کیا آپ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو جانتے ہیں؟ مذکورہ افسر نے مجھے بتایا کہ وہ اُن کی آواز پہچانتا تھا لہٰذا ڈاکٹر صاحب سے مؤدبانہ عرض کی کہ سَر آپ کو کون نہیں جانتا۔ اِس پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت افسردہ لہجہ میں فرمایا کہ بھائی! مَیں نے چند روز پہلے لاہور کے ایک پرائیویٹ سکول کی پرنسپل کو فون کیا اور اُنھیں ایک بچّے کے داخلہ کا کہا۔ اِس پر اُنھیں جواب ملا کہ وہ کسی ڈاکٹر عبدالقدیر کو نہیں جانتی۔

ڈاکٹر صاحب اپنی نظر بندی پر کتنے دُکھی اور غم زدہ تھے اس کی جھلک اُن وِڈیو انٹرویوز میں بھی ملتی ہے جو دَورِ اِبتلاء میں اُن سے کیے گئے تھے اور اُنھیں یہ کہتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ ملک و قوم کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن کریں گے نہیں۔

بہرحال اِس پس منظر میں ٹریڈ یونین کی تہی دامنی پر کئی سوال اُٹھتے تھے۔ لہٰذا ملازمین کے لیے پُرسہ ضروری تھا بھلے وہ دکھاوے کا ہی ہوتا۔

مجوزہ لیبر اینڈ ویلفیئر کمیٹی کے بشمول سربراہ پانچ ارکان تھے۔ چیف ایگزیکٹو ڈسکو اِس کا سربراہ، ڈائریکٹر ایڈمن اور ڈائریکٹر لیبر اینڈ ویلفیئر کمیٹی کے نمائندہ ارکان اور ملازمین کی نمائندگی کے لیے بھی دو ارکان تھے۔ لیسکو کے تقریباً 17 ہزار ملازمین کی نمائندگی اور ترجمانی کے لیے دو افراد بظاہر تو اشک شوئی کے لیے کافی نہ تھے لیکن گُھپ اندھیرے میں جگنو کی ٹمٹماہٹ ہی غنیمت جانی جاتی ہے، لہٰذا ملازمین نے کچھ نہ کچھ سُکھ کا سانس لیا۔ اِس کمیٹی میں ملازمین کی ترجمانی کے لیے دونوں نشستوں پر بظاہر تو CBA کا حق تھا جو قانونی اور اخلاقی طور پر اجتماعی سوداکاری کا اختیار رکھتی تھی لیکن ہُوا یہ کہ فوجی انتظامیہ نے ایک رُکن CBA سے لیا اور دوسرا اپوزیشن (پیغام یونین) سے۔ دیکھا جائے تو اصل حقِ نمائندگی سی بی اے، پاکستان واپڈا ہائیڈرو الیکٹرک لیبر یونین کے ہی پاس تھا جو میرے حصّے آیا۔ اپوزیشن کی طرف سے جو رُکن سامنے آیا وہ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ انسان ملک محمد یوسف تھا۔ مجھے وجوہات کا تو علم نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ وہ مجھے بے پناہ احترام دیتا تھا اور مختلف امور میں میرے ساتھ مشاورت بھی کیا کرتا تھا۔

شریف حکومت کے دباؤ پر اِس کمیٹی کا پہلا اجلاس تشکیل کے فوراً بعد ہی رکھ لیا گیا۔ چاروں

ارکان میاں افتخار احمد ڈائریکٹر ایڈمن، شبیر احمد بٹ ڈائریکٹر لیبر اینڈ ویلفیئر، ملک محمد یوسف نمائندہ پیغام یونین اور مَیں آپس میں نہایت ہی عقیدت و احترام کا رِشتہ قائم کیے ہوئے تھے۔ چاروں اپنی شہرت اور نیک نامی کی وجہ سے ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے تھے لہٰذا لیسکو کے سترہ ہزار ملازمین نے کمیٹی کی تشکیل اور پھر اس کے ارکان کو محبت کی نظر سے دیکھا اور ارکان کے سامنے دُکھوں کے انبار لگا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملازمین کے مسائل کی ایک ورائٹی سامنے آئی اور جتنے بھی معاملات زیرِ بحث آئے، سب احسن طریقے سے نمٹا دیے گئے۔ بدقسمتی کہ دکھاوے کی اِس کمیٹی کے صرف دو ہی اجلاس ہو سکے اور ازاں بعد اس کا وہی حال ہوا جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ ملازمین کے مسائل کا حل اگر انتظامیہ کی ترجیح ہوتی تو ڈسٹری بیوشن کمپنیز کی باگ ڈور فوج کے حوالے نہ کی جاتی۔ جو گھٹن اور تناؤ سٹاف اور افسران میں اس عہد میں دیکھا گیا، اس کی شاید ہی آج کی مہذّب دُنیا میں کہیں کوئی دوسری مثال موجود ہو۔ لیسکو کے ملازمین اپنے ہی دوستوں کو خفیہ والوں کے ایجنٹ سمجھنے لگے اور باہمی رشتے ناطے کمزور ہو گئے۔ افسران اِس حد تک اپنی تضحیک محسوس کرتے تھے کہ اُن کے چہروں پر نفرت چھپائے نہ چھپتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے لیسکو کے دوسرے فوجی سربراہ کے دَور میں میکلوڈ روڈ کی واپڈا بلڈنگ میں لیسکو افسران کی ایک میٹنگ رکھی گئی جسے چیف ایگزیکٹو خود چیئر کر رہے تھے۔ وہاں چیئر کی طرف سے ایک سینئر افسر کے ساتھ توہین آمیز رویّہ اپنایا گیا۔ اُن کے چہرے کے تأثرات اور ردِّعمل ایسا تھا کہ اگر اُن کے بس میں ہوتا تو استعفیٰ CEO کے مُنہ پہ دے مارتے لیکن وہ صبر کر گئے۔ وہ ایک قابل اور محنتی افسر تھے جو ازاں بعد CEO فیسکو مقرر ہوئے۔ اسی مجلس میں موجود ارشد رفیق کے ساتھ والی نشست پر مَیں بیٹھا تھا۔ مَیں کسی وجہ سے اُٹھ کر باہر جانے لگا تو ارشد رفیق نے میرا بازو کھینچا اور جملہ کسا کہ ''بیٹھ جا، ہُن ساڈی پینٹ لہندی ویکھ کے جاویں۔'' ارشد رفیق بھی واپڈا کے انتہائی لائق انجینئرز میں بھی سرِ فہرست تھے اور وہ اَزاں بعد خود چیف ایگزیکٹو لیسکو بنے۔ اُن جیسا مدبّر، لائق اور اصول پرست انسان کم ہی ملتا ہے لیکن عجب بات ہے کہ لیسکو کا خُلد اُنھیں کبھی راس نہ آیا۔ وہ پینٹ جو ایک بریگیڈیئر نے تو نہ اُتاری، انتہائی دُکھ کی بات ہے وہ ایک سیاست دان نے اُتار دی۔ خدا کا غضب نازل ہو ایسے لوگوں پر۔

ڈسکوز کی سربراہی بریگیڈیئرز کو دیے جانے کا فیصلہ اپنے پیچھے کئی سوالات چھوڑ رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ

اگر ایک ایف اے پاس آدمی سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہو کر اور بریگیڈیئر تک ترقی پا کر ڈسٹری بیوشن کمپنی کو چلا سکتا ہے تو سینئر الیکٹریکل انجینئرز، شعبہ مال اور کمرشل، شعبہ ایڈمنسٹریشن اور شعبہ قانون کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ لوگوں کی کیا ضرورت ہے۔ اِسی طرح کے کچھ دیگر سوالات ایک طویل مدت تک ذہن کی پراگندگی کا باعث بنے رہے۔ دوسری طرف اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لیسکو کے فوجی سربراہان نے اسے کامیابی سے چلایا اور دیر سے بھٹکے ہوئے آہُو کو پھر سے سُوئے حرم لے گئے۔ کرپشن کے الزامات اُن پر بھی آئے اور خاص طور پر شعبہ انٹیلی جنس پر بہت انگشت نمائی کی گئی۔

2022 میں حادثاتی طور پر میرا رابطہ لیسکو کے دوسرے فوجی سربراہ بریگیڈیئر ریاض احمد طور سے ہوا تو یہ کھلا کہ وہ NUML اور پنجاب یونیورسٹی میں بحثییت اُستاد خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اِس سے کم از کم اِس سوال کا جواب مل گیا کہ ہر فوجی صرف ایف اے پاس نہیں ہوتا۔ اس موقعہ پر مجھے اپنا مرحوم دوست میجر عبدالرّحیم ثاقب بھی یاد آ گیا جو جی۔ سی۔ لاہور سے ایم اے اُردو میں گولڈ میڈلسٹ تھا۔

2001 کے آغاز میں یونین سازی پر پابندی کا دَور ختم ہو چکا تھا۔ یہ طاق سال بھی تھا لہٰذا یونین کے انٹرنل الیکشن بھی ہونا تھے اور اتفاق سے نیشنل انڈسٹریل ریلیشنز کمِشن نے واپڈا میں ریفرنڈم کا بھی اعلان کر دیا۔ اس کے لیے 19۔ اپریل کی تاریخ مقرّر ہوئی۔ مَیں اُن دِنوں چار ماہ کی رُخصت پر تھا لیکن تنظیم سے اپنی وفا اور گہری وابستگی کی بِناء پر اپنا ووٹ ڈالنے لاہور پہنچ گیا۔ الحمدُ للہ ہماری پاکستان واپڈا ہائیڈرو الیکٹرک یونین یہ ریفرنڈم بھی جیت گئی۔ اِس کامیابی میں اگر جناب خورشید احمد خاں صاحب کی مدبّرانہ قیادت کا ذکر نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہے گی۔ اُن کا تحمّل، بُردباری اور دُور اندیشی واپڈا کے کارکنوں اور افسروں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ یہ اُن کا قائدانہ فہم ہی ہے کہ ہر عہد میں وہ واپڈا انتظامیہ سے مراعات اور سہولیات دلوانے میں کامیابی حاصل کرتے رہے۔

اس ریفرنڈم کے روز لیسکو میں کسی حد تک میری عدم موجودگی کو محسوس کیا گیا۔ مجھے یونین، انتظامیہ اور سٹاف کی طرف سے ازاں قبل اور ازاں بعد بار بار کہا گیا کہ مَیں ہیڈکوارٹرز جائن کر لوں لیکن میری حمیت نے گوارا نہ کیا کہ مُڑ کے دیکھوں۔ البتہ جب میری رائے لیے بغیر میرے آرڈر کیے گئے تو کچھ مہربان دوستوں نے میری مدد کی جن میں سیکرٹری لیسکو انجینئر انصار یونس بٹ کی محبت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

اور ہاں میری ٹرانسفر کے کچھ ہی دیر بعد جب کمپنی کے پہلے بریگیڈیئر سربراہ سے میری بحیثیت رُکن لیبر اینڈ ویلفیئر کمیٹی پہلی ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے مجھ سے میری پوسٹنگ کا پوچھا۔ جب مَیں نے سٹریٹ لائٹ ڈویژن کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ ہیڈ کوارٹر میں کیوں نہیں۔ مَیں نے اُنھیں بتایا کہ ہیڈ کوارٹر ہی میں تھا اور آپ کے قلم سے ہی وہاں کے آرڈر ہوئے ہیں۔

''ہوں ............ سمجھ گیا ............ دراصل ہمیں بتایا گیا تھا کہ آپ لوگ سینئر افسران کے کمروں کے دروازے ہاتھوں سے نہیں پاؤں سے کھولتے تھے۔'' بریگیڈیئر صاحب نے انکشاف کیا۔ اُنھوں نے مزید کہا کہ شاید اب اُنھیں اپنی رائے بدلنا ہو گی کہ ان کی اطلاعات سو فیصد درست نہیں ہیں۔ یہ میٹنگ ہیڈ کوارٹر میں فوری واپسی کا بہترین سبب بن سکتی تھی لیکن مَیں نے حتمی فیصلہ کر رکھا تھا کہ یہ تأثر نہیں دوں گا کہ مَیں ہیڈ کوارٹر سے باہر کی نوکری میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

**دریچہ** : یہ 2000 کے اواخر کی بات ہے کہ مجھے سکول کے لیے دوسری منزل کی تعمیر کے لیے کچھ رقم کی ضرورت پیش آئی۔ دائیں بائیں، اِدھر اُدھر جھانکا۔ ایک جگہ پر دستِ سوال دراز بھی کیا لیکن کاسہ خالی ہی رہا۔ پیسہ تو اُسے اُدھار دیا جاتا ہے جس سے واپسی کی اُمید ہو۔ وہ کوئی ساہوکار ہو یا آئی ایم ایف، سبھی سوال کرتے ہیں کہ لوٹاؤ گے کہاں سے۔ اب مجھ جیسے بھوکے ننگے کو رقم دینے کا مطلب یہ تھا کہ رقم ڈبو دی جائے، لہٰذا اپنی تہی دامنی پر روتا رہا اور اچھے لمحات کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک ذہن کے دریچے پہ دستک ہوئی کہ میری ایک انشورنس پالیسی PLI کے ہاں چل رہی ہے۔ لہٰذا اگلی صبح مَیں اپنی انشورنس پالیسی کے عِوض قرض (یا شاید اس رقم کو کوئی دوسرا نام دیا جاتا تھا) لینے کے لیے دفتر پوسٹل لائف انشورنس ملحقہ جی پی او پہنچ گیا۔ متعلقہ اسسٹنٹ نے مجھے اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب سے رابطے کا کہا جنھوں نے اتفاق سے میرا نام سُن رکھا تھا۔ اُنھوں نے کہیں میرے افسانے بھی پڑھ رکھے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے چائے کی پیالی میرے آگے رکھی اور اپنے خدمت گار کو حکم دیا کہ ارشد نعیم صاحب سے کہو کہ اصغر علی جاوید صاحب اُنھیں ملنے آئے ہیں۔ چند ہی لمحوں بعد شیخوپورہ کا مجید امجد، خلوص و وفا کا استعارہ اور باکمال نقاد ارشد نعیم میرے سر پر کھڑا تھا۔

''جاوید صاحب! یہ ارشد نعیم صاحب ہیں۔ جانتے ہیں اِنھیں؟ .................. اور ارشد نعیم

صاحب آپ؟'' ............ اے ڈی صاحب نے کہا۔

دونوں کا ایک ہی جواب تھا کہ ''جانتا ضرور ہوں لیکن ملاقات نہیں تھی۔''

اور پھر اگلی شام ارشد نعیم صاحب، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر خالد ندیم اور نوید رضا کو لے کر غریب خانہ پر تشریف لے آئے۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات تھی کہ اِتنے بڑے لوگوں نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا۔ اِس ملاقات میں مجھے شیخو پورہ کے شعراء وادباء کی تنظیم 'دریچہ' میں شمولیت کی دعوت بھی دی گئی، جو مَیں نے اِس پہلی ہی ملاقات میں قبول کر لی۔ 15۔ فروری، 2001 کی شام مَیں نے 'دریچہ' کے اجلاس میں پہلی بار شرکت کی تو وہاں تنظیم کے حکم پر اپنا افسانہ 'چاند رات کے مسافر' پڑھا۔ اِس اِجلاس میں مرزا صدیق شاہد صاحب مرحوم سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج، سیّد انتصار حسین عابدی صاحب اور اِبنِ صادق مزاری مرحوم جیسے کُہنہ مشق شعراء اور صاحبانِ مروّت لوگ موجود تھے۔ ان سب نے 'چاند رات کے مسافر' کو ایک معیاری افسانہ قرار دیا۔ ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک، جن کا اوڑھنا بچھونا ہی مزاح ہے، نے ایک مزاحیہ سکرپٹ پڑھا جو بقول اُن کے بُشریٰ انصاری کی فرمائش پر کسی ٹی۔ وی چینل کے لیے لکھا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اِبنِ صادق مزاری نے کچھ اِس طرح کا کلام پڑھا تھا:

اَج بوٹاں بُھکھیاں سونا اے اَج چِڑیاں پھندے چڑھیاں نیں

نوید رضا کا تأثر سے بھرپور شعر بھی مَیں نے اُسی مجلس میں سُنا تھا:

رہینِ آب و دانہ ہی سہی آوارگی اپنی گھروں کو لَوٹ آتے ہیں پرندے شام سے پہلے

آج شرافت، مروّت اور فن میں مہارت کے یہ نا قابلِ فراموش مجسمے جب یاد آتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ مرزا صدیق شاہد اور اِبنِ صادق مزاری تو راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ سیّد انتصار حسین عابدی اپنے جگری دوست مرزا صدیق شاہد کی جدائی کے غم میں 'دریچہ' سے دُور ہو گئے اور اہلِ دریچہ اُن کی لازوال شاعری سے محروم ہو گئے۔ نوید رضا بسلسلہ روزگار لاہور منتقل ہو گیا۔ اِس سطح کی واحد شخصیت جو اَزاں بعد دریچہ کو نصیب ہوئی وہ پروفیسر محمد اکرم سعید سابق صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج شیخو پورہ کی ہے۔ وہ جتنے بڑے فنکار ہیں، اس سے کہیں بڑے انسان ہیں۔ تاریخ، سیاست، ادب اور سب سے بڑی بات مروّت۔ اللہ نے یہ سب ان کی جھولی میں بھر دیا ہے۔ پروفیسر اکرم سعید ہم میں وہ تنہا ہستی

ہے جن کی گفتگو ابہام سے پاک اور تبصرے بے لاگ ہوتے ہیں۔

دریچہ کو جہاں مزاح میں ڈاکٹر اشفاق ورک اور شاعری کے شعبہ میں ارشد نعیم، اشرف نقوی، نعیم گیلانی، اظہر عباس اور علی آصف جیسے لوگ نصیب ہوئے وہاں ایک بہت بڑا Craftsman شاہین عباس کی شکل میں میسّر آیا، لیکن دریچہ کی بدقسمتی ہے، یا شاید میری کوتاہ نظری، کہ یہ 2023 میں بھی اُسی جگہ کھڑی تھی جہاں 2001 میں تھی۔ اِن 22 سالوں میں دریچہ کے کریڈٹ پر جو اضافہ ہوا وہ مزاح اور شاعری کی چند کُتب کے علاوہ ایک ناول، ایک دو افسانوی مجموعے اور سیرت النبیؐ پر ایک کتاب سے زیادہ نہیں ہے۔ تاریخ ہی اِس کا فیصلہ کرے گی کہ یہ رفتار دادو تحسین کی مستحق قرار پاتی ہے یا نہیں۔

دریچہ کے اجلاسوں میں مختلف اوقات میں شیخوپورہ کے دوسرے غیر رُکن قلم کار بھی شرکت کرتے رہے ہیں۔ ان لوگوں میں قابلِ ذکر ماسٹر الطاف اور بشیر باوا ہیں۔ دونوں ہی اگلی دُنیا کو سدھار چکے ہیں۔ ماسٹر الطاف پنجابی مزاحیہ شاعری کا ایک بڑا نام تھا اور بشیر باوا مرحوم کے بارے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اِس ارضی کُرّہ پر جس شخص کے پاس پنجابی زبان کا سب سے بڑا ذخیرۂ الفاظ تھا، وہ بشیر باوا تھا۔ یہ میری نہیں بلکہ بھارتی پنجاب کے ایک بڑے سِکھ دانش ور کی رائے ہے جو میں نے 'رویل' میں پڑھی تھی۔ البتہ سردار جی کا نام میری یاد سے محو ہو چکا ہے۔

اپنی ادبی تنظیم سے رِشتہ استوار ہوئے ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے کہ معروف شاعر نذیر قیصر کے ساتھ ایک شام کا پروگرام بنا۔ یہ خوب صورت پروگرام 2۔ جون، 2001 کو میری رِہائش پر ترتیب دیا گیا۔ ایک بڑے غزل گو شاعر کے ساتھ کچھ وقت گزارنا اچھا لگا۔ اِس پروگرام میں دریچہ کے ارکان کے علاوہ ڈاکٹر اجمل نیازی، مسیحی راہنما ڈاکٹر حزقی ایل سروش اور اسیر عابد جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں نے شرکت کی۔ جو غزلیں نذیر قیصر نے سُنائیں، اُن میں ایک کا مطلع یاد ہے:

تمھارے شہر کا موسم بڑا سُہانا لگے
میں ایک شام چُرالوں اگر بُرا نہ لگے

# قتیل شفائی اور مَیں

میں نے ہمیشہ اِس قبیل کی تنقید سے اکتاہٹ محسوس کی ہے جس کے حجم کو گزوں سے ماپا جاتا ہے، اوران تخلیقات کو ناپسندیدگی نہیں بلکہ نفرت کی نظروں سے دیکھا ہے جن میں تخلیق کار اپنے قاری کو کچھ دینے کی بجائے اپنی ہی ذات کو نوازتا رہتا ہے اور پھر کوّے کی طرح شور کر کے یہ پوچھتا ہے کہ ''کہو، مَیں ہوں نا؟'' مجھے یقین ہے کہ میرا ضابطہ بہتر ہے اور انصاف کے قریب تر بھی ہے کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ریڈر کبھی کم عقل اور ناواقف نہیں ہوتا۔ "The Castle of Otranto" کے خالق Horace Walpole نے، جو جدید ادب کے بانیوں میں سے ہے، کہا تھا کہ "The greatest lesson in lif is to know that evevn fools are right sometimes." اور یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ Functionally illiterate شخص تو کتاب نہ خریدتا ہے اور نہ کھولتا ہے۔

جناب عمرؓ بن خطاب اور ابو دجانہؓ مجھے کیوں محبوب ہیں، اِس کی وضاحت ضروری نہیں۔ مَیں محمد علی جناح، فتح علی ٹیپو اور موہن داس گاندھی کو کیوں پسند کرتا ہوں، اس کے لیے مَیں کہیں جواب دِہ نہیں۔ جلال الدین رومی، حسین لاہوری، اقبال، واصف علی واصف، ساحر لدھیانوی، گلزار، قتیل شفائی، مہدی حسن اور جگجیت سنگھ سے مجھے کیوں محبت ہے، اِس کی کوئی وجہ تو ہو گی لیکن اِسے اِس طرح بیان نہیں کیا جا سکتا جس طرح ہائی کورٹ میں آئینی درخواست admit کرانے کے لیے دلائل دیے جاتے ہیں۔ بس بڑے لوگوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ وہ کچھ کہتے ہیں جو ہم کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے اور یہ وہ کچھ کرتے ہیں جو ہم کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں پاتے کیوں کہ ہم میں وہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ اللہ نے کِس کو کیا ودیعت کی ہوتی ہے اس کا بہترین اظہار یہ تخلیق ہی ہے۔

11۔ جولائی 2001 کی شام مَیں گھر کی چھت پر گملوں میں مرجھائے پودوں کو دیکھ رہا تھا کہ فرحت نے مجھے آواز دی کہ قتیل شفائی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ میری عجیب سی کیفیت بنی اور مَیں اُسے جواب بھی نہ دے سکا کہ مَیں نے اُس کی آواز سُن لی ہے۔ اس پر وہ خود چھت پہ آئی اور میری ہچکی بندھی

دیکھ کر مجھے دلاسا دیتی رہی۔

مَیں قتیل کی زندگی میں کبھی بھی اُنھیں مل نہ سکا اور نہ ہی ملنے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن وہ لوگ جنھیں روحانی طور پر مَیں تقریباً روزانہ ملا کرتا تھا اُن میں یہ عظیم فن کار شامل تھا۔ مَیں نے 2012 میں جن بڑے ستائیس لوگوں کے سوانحی خاکے تحریر کیے اُن میں قتیل شامل تھا۔ قتیل کا کلام اور جگجیت اور چترا سنگھ کی آواز جب یکجا ہوتے ہیں تو سُننے والے کو ایک انجانے سحر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ چند روز قبل جب مَیں نے یہ غزل سُنی تو پتہ چلا کہ یہ صرف ایک ورژن پر چوبیس لاکھ بار سُنی جا چکی ہے۔

کیا ہے پیار جسے ہم نے زندگی کی طرح
وہ آشنا بھی ملا ہم کو اجنبی کی طرح

قتیل نے جو لکھا، کمال لکھا۔ اُس کی مسحور کن شخصیت پڑھنے، سُننے والے کو دیوانہ کر دیتی ہے۔ پاکستان کا یہ ساحر لُدھیانوی مجھے بہت یاد آتا ہے اور بہت اُداس کرتا ہے۔

میری ڈائری کے 11۔ جولائی، 2001 کے ورق پر صرف یہ لکھا ہے:

''قتیل شفائی مرحوم کے رُخصت ہو جانے کے بعد اُن کی یہ غزل بہت یاد آئی:

وہ دل ہی کیا تیرے ملنے کی جو دُعا نہ کرے
مَیں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں ، خدا نہ کرے
رہے گا ساتھ ترا پیار زندگی بن کر
یہ اور بات ، مِری زندگی وفا نہ کرے
یہ ٹھیک ہے نہیں مرتا کوئی جدائی میں
خدا کسی کو کِسی سے مگر جدا نہ کرے

**باپ کی بے پایاں محبت:** اسی 2001 میں خاندان میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ ماں ایک بار پھر مجھے خون کے آنسو رُلاتی رہی۔ وہ رات دن میرے ساتھ رہی۔ پُرسہ دیتی رہی اور پریشان نہ ہونے کی تاکید کرتی رہی۔ اُس نے مجھے یاد دِلایا کہ ''تم میرے مرنے کے بعد بھی ایک بار اعصاب شکن تنہائی کا شکار ہوئے تھے۔ تمھیں گھر سے نکال دیا گیا تھا، ایک گناہِ ناکردہ کی سزا میں۔ تم مضبوط تر ہو کر سامنے آئے

تھے نا اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا مَیں تمھیں بتا کر آئی تھی ۔ ہے نا؟ اب بھی حوصلہ رکھو، تمھارے ابّو تمھارے ساتھ ہیں، کچھ نہیں ہوگا۔'' لیکن میں ایک خوفناک تنہائی کا شکار ہو چکا تھا اور میں مزید تناؤ برداشت کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ میری 28۔نومبر، 2001 کی ڈائری کچھ یوں ہے:

''ماں کو مرے آج 23 برس بیت گئے، بحسابِ قمری۔ وہ غم، وہ دُکھ اور گھاٹا جو ماں کے جانے سے برداشت کرنا پڑا، اُس کی کسک آج تک محسوس کر رہا ہوں۔''

ہُوا یہ کہ ایک اختلافی مسئلہ پر خاندان دو حصّوں میں بٹ گیا۔ میرے پانچوں بھائی فریقِ ثانی کی جھولی میں جا گرے، یہ جانے بغیر کہ کِس نے کِس کے ساتھ کتنی زیادتی کی۔ بس مصلحت تھی کہ تنہائی اور غُصہ ہمیشہ کمزور کے حصّے میں آتے ہیں، بل کہ غُصہ تو نام ہی کمزور کے سامنے اپنی طاقت کے اظہار کا ہے۔ سو میرے حصّے میں یہ چھاج بھر بھر کے آیا۔ لیکن مخلوقِ خدا نے جتنا غُصّہ دکھایا، اللہ نے اُتنی ہی کرم کی بارش کی۔ مثلاً 14۔دسمبر، 2001 کی ڈائری کا ورق ہے:

''آج جمعۃ الوداع تھا، اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کا دن۔ کیا کھویا، کیا پایا، اللہ ہی جانتا ہے۔ انتہائی خوش آئند بات یہ ہے کہ ایک بار پھر رمضان کے پورے روزے رکھنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ کم از کم گزشتہ بیس سالوں میں مَیں نے فرحت کو پورے روزے رکھتے نہیں دیکھا تھا، اِس بار اُسے بھی اللہ نے ہمت سے نوازا۔''

اللہ کی مزید عنایت دیکھیے:

'' آج شام 4:30 بجے پہلی بار میری آواز ریڈیو پاکستان سے فضاؤں میں گونجی۔ مَیں فرحی اور بچے بہت خوش تھے۔ ابتدائیہ تھا:

سامعین! آؤ نبی اکرمؐ دی ولادت پاک تے گل کردے ہاں۔''

سو اُن ایّام میں خاندانی ناراضیوں پر اللہ کی رحمت حاوی رہی۔ بہرحال اس بات کا قلق رہا کہ خاندان بٹ گیا اور عید پر بھی میرے برادرانِ عزیز نے میرا بائیکاٹ جاری رکھا۔ اِن حالات میں میرے شفیق والد نے وہی کیا جو اُنھیں کرنا چاہیے تھا۔ اُنھوں نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا اور مجھے حوصلہ دیا۔ جمعہ اور عید کے روز

وہ مساجد بدل بدل کر نماز ادا کیا کرتے تھے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ شہر کی کس مسجد میں ہیں لیکن اس عید پر اُنھوں نے حکم دیا کہ نماز اکٹھے پڑھیں گے۔ 17۔دسمبر کی ڈائری کا ورق ہے:

''آج عید الفطر ہوگئی۔مَیں ،فیصل اور ابّا جی نے سٹیڈیم میں نمازِ عید ادا کی۔کئی بھولے بسرے لوگ یاد آئے۔''

'شعبِ ابی طالب' میں گزرتے ان ایّام میں ابّا جی نے ماضی کی طرح ایک بار پھر میری بہت زیادہ مدد کی۔ایک بار اُنھیں میرے ساتھ گھر بدر ہونا پڑا تھا اور اب کے بار وہ مجھے خود ساختہ گھر بدری سے باز کر رہے تھے۔

ابّا جی کثیر العیال آدمی تھے اور معاشی لحاظ سے کمزور تھے لیکن اللہ نے اُنھیں بے پناہ عقل و دانش سے نوازا ہوا تھا۔اُن کا ہر فیصلہ درست ہی ہوتا تھا اور اگر ہمیں وقتی طور پر کوئی اختلاف ہوتا بھی تو بعد کے حالات اُسے درست ثابت کر دیتے۔وہ عجز و انکساری کا مجسّمہ تھے اور عمر بھر محنت مزدوری کے ساتھ عبادت و ریاضت میں مصروف رہے۔

شفیق پوروں کا لمس پا کر بدن صحیفے میں ڈھل رہا تھا
ضعیف اُنگلی کو تھام کر مَیں بڑی سہولت سے چل رہا تھا

(حماد نیازی)

## دُکھوں کے جھمیلے اور 2002 کا 'z'

کیاست وزیرکی ایسی نعمتِ خداوندی ہے جو اِنسان کو حیوان سے جُدا کرتی ہے۔زیرک انسان میں ولی اللہ کی سی خوبیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ بابا ٹوہری کہا کرتے تھے کہ''اولیائی تے دانائی دے کنڈھے رلدے نیں''،یعنی دانائی اور ولایت ایک جگہ پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اللہ صرف دانا اور ولی اللہ کی ہی راہنمائی اور مدد کرتا ہے۔اس کے اپنے فیصلے اور اپنا اختیار ہوتا ہے۔وہ عام انسانوں میں بھی جس کی چاہے راہنمائی کرتا ہے جس طرح اپنے برگزیدہ بندوں اور انبیاء کی کرتا ہے۔نبوّت کا سلسلہ ختم ہو چکا، وحی کا نہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم محتاط رویّہ اپناتے ہوئے اسے وحی کا نام نہ دیں، کوئی دوسرا نام دے لیں، اگرچہ اللہ نے کئی مقامات پر اپنی غیر نبی

مخلوق پر وحی نازل کی۔ مثلاً:

وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوۡسٰٓى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ‌ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِى الۡيَمِّ وَلَا تَخَافِىۡ وَلَا تَحۡزَنِىۡ‌ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَجَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ‏ o

(القصص:7)

(اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کی طرف وحی نازل کی کہ وہ اُسے (موسیٰ کو) دُودھ پلائے (اور کہا) پھر جب تجھے ڈر ہو اس کا تُو ڈال دے اس کو دریا میں اور نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو۔ ہم پھر پہنچا دیں گے اس کو تمھاری طرف اور کریں گے اس کو رسولوں میں سے)۔

اُمِّ مُوسیٰ جناب یوخابد بی بی تو نبی نہ تھیں لیکن اللہ نے اُن پر وحی نازل فرمائی محتاط رویّہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے اُنھیں حکم دیا یا الہام کیا...... اِسی طرح:

وَ اَوۡحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِىۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعۡرِشُوۡنَ (النحل:68)

(اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی نازل کی کہ پہاڑوں میں گھر بنالے، اور درختوں میں اور اُن میں جہاں لوگ چھپر بناتے ہیں)۔

پھر سیّدہ مریم کی طرف حضرت جبرائیل کا آنا اِس بات کی قوی دلیل ہے کہ اللہ کا اپنی غیر نبی مخلوق کو براہِ راست پیغام دینا اُس کی کبریائی کے ہرگز خلاف نہ ہے:

فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا o قَالَتۡ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا o قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا o

(مریم:19-17)

(پھر بھیجا ہم نے اُس کے پاس اپنا فرشتہ جو بن کر آیا اُس کے سامنے آدمی پورا۔ کہنے لگیں مجھ کو رحمٰن کی پناہ تجھ سے اگر ہے تُو ڈر رکھنے والا۔ (جبرائیل نے) کہا کہ مَیں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے رب کا کہ دے جاؤں ایک لڑکا پاکیزہ)

محبوبِ خدا حضرت محمدؐ کا ارشادِ پاک ہے کہ مومن کا نیک خواب نبوّت کا چھیالیسواں حِصّہ ہے۔سیّدِ ہجویرعلی بن عثمانؒ لکھتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامی خودفرماتے ہیں کہ میں جب پہلی بار حج کے لیے گیا تو خالی مکان دیکھ کر گمان گزرا کہ حج مقبول نہیں ہوا۔ایسے پتھر تو میں نے دُنیا میں بہت دیکھے ہیں۔ جب دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو خانہ کعبہ کو بھی دیکھا اور صاحبِ خانہ کو بھی۔اس وقت میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ابھی مَیں توحید کی حقیقت سے دُور ہوں اور جب تیسری بار حاضر ہوا تو بس صاحبِ خانہ ہی نظر آیا، گھر نظر نہ آیا۔اُس وقت غیب سے ندا آئی،اے بایزید! جب تم نے اپنے آپ کو نہ دیکھا اور سارے جہاں کو دیکھا تو تم مشرک نہ ہوئے لیکن جب تم نے سارے عالم کو نہ دیکھا اور اپنے آپ پر نظر رکھی تو اب تم مشرک ہو گئے۔اسی وقت اِس خیال سے توبہ کی اور اپنی رویت سے بھی توبہ کی۔حضرت بایزید بسطامی کا یہ فرمان صاحبانِ حال کے لیے عمدہ نشانی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی نازل نہ فرمائی کہ آپ نبی نہ تھے اور الہام وخواب کا بھی انتظار نہیں فرمایا بل کہ جونہی اپنے بندے کو بھٹکتے دیکھا،ایک نِدا کے ذریعے حال کی درستی فرمادی۔لہٰذا ایک مادہ پرست طبقے کا یہ اِصرار کہ اللہ اپنے قوانین نہیں بدلتا،ایک بھونڈی ضد کے سِوا کچھ نہیں۔قانون تو یہ بھی ہے کہ مالکِ یومِ الدّین نیک اعمال والے کو بخش دے گا اور گناہ گار کو سزا دے گا،لیکن ہم تمام عمر سیاہ کاریوں میں مبتلاء رہنے کے باوجود بخشش کی اُمید لگائے رکھتے ہیں،اور وہ خود کہتا ہے کہ وہ جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔

اہلِ علم نے اللہ کی طرف سے پیغام رسانی اور راہنمائی کی درجہ بندی کی ہے۔وہ کیاست وزیرکی کو 'فراست' کا نام دیتے ہیں۔دوسرا درجہ 'حدس' کا ہے،تیسرا کشف،چوتھا الہام اور پانچواں وحی کا ہے۔حواسِ خمسہ کی طرح انسان کے پانچ حواس باطنی بھی ہیں اور وہ عقل،دل،سر،روح اور خفی ہیں۔

اِن تمہیدی کلمات کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مصنفین اور صوفیاء جب اپنے روحانی تجربات بیان کر رہے ہوتے ہیں تو وہ دراَصل خلقِ خدا کو راغب کرنے کے لیے جھوٹ تراش رہے ہوتے ہیں،اُنھیں اپنی سوچ کا زاویہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ

قدرت اللہ شہاب، واصف علی واصف، ممتاز مفتی، اشفاق احمد اور اِس سطح کے دیگر بزرگوں پر بھی دروغ گوئی کی تُہمت دھرنے سے باز نہیں آتے اور اگر کوئی واقفِ حال ایسے لوگوں کو کسی صاحبِ کشف سے ملنے کی دعوت دیتا ہے تو جواب ہوتا ہے کہ ''بہت دیکھے ہیں ایسے۔''

مَیں گزشتہ رُبع صدی سے اپنے حلقہٗ احباب کے مختلف مکاتبِ فکر کے دوستوں کو اپنے ہی شہر کے ایک 'عام سے خاص' آدمی سے ملاقات کا کہہ رہا ہوں لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ ہیں۔ مَیں نے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے کہ مَیں نے اُن پر کروڑوں روپے کے کرنسی نوٹ نچھاور ہوتے دیکھے ہیں اور اُنھوں نے مجھے اور اِس شہر کے درجنوں لوگوں کو دِکھایا کہ لَیۡلَةُ الۡقَدۡرِ میں تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ کا کیا مطلب ہے۔ المیہ یہ ہے کہ جونہی مَیں یا مذکورہ دوست اس دُنیا سے چلا نا کر جائیں گے تو کہا جائے گا کہ ایک دروغ گو رُخصت ہو گیا۔

یہ 2002 کے موسمِ بہار کی بات ہے کہ معاشی اور معاشرتی مسائل نے ایک بار پھر مجھے تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ ان مسائل نے میری خانگی زندگی پر بھی انتہائی منفی اثرات مرتّب کیے اور قریب تھا کہ کوئی بڑا حادثہ پیش آ جاتا۔ کچھ غلط فہمیوں نے معاملات کو مزید اُلجھایا اور اِس حد تک اُلجھایا کہ میں روز مرتا اور روز جیتا تھا۔ میری صحت خطرناک حد تک خراب ہو گئی اور مجھے کھانسی کے ساتھ خون آنا شروع ہو گیا۔ مَیں خاموشی سے آخری سانسوں کے انتظار میں جیتا رہا اور بوقیزار کی لکڑی کی طرح سُلگتا رہا۔ اِن حالات میں ایک روز میرے ایک رفیقِ کار مقصود چیمہ نے، جن کے بھائی سروسز لاہور میں ENT سپیشلسٹ تھے، مجھے کسی ماہرِ امراضِ سینہ سے مشاورت کا مشورہ دیا بلکہ بھائی کی وساطت سے میو ہسپتال لاہور میں مرے معائنے کا بھی بندوبست کر دیا۔ میرے ایک دوسرے رفیقِ کار اعجاز احمد نے میرا ساتھ دیا اور میو ہسپتال کے ڈاکٹرز سے میرا PFT کرا دیا۔ پلمنری ٹیسٹ کی رپورٹ پر Severe Asthma کی تشخیص ہوئی اور کہا گیا کہ اگر توجّہ نہ دی گئی تو جلد پھیپھڑے ناکارہ ہو سکتے ہیں۔ مَیں اِن حالات میں اِس حد تک قنوطی ہو چکا تھا کہ مجھے اُمید کی کوئی کرن نظر ہی نہ آ رہی تھی۔ مَیں خود کو ایسا بوریا دیکھ رہا تھا جو کبھی تختِ سلیمان نہ ہو سکے۔ مایوسیوں کی ان اتھاہ گہرائیوں میں میری زندگی میں ایک طاقت ور کردار

نمودار ہوا اور وہ کردار تھا 'Z' کا۔

'Z' نے میری مدد اور راہنمائی شروع کی تو حالات تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ ابتدائی ایّام میں 'Z' کے بارے مَیں نے کھوج کاری کی کوشش کی لیکن جلد ہی یہ کوشش ترک کر دی۔ وہ کبھی ایک دھند لکے کی شکل میں ظاہر ہو کر اشاروں کنایوں میں میری راہنمائی کرتا، کبھی کبھار کچھ بولتا اور کبھی اُس کی آمد پر مَیں یہ فرض کر لیتا کہ وہ مجھے یہ ہدایت کر رہا ہے۔ اور یہ ''فرض'' ہی دراصل حدس، کشف یا الہام تھا۔ مَیں اسے کوئی خاص نام دینے سے قاصر ہوں۔ اِس 'حادثاتی ملاقات' کے بعد میرے قلب کو ایک اطمِنان نصیب ہوتا اور میں اِس خاص جانب سٹیرنگ وہیل کو گھما دیتا جو بالآخر منزلِ مقصود کا درست راستہ ثابت ہوتا۔

یہاں مجھے اِس بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن دِنوں مَیں کثرت سے درودِ ابراہیمی پڑھا کرتا تھا۔ درودِ پاک کی برکات و فیوض سے کوئی مسلمان بھی انکاری نہ ہے۔ اللہ کا ہر کام بس لفظ 'کُن' کا محتاج ہے۔ اُس کا سارا نظام آٹو میٹک ہے لیکن دو کام ایسے ہیں جو وہ mannually کرتا ہے۔ وہ کُن فَیَکُوْن کے حلقۂ کار میں نہیں آتے۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے محبوبؐ پر درود و سلام پڑھتا ہے اور دوسرا یہ کہ وہ جنت میں ہمارے محلّات کو ڈیکوریٹ کرتا ہے۔ تو اِس سے درودِ پاک کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے کہ ایک بار مَیں اور فرحت جاوید کسی کام کی غرض سے پیدل ہی گھر سے نکلے۔ چلتے چلتے ہم نے ایک غیر مانوس سی خوشبو محسوس کی۔ تھوڑا آگے بڑھے تو دیکھا کہ میرا چھوٹا بھائی ارشد علی ہاتھ میں تسبیح لٹکائے کچھ پڑھتے جا رہا ہے۔ جوں جوں ارشد کے قریب ہوئے، خوشبو کی شِدّت میں اضافہ ہوتا گیا۔ فرحت کو جب یقین ہو گیا تو کہنے لگی کہ ارشد درودِ پاک پڑھتا جا رہا ہے اور آج اس نے کثرت سے درودِ پاک پڑھا ہے۔ یہ خوشبو اسی سے آ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد ارشد کو احساس دِلائے بغیر مَیں نے جان کاری کی تو پتہ چلا کہ فرحت کا خیال درست تھا۔ مجھے 'Z' نے بتایا کہ اس وقت ارشد کے گرد ملائکہ کا ایک حلقہ موجود تھا۔

'زی' نے 2005 میں میرے ساتھ روابط منقطع کر دیے، نجانے کیوں! لیکن مجھے تو رابطے قائم کرنے کی وجوہ کا بھی علم نہیں۔

عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ

# مَیں ،اجمل نیازی اور ریفرنڈم 2002

ضیاءالحق کے دسمبر 1984ء کے ریفرنڈم کے نتیجہ میں حبیب جالب کی نظم 'ہو کا عالم' اہلِ نظر کو نصیب ہوئی تو پرویز مشرف کا ریفرنڈم 2002 ہم اہلِ قلم کے ایک بڑے نام ڈاکٹر اجمل نیازی کی عظمت میں اضافے کا باعث بنا۔ پرویز مشرف کے ماضی کو دیکھا جاتا تھا تو وہ خود ایک بڑا اور جرأت مند انسان نظر آتا تھا لیکن یہ بندوں پر بندوں کی خدائی کا نشہ اِتنی بُری چیز ہے کہ 'بڑوں' کو چھوٹا کر دیتا ہے۔ ریفرنڈم تو 30۔اپریل کو ہوا لیکن ان حالات کی تصویر کشی پر ایک دانش ور استاد کو 27۔اپریل کو ہی برطرف کر دیا گیا۔ جُرمِ ضعیفی کی یہ سزا بظاہر سرکار کا نوکر ہو کر، آئین و قانون کی توہین کرنے والوں کے خلاف زبان کھولنے پر دی گئی۔ میری ڈائری کے 27۔اپریل کے صفحہ پر شعر درج ہے:

نثار مَیں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

اور یکم مئی کا صفحہ دیکھیئے:

''آج جناب ڈاکٹر اجمل نیازی سے ٹیلی فون پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔اُن کا حوصلہ بلند ہے اور وہ کسی معذرت خواہانہ رویّہ کے لیے تیار معلوم نہیں ہوتے۔اُنھوں نے گورنر پنجاب کی جانب سے بنائی گئی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ڈاکٹر صاحب کی dismissal سے گورنر پنجاب خالد مقبول کی ذات پہچاننے میں بڑی مدد ملی ہے۔''

مَیں بھی ایک پبلک سرونٹ تھا لیکن ریفرنڈم کے اِس بھونڈے مذاق کی جتنی مخالفت اور تذلیل مجھ سے ہو سکی، مَیں کرتا رہا ہوں۔مَیں حبیب جالب تو نہ بن سکا لیکن رائے ساز 'خاندان' کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتا رہا۔

# سیرت النبیؐ پر کُتب کی نمائش

رحمت اللعالمین نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک بار جناب عمرؓ بن خطاب سے دریافت فرمایا کہ عمرؓ! یہ بتاؤ کہ تمھیں میرے ساتھ کس حد تک محبت ہے۔ فاروقؓ نے جواب دیا کہ یارسول اللہ! اپنے جسم وجاں کے بعد جس کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے، وہ آپؐ ہی تو ہیں۔ رسولِ رحمتؐ نے فرمایا کہ ''عمرؓ! جان لو، تمھارا ایمان اُس وقت تک مکمّل نہیں ہوگا جب تک تم مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز نہیں سمجھتے۔'' اِبنِ خطّاب نے سر جھکایا اور عرض کی کہ ''اے اللہ کے محبوب! اب ایسا ہی سمجھوں گا۔''

نبیؐ کی ذات سے محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے اور یہ شرط عاشقانِ نبیؐ روزِ اوّل سے نبھاتے آ رہے ہیں۔ چشمِ فلک نے کبھی ایسا نظارہ نہ دیکھا ہوگا کہ میدانِ کارزار میں عمرؓ بن خطّاب نے سگے ماموں عاص بن ہشام، ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بیٹے عبدالرّحمٰن، ابوحذیفہؓ نے اپنے باپ عتبہ، مصعبؓ بن عمیر نے اپنے بھائی ابوعزیز بن عمیر، علی المرتضیٰؓ نے اپنے بھائی عقیل بن ابوطالب اور جناب حمزہ نے اپنے بھائی عباس کے خلاف تلواریں سونت لی ہوں۔ نبیؐ کی محبت دُنیا کی ہر محبت پر غالب آ گئی اور یوں ہی آتی رہے گی۔

2003 کے اواخر تک سیرت النبیؐ پر اپنے کام کی تکمیل کے لیے مَیں سینکڑوں کتب کا مطالعہ کر چکا تھا جن میں عربی، اُردو، فارسی، انگلش اور پنجابی زبان کی کُتب شامل تھیں۔ مَیں نے آقاؐ سے محبت کے اظہار کے لیے وہ کتب بھی خرید رکھی تھیں جو مَیں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ مثلاً فرینچ، ہسپانوی، پشتو اور ملائی زبانوں میں سیرت النبیؐ کی کتب بھی میرے پاس موجود ہیں۔ ربیع الاوّل میں میرے من میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ یہ کُتب زیارت کے لیے اہلِ فکر ونظر کو پیش کی جائیں۔ لہٰذا 2۔ جنوری، 2004 کو میرے زیرِ مطالعہ تمام تر کُتب کی نمائش کا اہتمام کیا گیا جسے لوگوں نے بے حد پسند کیا۔ ایک ایسا معاشرہ جسے کتاب اور صاحبانِ قلم وکتاب کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ان کی تذلیل وتضحیک کی جاتی ہے، وہاں کتب کی نمائش بڑی عجیب حرکت لگتی ہے لیکن میرا شوق اِس سوچ پہ غالب آ گیا۔ اور یوں شہر کے مہذب اور تعلیم یافتہ

طبقے نے اس میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اِس نمائش پر احباب کی آراء میرے پاس محفوظ ہیں۔ کچھ آپ بھی پڑھیے:

''سیرت النبیؐ پر کثیر کتب کا ذخیرہ ان کی والیٔ کائنات سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''

(مدرّس حدیث) فیاض الحسن جمیل الازہری

''یہ یقیناً شیخوپورہ جیسے شہر میں منفرد نوعیت کی تقریب تھی''

پروفیسر ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک FC یونیورسٹی لاہور

''مجھے از حد خوشی ہو رہی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی یلغار اور خیالات کی پراگندگی کے دور میں ایک دیوانہ ہمیں اس شاہراہ پر لے جانا چاہتا ہے جہاں سے انسان پاکیزہ کردار اور محبتِ الٰہی کی منزل کو پا سکتا ہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر خالد ندیم

HOD سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

یہاں یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر اِس نمائش میں عوام الناس یا کاروباری بندے کی کوئی دلچسپی نہ تھی تو یہ کوئی حوصلہ شکن بات نہ تھی کہ مطالعہ تو تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ طبقے کا کام ہے، عوام الناس کا نہیں اور یہ بھی کہ ارب پتی تاجر کی تجوری میں ڈکشنری نہیں ہوتی۔ آپ قارئین اور لکھنے والے خوش رہیے کہ آپ کا سربراہ خود اللہ ہے۔

# آہ، میرے خان صاحب (تلقین شاہ)

یہ 7۔ستمبر 2004 کی شام تھی۔مَیں سالانہ انسپکشن کے سلسلے میں سارا دن کچھ نااہل افسران کی بک بک سُن کے شدید ذہنی اور جسمانی کرب محسوس کرر ہا تھا۔ مجھے ہر چیز تھکی تھکی اور بے رنگ نظر آ رہی تھی۔ سانس یوں چل رہی تھی کہ جی چاہتا تھا کہہ دوں 'بھلے نہ چلو، میری بلا سے'۔اچانک خیال آتا ہے کہ گھر میں کوئی دوائی بھی نہیں ہے۔مَیں نے گاڑی ایک میڈیکل سٹور کے سامنے کھڑی کی۔کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ ادویات لکھیں ......اچانک میرا موبائل فون چیختا ہے۔مَیں حسب عادت لمبا سا 'جی' کہتا ہوں۔

میری بیٹی مجھ سے پوچھ رہی ہے'' بابا بہت دیر کردی آج آپ نے۔آپ کیا جنازے میں ہیں؟''

''کیا کہہ رہی ہو، کس کا جنازہ؟'' میں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

کیا مطلب؟ آپ اُن کے دوست ہیں اور آپ کو اُن کی موت کی خبر نہیں؟

کِس کی موت بیٹا، جلدی بتاؤ کیا ہوا؟

بابا! وہ اشفاق صاحب فوت ہو گئے ہیں نا!

کب؟ کس نے بتایا ہے تمھیں؟ کیا ہوا انھیں؟ مَیں نے کتنے ہی سوال کر دیئے اور ذہن میں ایک مائیکرو سیکنڈ میں کتنے ہی غلط ملط خیالات آتے گئے۔

اشفاق ابھی کل تو میرے ساتھ تھا۔ ہم نے بیڈن روڈ سے اکٹھے آئس کریم کھائی تھی؛ گھومے پھرے تھے؛ گپ شپ کی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر میرے دفتر میں بھی بیٹھا رہا۔ اچھا بھلا تھا وہ۔ خدایا! یہ کیا ہو گیا۔کس کی نظر بد کھا گئی اُسے۔اب کیا ہو گا؟ ہمارے خاکے کون لکھے گا؟ ارشد نعیم کیا کرے گا؟ نوید رضا پہ کیا بیتے گی۔میرا دھیان ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک کی طرف چلا گیا۔دوسری طرف مونا کی آواز آتی ہے۔

''ہاں بابا! مَیں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔وہ جن سے 'زاویہ' دیکھنے کے بعد آپ ٹیلی فون پر بات کیا کرتے تھے، وہ چل دیئے۔''

اِنّـا لِـلّٰـهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ بیٹا میں تو شیخو پورہ پہنچ چکا ہوں، اور لیٹ ہونے کی وجہ تو دفتر کی انسپکشن تھی۔

فون بند ہو گیا اور مَیں سوچنے لگا کہ اب 'ایک محبت سو افسانے'، 'گڈریا' اور 'اُجلے پھول' جیسے افسانوی مجموعے پھر کبھی ترتیب نہ پائیں گے۔ اب 'سفر در سفر' جیسے سفرنامے اپنا سفر پورا کر گئے۔ اَب 'توتا کہانی' کبھی نہ سنی جا سکے گی۔

مجھے یاد آیا کہ میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا جب 1965 میں پہلی بار مَیں نے اپنے گاؤں کے اکلوتے ٹرانسسٹر ریڈیو پر تلقین شاہ کی آواز سنی۔ اُن کی گفتگو ''تیں ہدایت اللہ! بے ہدائتا ای رہنا ایں'' سے شروع ہوتی تھی اور دل کی گہرائیوں میں جا کے ختم ہوتی تھی۔ ریڈیو پر ان دنوں میری دلچسپی پرکاش کور کے گیت اور تلقین شاہ کی تلقین ہی تو ہوا کرتی تھی۔ تلقین شاہ 1995 یا 1996 کے اُن ایام تک جاری رہا جب اشفاق احمد خاں کا اوڑھنا بچھونا تصوّف بن گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ 'توتا کہانی' اور 'من چلے کا سودا' تصوّف غالب آنے کے بعد کی تخلیقات ہیں لیکن اس بحث سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اشفاق احمد خاں بہرحال تصوّف کی راہ پہ چل نکلے تھے۔

مَیں نیم مردہ سی حالت میں گاڑی کا سٹیرنگ وہیل تھامے طارق روڈ (شیخوپورہ) کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجھے 'زاویہ' یاد آیا۔ زاویہ کے ''بابے'' یاد آئے۔ بابوں کی باتیں یاد آئیں۔ اپنی ہی ٹیلی فونک گفت وشنید یاد آئی کہ مَیں کس طرح اُن سے الجھا کرتا تھا اور وہ تھے کہ مُسکرا مُسکرا کر نہایت ہی تحمل سے میری باتیں سنتے اور جواب دیئے جاتے۔ اس دن مَیں بہت خوش تھا جب عیدالفطر پر میرا ارسال کردہ عید کارڈ مجھے زاویہ کی نشریات کے دوران اُن کی میز پر نظر آیا۔ زاویہ کے سلسلے کا پروگرام 'میں کون ہوں' تو مجھے شدت سے یاد آیا۔ آپ فرما رہے تھے:

''آپ کے جتنے بھی ایم این اے زاور ایم پی اے ز ہیں، یہ ہمارے بارے میں بیٹھ کر فیصلے کرتے ہیں لیکن وہ خود یہ نہیں جانتے کہ وہ کون ہیں۔ یہ ایسے تیراک ہیں جو ہمیں بچانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انھیں خود تیرنا نہیں آتا، سیکھا ہی نہیں اُنھوں نے۔ جو گہری نظر رکھنے والے لوگ ہیں وہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔ یہی ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ مَیں کون ہوں اور سارے معاملے اور کائنات میں کہاں فِٹ ہوں۔ اس کے لئے ہمارے بابوں نے غور کرنے اور سوچنے کے بعد اور بڑا لمبا وقت گزارنے کے بعد اپنی طرز کا طریقہ سوچا ہے، جس کے کئی رُخ ہیں۔ آسان لفظوں میں وہ اس

طریق کو فکر یا مراقبے کا نام دیتے ہیں''۔

مَیں طارق روڈ کے قبرستان کے قریب پہنچا تو مجھے موت شدت سے یاد آئی۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ اگر واقعتاً اشفاق احمد خاں، جیسا کہ میری بیٹی نے بتایا، صبح فوت ہو گئے تھے تو اِس وقت اُنھیں قبر میں اُتارا جا چکا ہو گا۔ پوچھنے والا پوچھ رہا ہو گا کہ ''بابا! کیا لائے ہو؟'' بابا کہہ رہا ہو گا ''تلقین لایا ہوں''۔

کچھ اور بھی ہے تیرے دامن میں؟

ہاں ''محبت'' ہے اور ''بابوں کی باتیں''

''کوئی بات سناؤ'' پوچھنے والا پوچھ رہا ہو گا اور اشفاق صاحب نے بات شروع کر دی ہو گی۔ پوچھنے والا پوچھ رہا ہو گا کہ کون ہے یہ بابا جس کی باتیں سُنا رہے ہو؟

''سمجھ لو مَیں ہی ہوں''

اَب پوچھنے والا مُسکرا رہا ہو گا اور یہ دُعا دیتے ہوئے رخصت ہو رہا ہو گا، کہ ''اللہ آپ کو آسانیاں نصیب فرمائے''۔

مَیں پیر فتح دین قبرستان سے کچھ آگے نکل آیا تو خیال آیا کہ اَب تو سارے لوگ اشفاق احمد خاں کو لحد میں اتار کر گھروں کو جا چکے ہوں گے...... ہاں اب وہ تنہا ہوں گے اور اُنھیں 'سفر در سفر' میں محفوظ اپنی یہ تحریر یاد آ رہی ہو گی۔

''رات کو T.V. پر جب میرے مرنے کی خبر نشر ہو گی تو بڑے لوگوں کو صدمہ ہو گا۔ بہت سے ناظرین آرزومند ہوں گے کہ میرے کسی پرانے پروگرام کی ایک جھلک دکھائی جائے۔ ٹیلی ویژن کی اس کوتاہی پر لوگ نکتہ چینی بھی کریں گے لیکن پھر دوسری باتوں میں الجھ جائیں گے۔ کچھ گھروں میں' جہاں لکھنے لکھانے کا کام ہوتا ہے میری موت پر افسوس کا اظہار کیا جائے گا کہ وہ ایک اچھا انسان تھا، لیکن اچھا انسان نہیں تھا''۔

مَیں بالآخر گھر پہنچ گیا۔ میری بیٹی مونا محبت سے میرے ساتھ اشفاق احمد خاں کی باتیں کرتی رہی۔ خبر نامہ چل گیا۔ وہی ہوا جو برسوں پہلے مرحوم نے لکھا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ مَیں

تو اُن کی باتیں سُن کر فون پر کہا کرتا تھا کہ ’’خان جی! آپ نے سچ کہا......اَب مَیں کسے کہوں کہ آپ نے سچ کہا......اَب وہ ہم میں نہیں ہیں بلکہ زیادہ درست تو یہ بات ہے کہ ہم اُن میں نہیں، وہ تو اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

خبر نامہ ختم ہوا تو مَیں سوچنے لگا کہ زمین اتنے بڑے بڑے آسمان کس طرح نگل جاتی ہے؟۔۔۔۔۔۔۔اس کا پیٹ کیوں نہیں بھرتا؟۔۔۔۔۔۔۔ یہ ہمارے ’بابے‘ ہم سے کیوں چھین لیتی ہے...... یہ تلقین شاہوں کو اتنی جلد اپنی پشت سے اُتار کر پیٹ میں کیوں لے جاتی ہے؟

اور۔۔۔۔۔۔۔۔اب تک یہی سوچ رہا ہوں۔

☆☆☆☆☆

**بے منزل مسافتیں:** فکشن کے ایک طالبِ علم کی حیثیت سے مَیں مکمّل ذمّہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ افسانہ نگار ایک ذہین و فطین آدمی ہوتا ہے۔ درمیانے درجہ کے آئی کیو لیول والا انسان کہانی تخلیق نہیں کر سکتا۔ افسانہ کیا ہے، اس پر میرا 50 صفحات کی ضخامت کا ایک مضمون ’جو بچے ہیں سنگ‘ میں دستیاب ہے۔ یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ فنِ افسانہ نگاری اگر مشکل ہے تو باعثِ راحت بھی ہے۔ مَیں اپنے مشکل پسند مزاج اور کہانی سے اپنی گہری دلچسپی کی وجہ سے کہانی تخلیق کرتا رہا ہوں۔ 1995 میں میرا افسانوی مجموعہ ’دُکھوں کے صحرا میں تنہا لڑکی‘ منصّۂ شہود پر آچکا تھا۔ اب کوئی دس سال کی طویل مسافت کے بعد 2004 میں دوسرا مجموعہ ’بے منزل مسافتیں‘ شائع ہو گیا۔

’بے منزل مسافتیں‘ میں پندرہ افسانے اور تین افسانچے شامل تھے۔ اِس مجموعے کے افسانے ’محبوبہ‘، ’چاندرات کے مسافر‘، ’چاچی‘، ’ٹکسالی گیٹ کی حسینہ‘ اور ’کمرہ نمبر 19‘ بہت پسند کیے گئے۔ ’کمرہ نمبر 19‘ ’ماورا‘ میں شائع ہوا تو اُردو زبان کے ایک بڑے نقاد انور سدید کے بھی زیرِ

مطالعہ آیا۔ اگلے شمارہ میں 'کمرہ نمبر 19' پر جناب انور سدید کی رائے شامل تھی۔ اُنھوں نے لکھا:

''اصغر علی جاوید کا افسانہ 'کمرہ نمبر 19' قاری کو اپنی لذّت انگیز گرفت میں لینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کا طریقِ عمل افسانہ نگار آغا بابر، احمد شریف اور سلیم خان گمی کی ٹیکنیک سے ملتا ہے۔ اُردو کے یہ منفرد افسانہ نگار بیانیہ میں جنس کا تڑکا بڑی فن کاری سے لگاتے تھے۔ 'کمرہ نمبر 19' کی مکین کی گفتگو، خاص طور پر اُس کے شوہر شوکت کے بارے میں اُس کی رائے بڑی خوفناک ہے اور اسے جنسی انتقام سے آلودہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اصغر علی جاوید نے کہانی کی روانی کو خوب قائم رکھا ہے اور تحیّر کو بھی برقرار رکھا ہے۔ چند مقامات پر ان کا اظہار loud ہو گیا ہے۔'' (ماورا، اکتوبر، 2008، ص: 58)

5۔ مارچ، 2005 کو 'بے منزل مسافتیں' کی تقریبِ پذیرائی گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں ہوئی جس میں میجر عبدالرحیم ثاقب، محترمہ گلِ رعنا رحیم، الیاس گھمن اور امریکہ میں مقیم معروف افسانہ نگار محترمہ فرحت پروین جیسے خوب صورت لوگوں نے شرکت کی۔ اِس یادگار تقریب کی صدارت دُنیائے اُردو کی سب سے ممتاز شخصیت جناب ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے فرمائی۔

میرے خیال میں 'بے منزل مسافتیں' کے افسانوں میں جو فنکارانہ چابک دستی موجود ہے اس سے اِس مجموعے کو میرے پہلے مجموعے 'دُکھوں کے صحرا میں تنہا لڑکی' پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے تھی۔ اِس سلسلے میں زیادہ تر دوست میرے ہم خیال تھے لیکن تقریب کے اختتام پر فرحت پروین نے مجھے علیحدگی میں کہا کہ ''وہیں کھڑے ہو، جہاں 10 سال پہلے تھے، آگے نہیں بڑھے''۔ مَیں نے اس بڑی افسانہ نگار خاتون کو سلام پیش کیا کہ اُس نے مکمّل غیر جانب داری سے اپنی رائے سے نوازا۔

'بے منزل مسافتیں' پر نوائے وقت کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

''اصغر علی جاوید زندگی کے ناظر ہی نہیں اس کے نقاد بھی ہیں۔ انھوں نے بے ہنگم زندگی کے نام ور گھمسان میں سوال اُٹھایا کہ کیا آپ دیکھنا پسند کریں گے کہ آک کا پودا کیسا ہوتا ہے۔ جب کہیں سے جواب نہ آیا تو انھوں نے نیلام گھر کے طارق عزیز کی طرح اِشارہ دیا کہ کونین کی وہ گولی جو شوگر کوٹیڈ نہ ہو، زبان پر رکھ کر بتائیں۔ خود اُنھوں نے اِس اِشارے پر عمل نہیں کیا بلکہ اپنے مؤقف کے واضح اظہار کے لیے 'لمحوں کی آگ میں جلتا سفر'، 'الف سے انار'، 'مجاہدہ زیرو نائن ون'، 'گھر سنگھ' اور 'چورنی' جیسے افسانے لکھے جو

بے رحم حقیقت نگاری کے ایسے نقوش قرار دیے جا سکتے ہیں جن کی داد سعادت حسن منٹو جیسا بے رحم حقیقت نگار ہی دے سکتا ہے۔ اِن افسانوں میں ہماری سماجی زندگی زندہ کرداروں کے عمل اور ردِّ عمل سے سامنے آتی ہے اور گردشِ لیل و نہار میں اِن کرداروں کی نفسیات کو منعکس کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کی کہانیوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ عباسی نے درست لکھا ہے کہ وہ حیران کر دینے والا فنکار ہے۔''

(سنڈے میگزین 10۔اپریل، 2005)

**بابا ٹوہری رُخصت ہو گئے:** دُنیا کے جھمیلوں سے نکل کر جب کبھی گاؤں جانا نصیب ہوتا تھا تو میری پہلی ترجیح گاؤں کے معروف قِصّہ گو بابا ٹوہری سے ملاقات ہوتی تھی۔ 2004 میں بابا ٹوہری چلانا کر گئے۔ اِسی طرح کے بزرگ اُستاد جناب اشفاق احمد خان (تلقین شاہ)، جعفر شیرازی، سعید شیخ، حفیظ تائب، نثار اکبر آبادی اور احمد بشیر بھی 2004 میں رُخصت ہوئے۔ بابا ٹوہری، اشفاق احمد خان اور حفیظ تائب جب بھی یاد آتے ہیں آنکھیں بھر آتی ہیں۔

**فاطمہ اسکول کی سالانہ تقریب 2005:** ہمارے اسکول کی سالانہ تقریب شروع سے ہی کمپنی باغ میں تعمیر شدہ ڈسٹرکٹ اسمبلی ہال میں منعقد ہوتی ہے اور وہاں بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ملک کی نامور شخصیات کو دعوت دی جاتی ہے کہ بچوں میں انعامات تقسیم کریں۔ 2005 میں بھی اِس مقصد کے لیے کھیل، ادب، تعلیم اور صحافت سے وابستہ لوگوں کو مہمانانِ اعزاز کے طور پر بلایا گیا جن میں پاکستان کی پہلی خاتون اولمپئین محترمہ شبانہ اختر، ہاکی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ اولمپئین اور چین کی ہاکی کے کوچ نوید عالم اور ڈاکٹر اجمل نیازی بھی شامل تھے۔ اوّل الذّکر دونوں کا تعلق میرے محکمہ سے تھا اور مؤخر الذّکر کا تعلق میرے شوق سے تھا۔ مَیں اور ڈاکٹر اجمل نیازی ایک دوسرے کی تحریریں پڑھتے رہتے تھے اور ہمارے درمیان محبت و احترام کا ایک اچھا رِشتہ قائم تھا۔ لٰہذا ان تینوں نے بھی دیگر مہربان دوستوں کی طرح میری آواز پر لبّیک کہا۔ اس تقریب کی خاص بات یہ ہے کہ وہاں 'Z' بھی موجود تھا۔ کہنے لگا کہ کہو: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن۔ عرض کیا کہ لاکھ بار کہوں گا۔ اُس کی مہربانیاں، نشانیاں اور نعمتیں تو بے شمار ہیں۔ یہ 'Z' سے میرا آخری رابطہ تھا۔

بد قسمتی سے 2021 میں مذکورہ بالا دونوں دوست دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔ نوید اپنی موت سے کچھ دیر پہلے شیخوپورہ کی معروف چائے پتی شاپ سے چائے خریدتا ملا تو کہنے لگا کہ ''بزرگو! ایک ہی شہر میں رہ کر اِتنی دُوریاں؟''مَیں نے کہا کہ دُوریوں کی وجہ پر بعد میں بات کریں گے پہلے 'بزرگو' کا لفظ واپس لو۔ وہ کتنی ہی دیر ہنستا رہا۔ ہم چائے کے بنڈل ہاتھوں میں تھامے وہاں گپ شپ کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ وہ بلڈ کینسر کے مُوذی مرض کا شکار ہو گیا ہے۔ 13۔ جولائی، 2021 کو یہ جوہرِ قابل لاکھوں دِلوں کو سوگوار چھوڑ کر اگلی منزل کو سدھار گیا۔ صرف تین ماہ بعد 18۔ اکتوبر، 2021 کو اجمل نیازی بھی چل بسے۔ 2021 میں مجھے سکول کی 2005 کی تقریب بہت یاد آئی کہ اُس روز لاتعداد قہقہے فضاؤں میں بکھرے؛ بہت سے طلباء و طالبات اور اُن کے والدین کے چہرے خوشی سے تمتماتے رہے اور سکول کا فوٹو گرافر نوید عالم، شبانہ اور اجمل نیازی کے ساتھ بچوں کے فوٹو بناتے بناتے تھک گیا۔

جیہڑے پتھر وانگ پہاڑاں آہے، اوہ لُون وانگوں گل ویندے ہُو

(سلطان باہو)

# 8۔ اکتوبر کا زلزلہ

خوب صورت اور عالی شان عمارات تعمیر کرنا ہماری تدبیر ہے، اِن عمارات میں رہنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں یہ تقدیر ہے۔ تدبیر اور تقدیر کی جنگ ازل سے رہی ہے اور آج بھی ہے۔ کچھ دیر پہلے مَیں برسوں پہلے کا لکھا ہوا اپنا ایک پنجابی افسانہ پڑھ رہا تھا جس میں مجھے یہ جملہ نظر آیا کہ ''تقدیرِ پڑ پا لوے تے جِت ایسے دی ہوندی اے'' (تقدیر انسان کے مقابل آ جائے تو بالآخر جیت اُسی کی ہوتی ہے)۔ تدبیر کبھی بھی تقدیر کو سرِنگوں نہیں کر سکتی۔ 2022 میں جن دِنوں مَیں اِن یادوں کو ماضی سے کشید کر کے سپردِ قلم و قِرطاس کر رہا تھا، ان دِنوں ایک تہائی سے زیادہ پاکستان غرقاب ہو چکا تھا۔ اِس آبی طوفان سے جس علاقے میں بہت زیادہ تباہی ہوئی ہے وہ پاکستان کا شمالی علاقہ تھا۔ سیلابی ریلے کئی منزلہ بلند و بالا عمارتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئے۔ سینکڑوں گاڑیاں، ہزاروں انسان اور لاکھوں مویشی آبی مخلوق کی طرح پانی میں تَیرتے نظر آئے۔ تقدیر، تدبیر کو بہا کر لے گئی کہ اسے اپنی منوانے کا ہُنر آتا ہے۔

یہ 8۔اکتوبر،2005 کی بات ہے۔ میں جناح ہال لاہور سے ملحقہ دومنزلہ عمارت کی بالائی منزل پر اپنے دفتر میں اپنے معمول کے کام میں مصروف ہوا ہی تھا کہ 8:52 پر عمارت نے جھومنا شروع کر دیا۔ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ بس اگلے ہی لمحے ہر چیز فنا ہو جائے گی۔کھڑکیاں اور دروازے چیخ رہے تھے اور پنکھے ساون بھادوں کے جھولوں کی طرح جھول رہے تھے۔کچھ سکون ہوا تو تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسرا جھٹکا لگا اور بس پھر ملک بھر سے تباہی کی خبروں کی آمد شروع ہوگئی۔معلوم ہوا کہ یہ پاکستان کی تاریخ کا بدترین اور عالمی تاریخ کا چوتھا بڑا زلزلہ تھا۔چند روز بعد پتہ چلا کہ تقدیر 85 ہزار افراد کو اُن کے پیاروں سے چھین لے گئی ہے۔دُکھ واَلم اور تباہی کی ناقابلِ فراموش داستانیں رقم کرنے والے اِس زلزلے کی کسک ابھی تک محسوس کی جا رہی ہے۔

8۔اکتوبر کے بعد کئی ایّام تک اس کے آفٹر شاکس نے لوگوں کے اندر خوف کی لہر دوڑا دی۔ مجھے بھی اہلِ خانہ نے گھر میں مقیّد رہنے کا مشورہ دیا۔تعلیمی اِدارے تو بند ہو ہی چکے تھے۔تو پھر مَیں کیا کرتا؟ نوکری نہ سکول! مَیں نے فیصلہ کیا کہ اُن تباہ حال اور بے یار و مددگار لوگوں کی مدد کی جائے جو اس وقت کھلے آسمان تلے تقدیر کے رنگ دیکھ رہے ہیں لہٰذا اپنے سکول میں ایک ریلیف کیمپ قائم کر دیا۔مَیں نے اپنی آواز میں ایک آڈیو ریکارڈ کر کے سکول کے لاؤڈ سپیکر پر چلا دی جس کا آغاز یوں تھا کہ سکول تو بند ہو گئے ہیں لیکن دوستو! اپنے اذہان وقلوب کو کُھلا رکھیں۔ازاں بعد مَیں نے کچھ آیاتِ کریمہ تلاوت کیں اور پھر لوگوں کو اِمداد کے منتظر لوگوں کی مدد کے لیے اُبھارا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے دو روز میں اسکول کا گیراج چائے بسکٹ، دُودھ، کمبل، کپڑوں اور دیگر اشیائے ضروریہ سے بھر گیا۔تیسرے روز بارش شروع ہوگئی تو مَیں نے چھت پر آہنی جال کے اُوپر پولی تھین شیٹ بچھا دی اور سامان کے تھیلے آگے منتقل کرنا شروع کر دیے۔چوتھے روز جب اسکول دو بڑے ٹرکوں کے سامان سے بھر گیا تو سوچنا شروع کیا کہ جس طرح اہلِ محلّہ نے میری ذات پر اِتنا بھرپور اعتماد کا اظہار کیا ہے، مَیں اُن کے اعتماد پر پورا اُترتے ہوئے حق داران تک یہ اِمانت کیسے پہنچاؤں گا۔لہٰذا مَیں نے اِمدادی اور فلاحی کاموں میں متحرک، شہر کی ایک انتہائی دیانتدار شخصیت سے رابطہ کیا اور گزارش کی کہ وہ یہ امانتیں وہاں تک پہنچائیں جہاں کوئی دوسرا امدادی کارکُن

نہ پہنچ رہا ہو۔ اللہ اُن کا بھلا کرے، اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور انتہائی دُشوار گزار راہوں سے گزر کر تڑپتی سسکتی آدمیت کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے۔

**شبِ برأت، 19 ستمبر، 2005 کی ڈائری کا ایک ورق:** ''مالک وخالق سے باتیں کرنے کا مزا آ گیا۔ بس وہ تھا اور وہ تھا۔ خفا نہیں ہے لیکن سُنتا بھی نہیں ہے بس یہی کہتا ہے ''کرتوت دیکھے ہیں اپنے'' .................. اور سچ مُچ مُنہ چھپانے کے سِوا کوئی چارہ نہ تھا۔ گزشتہ شبِ برأت کی طرح بات واضح نہیں کی گئی ............ حوصلہ ہی دیا ہے۔ اب کیا کروں؟ ............ وہ کچھ بتائے گا، عنقریب۔ پکّی بات ہے۔ کچّے برتن خریدنے والی بی بی کی طرح ٹھوک ٹھوک کے دیکھ رہا ہے مجھے............ وہ ہے تو صمد لیکن اِتنی بے نیازی بھی اپنے وارے میں نہیں ہے۔ پھر اگر مَیں نے کہا کہ ٹھیک ہے، تُو نہیں دیتا تو مَیں کسی اور سے مانگ لیتا ہوں تو پھر جھٹ سے ناراض ہو جائے گا ............ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

''مالک! کیوں لیتا ہے تُو میرا امتحان، جب مَیں خود ہی مانتا ہوں کہ مَیں پاس نہیں ہونے والا ............ مَیں نے کب کہا ہے تجھے، مجھے رول نمبر سلپ جاری کر، مجھے سنٹر الاٹ کر؟ کہا ہے مَیں نے؟''

**اہلِ اِسلام کی ایک 'عوامی غلطی'، لیکن قابلِ معافی:** یکم دسمبر، 2006 کو ہندوستان کے بین الاقوامی شہرت کے عالمِ دین اور سیرت نگار مولانا صفی الرّحمٰن مبارک پوری انتقال فرما گئے۔ میری ڈائری کا یکم دسمبر، 2006 کا ورق یوں ہے:

''اَلرَّحِیقُ الْمَخْتُوم کے مصنّف جناب مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری آج بھارت میں انتقال فرما گئے۔ اُن کی عمر 63 برس تھی۔ سچ ہے عاشقانِ نبیؐ کی ایک پہچان 63 برس کی عمر بھی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ذوقِ مطالعہ عطا کیے رکھا اور یوں بعدازاں پتہ چلا کہ نہ تو مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی عمرِ مبارک 63 برس تھی اور نہ ہی محبوبِ خدا رحمت اللعالمینؐ کی ظاہری حیاتِ پاک 63 برس تھی۔ مولانا کہیں 1942 میں پیدا ہوئے لہٰذا اُن کی عمر 65 برس بنتی ہے لیکن اصل معاملہ آقائے دو جہاںؐ

کی عمرِ پاک کا ہے۔ عام الفیل میں آنے والے ربیع الاوّل کا آغاز اتوار کو ہوا تھا اور یوں دوسرا سوموار 9۔ ربیع الاوّل کو بنتا ہے اور یہی اس شفیع المذنبین ؐ کا یومِ پیدائش ہے۔

نبیِ رحمت ؐ کی درست عمرِ مبارک کو سمجھنے کے لیے ہمیں اِس انتہائی اہم بات کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ عربستان میں اُن دِنوں تقویم کے بہت سے نظام مروّج تھے لیکن جنھیں لائقِ اعتبار گردانا جاتا تھا وہ یہی مقبولِ عام قمری اور شمسی نظام تھے۔ ان دونوں میں بھی حجازِ مقدّس میں قمری کیلنڈر کو فوقیت حاصل تھی۔ ظہورِ اِسلام سے کوئی ڈیڑھ دو صدیاں قبل اسے شمس قمری (Lunisolar) کیلنڈر میں تبدیل کر دیا گیا۔ اِس کا آغاز یوں کیا گیا کہ قمری سال کے پہلے مہینے محرّم کو دو ماہ کا کر دیا گیا۔ تین سال کے بعد دوسرے مہینے صفر کو ڈبل کر دیا گیا اور یوں یہ سلسلہ سال کے 12 مہینوں کے بعد دوبارہ محرم تک جا پہنچتا۔ اِس طرح یہ سال 12 مہینے اور 10 ایّام کا بن جاتا۔ اِس کی ایک مثال عہدِ حاضر میں لیپ کے سال کی موجود ہے جس میں ہم فروری میں ایک دن بڑھا کر 365 ایّام کے اوپر والے 6 گھنٹوں کو نظام میں ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔

لیپ کے فروری میں ایک دن کا اضافہ سائنسی مجبوری ہے لیکن عربستان کا شمس قمری (Lunisolar) نظامِ تقویم کاروباری مجبوریوں کی بناء پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اہلِ عرب چاہتے تھے کہ حج کا مہینہ ایسے موسم میں آتا رہے جب عرب میں تجارت کے لیے فضا سازگار ہو۔ اِس پری اِسلامک عربی کیلنڈر کو اِسلام نے تبدیل کر دیا اور یوں حج کو مرضی کے موسم میں لانے کی دوسوسالہ روایت کا خاتمہ ہوگیا اور اسلام میں قمری نظامِ تقویم رواج پا گیا لیکن یہ امر مسلّمہ ہے کہ عام الفیل میں بلکہ حضور پاک ؐ کی ساری مکّی زندگی کے دوران حجازِ مقدّس میں یہی شمس قمری نظامِ تقویم چلتا رہا جس میں سال زیادہ تر شمسی تقویم کے برابر ہوتا لیکن مہینوں کے نام عربی ہی مروّج رہے۔ اِس بحث کی بابت مَیں ہرگز دعویدار نہ ہوں کہ عالمِ اِسلام میں اِس کا آغاز پہلی بار کیا گیا ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ سیرت کی کسی معروف کتاب میں اِس نُکتہ پر قلم نہیں اُٹھایا گیا۔

اب ہم حضور ؐ کی ظاہری حیاتِ مبارکہ کی طرف آتے ہیں جسے 63 برس کہا جاتا ہے اور جسے 'الرّحیق المختوم' میں 63 برس چار دن کہا گیا ہے (عنوان: نزعِ رواں) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اپنے انتہائی لائقِ احترام علمائے علومِ اِسلامیہ اور سیرت نگاراں سے اِس بات کی وضاحت چاہیں کہ یہ 63

برس بحساب شمسی تقویم ہیں یا قمری تو ممکنہ جواب کیا ہوگا؟ ہم اہلِ اسلام کسی بھی طرح 63 برس کی عمرِ پاک ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہجرت سے قبل کے (Lunisolar) اور مابعدِ ہجرت کے قمری تقویم کے سال تو کسی ضابطہ کے تحت اکٹھے بھی نہیں کیے جا سکتے۔

تین سال کے بعد کسی قمری مہینہ کو ڈبل کر دینے کے بعد کسی نظامِ تقویم کو فطرت سے ہم آہنگ ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ شمسی اور قمری سال کے ایّام میں فرق 10 کا نہیں بل کہ زیادہ کا ہے۔ ایک قمری مہینہ میں 29.53 ایّام اور ایک قمری سال میں 354.37 ایّام ہوتے ہیں جبکہ شمسی سال میں 365.24 ایّام ہوتے ہیں۔ یوں یہ فرق 10 کا نہیں بل کہ 11 ایّام کا ہوتا ہے۔ پھر وہ نظام جسے دینِ اِسلام نے ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے متروک (obsolete) قرار دے دیا، اُس کے ترازو میں ہم حضورؐ کی حیاتِ پاک کو کیوں تولیں؟

تو پھر عمرِ مبارک کتنی تھی؟ یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے۔ اور اس کے جواب کا پہلا حصّہ یہ ہے کہ 63 برس 4 دن کہنے والے بزرگوں سے یہ دریافت کیا جائے کہ اُنھوں نے یہ جمع تفریق (Calculation) کس طرح کی ہے۔ ہمارے عہد کے ایک نامور پاکستانی سکالر نے جب یہ فرمایا تھا کہ حضورؐ پاک کی عمر 63 برس تھی اور اُن کی بھی خواہش ہے کہ وہ 63 برس ہی عمر پائیں تو کیا وہ اپنی عمر قمری حساب سے گن رہے تھے اور اگر نہیں تو کیا وہ آقائےؐ دو جہاں کی حیاتِ مبارکہ شمسی حساب سے 63 برس کہہ رہے تھے؟ اِس سوال کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے اور شاید ہمارے لائقِ احترام مذہبی راہنما، مصنّف اور سیرت نگار کے پاس بھی نہیں ہوگا، کیونکہ ہم نے اس کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے اور نہ ہی اس کے لیے کوئی کوشش۔

اب ہم ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ 'عام الفیل' میں بھی اور آج بھی، ''آج ہفتے کا کون سا دن ہے'' اور ''آج کیا تاریخ ہے'' کے سوال کا جواب سولر سسٹم کے پاس نہیں ہے، لیکن قمری تاریخ کی بابت آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آج پہلی تاریخ ہے، کیونکہ آپ نے رات کو ہلال کا نظارہ کیا تھا۔ اِسی طرح چاند دیکھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ آج چودھویں ہے۔ یہ سہولت شمسی نظام میں نہیں ہے لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے سالوں کی گنتی رسولِ رحمتؐ کی مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت سے شروع کی اور اِسلام نے سنِ

عیسوی کو own ہی نہیں کیا۔ اِس طرح ہم نے اپنا تقویمی تشخص اور جداگانہ حیثیت اگرچہ پوری قوّت اور اعتماد سے قائم رکھے لیکن ہم اسے اِنٹرنیشنلائز (Internationalize) نہیں کر سکے۔ یوں آج ہم اپنے آقاؐ کی ظاہر حیاتِ پاک 63 برس کا ذکر کرتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ یہ اس پیمانے میں تو 63 برس نہیں ہے جس میں ہم اپنی اپنی عمر کا حساب رکھ رہے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ ہم قمری تقویم یا Lunisolar کی گُتھیاں سُلجھانے کی بجائے یہ دیکھیں کہ ابرہہ نے خانہ کعبہ پر حملہ کی ناپاک سازش کب کی تھی۔ جواب ملے گا کہ یہ 571 عیسوی کی بات ہے۔ 22۔ اپریل پر بھی مسلم سیرت نگاروں اور مستشرقین کی ایک کثیر تعداد کا اتفاق ہے۔ وصالِ پاک کی تاریخ پر پہلے ہی کوئی اختلاف نہیں ہے، چونکہ یہ ایک یتیم بچّے کا یومِ پیدائش نہ تھا بل کہ دُنیا کے سب سے بڑے انسان کی رحلت کا دِن تھا، اور وہ تھا 8۔ جون، 632ء۔ یوں آج کے مروّجہ بین الاقوامی نظامِ تقویم کے مطابق اس شمعِ رسالت نے 61 سال، ایک ماہ اور 16 دن تک دُنیا میں اُجالا کیا، اگرچہ آج بھی بھٹکی ہوئی انسانیت اپنے مقدّر کی سیاہی اِسی روشنی سے دُور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

**مَیں جب جب خون کے آنسو رویا:** جب بھی امریکہ نے مسلم راہنماؤں کو قتل کیا مَیں خون کے آنسو روتا رہا۔ 30۔ دسمبر، 2006 کو ایک انتہائی قدآور مسلم شخصیت صدّام حسین کو پھانسی دے دی گئی، جس سے پورا عالمِ اِسلام چیخ اُٹھا۔ اگرچہ دُنیا بھر کے اہلِ تشیع نے اپنی رائے دوسرے پلڑے میں رکھی لیکن یہ جانے بغیر کہ اُنھوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ کیا خِطّے کی شیعیت نے اپنے علاقے کو صدّام کے خلاف سازشوں کا گڑھ بنا رکھا تھا یا صدّام نے اُنھیں اپنے خلاف بین الاقوامی سازش کا حِصّہ بننے پر مجبور کیا، یہ سوال ہنوز جواب طلب ہے۔ یہ صفحات اِس تنقیح کے لیے مختص بھی نہ ہیں۔ بعید نہیں کہ آج میری رائے 2006 سے کچھ مختلف ہو لیکن اِس پر کوئی دوسری رائے نہ ہے کہ اِس حادثہ سے سیاسیاتِ مسلمانانِ عالم کو شدید دھچکا لگا۔

اقتدار کے لیے مخالفین کو قتل کر دینے کا مکروہ طریق پوری دُنیا میں مروّج رہا ہے۔ ہم مسلمانوں میں یہ ذِلّت کچھ زیادہ ہی شِدّت سے نظر آتی ہے اور ہمارے ہندوستان میں تو اس کی بہت سی مثالیں موجود

ہیں۔ 17 ویں صدی میں اس کی ایک انتہائی لائقِ نفرت مثال انگلستان کے بادشاہ چارلس کی بھی ہے۔ جب اُس نے پارلیمنٹ کے طاقت ور لارڈز کی مرضی کے برعکس نظامِ سلطنت چلانے کی کوشش کی تو بادشاہ کو دہشت گرد، سازشی، قاتل اور ملک دشمن کے اِنھی ناموں سے نوازا گیا جن سے 2006 میں صدّام حسین کو۔شاہی فوج تِتّر بِتّر ہوگئی اور اُس وقت کے دُنیا کے طاقت ور ترین طبقے نے 1649 میں شہنشاہ چارلس کا سر لندن کے اسی وائٹ ہاؤس میں قلم کر دیا جہاں وہ خدائی کا دعویدار بن کر بیٹھا کرتا تھا۔اِسی طرح 2006 میں آج کی دُنیا کی سب سے بڑی طاقت نے اپنی خواہشات کے برعکس چلنے پر صدّام حسین کو پھانسی دے دی۔

پاکستان میں لیاقت علی خان کا قتل اگرچہ ہماری پیدائش سے پہلے کا ہے لیکن اُس کا دَور تو ہمیں بھی محسوس ہوتا ہے۔اُس شریف النفس انسان اور حضرت قائدِ اعظم کے معتمد ساتھی کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا، حالانکہ روس کے دَورے کا پروگرام پہلے ہی اُلجھاؤ کا شکار ہو چکا تھا۔ جب وزیرِ اعظم خواجہ ناظم الدین نے اس قتل کے انویسٹی گیشن افسر نواب زادہ اعتزاز الدین کو ریکارڈ سمیت طلب کیا تو اُسے ایک ائیر کریش میں قتل کر دیا گیا۔جہلم کے قریب تباہ ہونے والے اس طیارے میں ریکارڈ اور آئی۔او۔ دونوں ہی جل گئے اور جناب مشتاق احمد گورمانی وزیرِ داخلہ نے ازسرِ نَو تفتیش چاہی تو اُنھیں شدید ہدفِ تنقید بنایا گیا۔اُنھیں اسی طرح خاموشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا جس طرح ازاں بعد ضیاء الحق کے بیٹے اعجاز الحق کو دیا گیا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ فروری، 1958 میں لاہور ہائی کورٹ میں زیرِ سماعت مقدمہ 'گورمانی بنام زیڈ اے سلہری' میں جب عدالتِ عالیہ نے اُس وقت کے دستیاب ریکارڈ کی فائل طلب کی تو ایڈووکیٹ جنرل نے 25۔فروری کو فائل مہیّا کرنے کا وعدہ کیا۔25۔فروری کو عدالت میں یہ کہا گیا کہ فائل چیف سیکرٹری مغربی پاکستان کے پاس ہے۔لہٰذا اُسے سمن کیا گیا تو یکم مارچ، 1958 کو ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت میں بیان دیا کہ فائل کی تلاش ابھی جاری ہے۔پھر 8۔مارچ کی تاریخ مقرر کی گئی تو عدالت کو بتایا گیا کہ فائل کی تلاش ممکن نہ ہو سکی ہے۔یوں محبِّ وطن پاکستانیوں کی چیخ وپکار کے سوا اِس قتل کی کوئی دوسری بات ریکارڈ پہ نہ آسکی۔

ترُکی میں علی عدنان میندریس نے مصطفےٰ کمال کی پرو ویسٹرن پالیسی کو چیلنج کیا تو وہ ایک مقبول ترین راہنما کا درجہ حاصل کر گیا۔ اُس کی ڈیموکریٹ پارٹی 69 کے مقابلے میں 408 نشستوں سے کامیاب ہوئی تو اُس نے مغرب پرست اتاتُرک کے مزار کے سامنے ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی؛ ازسرِ نَو اصل عربی زبان میں اذان شروع کرائی؛ حجِ بیت اللہ پر پابندی اُٹھا دی؛ عُثمانی خاندان کو ترکی آنے کی اجازت دے دی اور اسلامائزیشن کا زوردار آغاز کر دیا۔ یہ انقلاب مغرب کو ایک آنکھ نہ بھایا اور 27۔مئی 1960 کو علی عدنان میندریس کی مقبولِ عام حکومت توڑ دی گئی اور فوج نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ چند ماہ بعد 17۔ستمبر، 1961 کو میندریس کو پھانسی دے دی گئی اور عالمِ اِسلام چیختا رہ گیا۔ اِس زخم کی کسک مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ تھی مغرب کو آنکھیں دکھانے کی سزا۔

22-24 فروری، 1974 کی لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس ایک تاریخ ساز واقعہ تھا جو مغرب کے لیے کِسی بھی طرح پسندیدہ اور لائقِ تحسین نہ ہوسکتا تھا۔ اس پر جو راہنما گردن زدنی ٹھہرے اُن میں بھٹو اور شاہ فیصل سرِ فہرست تھے۔ دوسری جانب شاہ فیصل نے تیل کو اِسلامی ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کرنے کی ٹھان لی تھی۔ امریکہ اس بات پر پوری توانائی صرف کرتا رہا کہ شاہِ عرب تیل کی قیمت بڑھانے سے باز آجائیں اور جو اضافہ کیا گیا ہے، اُسے واپس لائیں۔ 14۔اکتوبر، 1974 کے نیویارک ٹائمز کی ایک سُرخی تھی:

"Faisal Assures Kissinger of Aid to Cut Oil Prices"

لیکن چونکہ یہ ایک سیاسی ہتھیار تھا لہٰذا شاہ نے قیمت کم نہ کی۔ اور پھر عالمِ اِسلام کے ایک بڑے سیاسی اور روحانی راہنما کو 25۔مارچ، 1975 کو قتل کروا دیا گیا۔

لاہور کانفرنس کے ایک اہم شرکت کار مصر کے انور السادات کے قتل کا فتویٰ امریکہ میں مقیم بصارت اور بصیرت، دونوں سے محروم مولوی عمر عبدالرحمٰن سے لیا گیا۔ یاسر عرفات کو اسرائیلی ایجنسی نے زہر دے دیا اور لیبیا کے قذافی کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ بنگال کا شیخ مجیب اپنے 'آباء' کی مرضی کے خلاف او۔آئی۔سی کے اجلاس میں آیا تھا۔ امریکہ کا بین الاقوامی شہرت کا حامل صحافی

Lawrence Lifschultz اپنی معروف کتاب 'Bangladesh, The Unfinished Revolution' میں لکھتا ہے:

"C.I.A station chief in Dhaka, Philip Chery, was actively involved in the killing of the Father of the Nation---------- Banglabandhu Sh. Mujib ur Rehman."

شیخ مجیب ہماری تاریخ کا بدترین کردار اور رُوسیوں اور امریکیوں کی مشترکہ ناجائز اولا تھا لیکن مجھے اُس کے قتل پر اِس لیے افسوس ہوا کہ اُسے اسلامی سربراہان کے درمیان بیٹھنے کے جرم میں مارا گیا۔

وطنِ عزیز میں جو کچھ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ہوا، وہ کسی صاحبِ بصیرت سے ڈھکا چھپا نہیں۔ وہی کسنجر جس نے شاہ فیصل کو دھمکی دی تھی، اُسی نے بھٹو کے گھر میں بیٹھ کر کہا تھا کہ:

"We will make a horrible example of you."

پھر اُس نے آنِ واحد میں بھٹو کو "horrible example" بنا دیا۔ کل تک بھٹو اہلِ پاکستان کا محبوب راہنما تھا اور آج گلی گلی گونج رہا تھا:

چُک ڈَورُو مُرلی تے چل لاڑکانے
اساں نہیوں ہُن اتھے باندر نچانے

حیرت کی بات ہے نا؟

یوں پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک بڑے دانش ور کو ناکردہ گناہ کی سزا میں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور پاکستانی عدلیہ کے متنازعہ فیصلوں میں ایک خوفناک اضافہ ہو گیا۔

''حکمران جیسے آتا ہے، ویسے ہی جاتا ہے'' کی تھیوری کے مصداق جنرل ضیاء الحق بھی ویسے ہی گیا جیسے آیا تھا۔ پاکستانی عنانِ اقتدار کا تحفہ ضیاء کو امریکہ نے دیا اور اُسی نے اُس سے چھین لیا۔ ضیاء الحق کے قتل کے پس منظر اور پیش منظر سے سب سے زیادہ آگاہی رکھنے والا انسان اعجاز الحق ہے اور وہ تب سے اب تک چیخ رہا ہے کہ اُس کے باپ کا قاتل امریکہ ہے۔ اُس کے پاس ایسے ناقابلِ تردید شواہد موجود ہیں جنھیں مانے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ جنرل محمود علی دُرّانی کے کردار سے ظہیر زیدی کی 100 صفحاتی رپورٹ

تک ، ہر چیز اعجاز الحق کے پاس محفوظ ہے۔ محرکات جو بھی ہیں لیکن مَیں ضیاء کے قتل پر بھی خون کے آنسو روتا رہا۔

اِسلامی ممالک میں حکومتوں کی شکست و ریخت اور ان کے سربراہان کو اپنے اِشاروں پر نچانا امریکہ بہادر کا پسندیدہ شغل ہے۔ 2022 میں پاکستان میں ایک منتخب حکومت کا قتل کر کے جو حرامزدگی امریکہ نے کی، اُس سے سیاسیات کا ہر طالبِ علم پوری طرح آگاہ ہے۔ اس رجیم چینج سے فائدہ امریکہ کو ہوا یا عمران خان کو ورنہ پاکستانی قوم کا تو جنازہ اُٹھ گیا۔ ہماری معیشت، ہماری سیاسیات ، ہماری اخلاقیات، ہمارا امن چین اور ہمارا کردار، ہر چیز ہی برباد ہوگئی۔ 70 سالہ نیک سیرت بُڑھیا کی فحش ویڈیو بنا کر پبلک کر دی گئی ، اِس لیے کہ وہ ایک مخالف انسان کی بیوی ہے۔ لوگوں کو ننگا کر کے اُن پر تشدد کیا گیا کہ وہ سر اُٹھا کر چلتے ہیں۔ عورتوں کو محض اِس لیے بیوہ کر دیا گیا کہ اُن کے خاوندوں کے ہاتھوں میں کسی ایسی سیاست کے پرچم تھے جنھیں امریکہ پسند نہیں کرتا تھا۔ معصوم بچوں کو اِس لیے یتیم کر دیا گیا کہ اُن کا باپ ایسی صحافت کرتا تھا جس میں اس زمانے میں بھی سچ چلتا تھا۔ سچ بولنے کی پاداش میں اُس کے ناخن، گوشت سے جدا کر دیے گئے۔ اُس کی ہڈیاں توڑ دی گئیں اور اُس کے جسم کو کچل دیا گیا۔ ایک ایسا مقبول و محبوب راہنما جو ایک وقت میں پاکستان کے مختلف حِصّوں سے 6 نشستیں جیت جاتا ہے، اُس کے راستے میں سنگِ گراں اور اُس کے قتل کے لیے ایک ارب روپے مختص کر دیے جاتے ہیں

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

منزلیں راستوں کو اور راستے منزلوں کو نگلتے رہے اور ہم سمجھتے رہے کہ منزل قریب آ رہی ہے۔ اور مَیں ایک غیر جانبدار پاکستانی کی حیثیت سے خون کے آنسو روتا رہا، 2022 میں بھی۔ کاش تاج وکلاہ کی یہ جنگ ختم ہو جائے۔ اب ہی ہو جائے۔

اور ہاں، مَیں 27۔ دسمبر، 2007 کی شام بھی خون کے آنسو رویا جب عالمِ اِسلام کی پہلی اور واحد سیاسی راہنما محترمہ بے نظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا۔ امریکہ اقتدار سے باہر راہنماؤں کو قتل نہیں کرتا کہ اُن کی تو اُسے کسی وقت بھی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ محترمہ بے نظیر کے قتل میں بھی شاید امریکہ کا ہاتھ نہیں تھا

تو پھر قاتل کون ہے؟ یہ سوال تو چیختا رہے گا؛ چلّا تا رہے گا اور بَین کرتا رہے گا کہ مَیں ستم کشِ انتظار ہوں، مجھے جواب چاہیے۔ میری دانست میں اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو، جو مقتولہ کا والد ہے، سے اصغر علی جاوید تک، جو دعویدار ہے کہ وہ اپنے راہنماؤں کے قتل پر خون کے آنسو رویا، ہر شخص محترمہ بی بی شہید کا قاتل ہے۔ یہ مملکت جس میں قانون کی حکمرانی کا تصوّر پنپ نہ سکا، یہ معاشرہ جس میں محمد الرسول اللہ کا تحمّل و برداشت جڑیں نہ پکڑ سکا اور یہ قوم جس نے مسند کے لیے صرف کلاہ کو ماپا اور منبرِ رسول ان پڑھتا کے قدموں میں نچھاور کر دیا، ہم ہیں بی بی کے قتل کے ذمہ دار۔

## عام الاحزان

2007 میں مجھے بہت سے صدمات جھیلنے پڑے۔ قرآن پاک کا پنجابی ترجمہ کرنے والے صدارتی ایوارڈ یافتہ شاعر و دانش ور شریف کنجاہی 20۔ جنوری، 2007 کو گجرات میں انتقال کر گئے۔ تحریکِ پاکستان کے ممتاز کارکن اور مسلمان طالب علم راہنما رخواجہ افتخار احمد 26۔ فروری کو رخصت ہو گئے ۔ وہ دوشہرہ آفاق کتب 'جب امرتسر جل رہا تھا' اور 'دس پھول ایک کانٹا' کے خالق تھے۔ 'جب امرتسر جل رہا تھا' پر اُنھیں مصوّرِ حقیقت کا خطاب ملا۔ آپریشن سائلنس (سانحہ لال مسجد) جولائی، 2007 میں ہوا جو درجنوں بے گناہ عورتوں اور بچوں کی لاشوں کا تحفہ دے گیا۔ 22۔ اگست کو قرۃ العین حیدر انتقال کر گئیں۔ 29۔ ستمبر کو راجا رسالو چلانا کر گئے۔ راجا رسالو نے میرے آرٹیکل 'پنجابی دا سیرتی سرمایا' کی تکمیل میں میری بہت مدد کی ۔ 27۔ دسمبر کو بے نظیر بھٹو کو شہید کر دیا گیا۔ محسن بھوپالی اور کملیشور بھی اِسی سال رُخصت ہوئے۔ یہ سب میرے پسندیدہ لوگ تھے۔

مجھے دیکھنے کو بے چین رہنے والے اور اپنے بھٹکے ہوئے آہو (راقم) کو سُوئے حرم لانے کے لیے دست بدُ عا رہنے والے میرے شفیق والد اِسی سال 28۔ اکتوبر کو داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ درویش صفت، صابر، ہمدرد، غم گسار اور مجسمۂ خلوص ووفا، قرآن سے بے پناہ محبت کرنے والے عظیم مسلمان نے آنکھیں بند کیں تو ایسے لگا کہ شیشم کا ٹھنڈا اور گھنا درخت کٹ گیا۔

**عزیز تر مجھے رکھتا تھا وہ رگِ جاں سے**
**یہ بات سچ ہے مِرا باپ کم نہ تھا ماں سے**

وہ ماں کے کہنے پہ کچھ رُعب مجھ پہ رکھتا تھا
یہی ہے وجہ مجھے چومتے جھجھکتا تھا
وہ آشنا مِرے ہر کرب سے رہا ہر دم
جو کُھل کے رو نہیں پایا مگر سِسکتا تھا
جُڑی تھی اُس کی ہر اِک ہاں فقط مِری ہاں سے
**یہ بات سچ ہے مِرا باپ کم نہ تھا ماں سے**

ہر ایک درد وہ چپ چاپ خود ہی سہتا تھا
تمام عمر وہ اپنوں سے کٹ کے رہتا تھا
وہ لوٹتا تھا کہیں رات دیر سے ، دن بھر
وجود اُس کا پسینے میں ڈھل کے بہتا تھا
گِلے تھے پھر بھی مجھے ایسے چاک داماں سے
**یہ بات سچ ہے مِرا باپ کم نہ تھا ماں سے**

پُرانا سُوٹ پہنتا تھا ، کم وہ کھاتا تھا
مگر کھلونے مِرے سب خرید لاتا تھا
وہ مجھ کو سوتے ہوئے دیکھتا تھا جی بھر کے
نہ جانے سوچ کے کیا کیا وہ مسکراتا تھا
مِرے بغیر تھے سب خواب اُس کے ویراں سے
**یہ بات سچ ہے مِرا باپ کم نہ تھا ماں سے**

(ڈاکٹر طاہر شہیر)

**ذیابیطسِ غیر شکری:** کوئی تین عشرے قبل میرے افسانے 'بلیاں والی سرکار' کے مرکزی کردار، پُراسرار بُڈھے نے کہا تھا:

''انسانی تاریخ احمقوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔غلطیاں کرنے والے، ٹھوکریں کھانے والے، کھوپڑیوں کے مینار بنانے والے اور پھر زندہ انسانوں کو زمین میں دفن کرنے والے ظالم اور بے وقوف، دوسروں کو دھوکہ دے کر مسرّت حاصل کرنے والے، مگر اِن سب سے بڑا احمق تاریخ میں وہ قرار پائے گا جو سمجھ لے کہ وہ کسی دوسرے انسان کو سمجھ گیا ہے۔حتیٰ کہ یہ کہنا بھی حماقت ہے کہ وہ اپنے آپ کو سمجھ گیا ہے۔''

بڈھے نے سچ کہا تھا۔ عام انسان تو دور کی بات، ماہرین بھی انسان کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ طب، نفسیات اور معاشرتی علوم کے ماہرین اور دانش ور ابھی تک جتنا انسان کو سمجھ پائے ہیں وہ شاید بحیرہ عرب اور سوئی کے ناکّے کے ساتھ لگنے والے پانی کی نسبت ہے۔ 206 ہڈیاں، ایک دل، دو آنکھیں اور بیس اُنگلیاں .................. بس یہی تو انسان نہیں ہے۔ یہ حضرت انسان اور اس کا جسم تو عجائبات کا مجموعہ ہے۔انسان 90 فیصد تو انسان ہی نہیں ہے۔

جمائی کیوں آتی ہے؟ خوشی اور غم دونوں میں ہی آنسو، یہ کیا بات ہے؟ انسانی جسم میں موجود سب سے بڑا سیل fertilized egg بھی اِتنا چھوٹا ہے کہ اسے عام نظر (naked eye) سے نہیں دیکھا جا سکتا تو پھر انسان کو انسان کی سمجھ لگنے میں مشکلات تو ہوں گی۔

2008 کے موسمِ گرما کی بات ہے میں دفتر سے گھر آ رہا تھا کہ راستے میں گاڑی کا اے۔سی خراب ہو گیا۔ کثرت سے پسینہ بہا اور شدید پیاس لگی۔ گاڑی میں موجود پانی کی بوتل آگ بن چکی تھی۔ میں سرِ راہ نظر آنے والی کولڈ ڈرنک کی پہلی ہی دُکان پر رُکا اور اُسے بہت ہی ٹھنڈی بوتل دینے کا کہا، اگر چہ میں ٹھنڈا پانی نہیں پیتا تھا۔تقریباً برف بنی (Icy cold) بوتل میں غٹا غٹ پی گیا۔ میں نے فوراً ہی خود کو نارمل محسوس کیا اور کوئی 20/25 منٹ کی ڈرائیو کے بعد گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچنے تک میری حالت پھر ویسی ہی ہو چکی تھی۔ وہی شدید پیاس اور بے چینی۔ میں نیم مردہ ہو چکا تھا۔ پھر آئسی کولڈ پانی پیا تو کچھ بہتری آئی۔ اب مَیں ہر نصف گھنٹے کے بعد شدید ٹھنڈا پانی پیئے جا رہا تھا۔ یہ کیفیت کوئی دو ماہ رہی۔ اِس دوران میرا وزن تقریباً 20 کلو بڑھ گیا اور میری حالت یوں تھی کہ گویا مجھے جہنم میں پھینک دیا گیا ہو۔ اِن دو مہینوں میں

مختلف ڈاکٹرز اور حکماء سے رابطہ کیا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ میرے ایک کزن ڈاکٹر عارف جو معروف کیمونسٹ راہنما دادا فیروز الدین منصور کے پوتے ہیں اور آج کل کینیڈا میں پریکٹس کر رہے ہیں، اس مرض کے قریب پہنچ گئے لیکن اُنھی دِنوں وہ پاکستان سے ترکِ سکونت کر گئے۔

محمد آصف جو اُن دِنوں پاکستان کرکٹ ٹیم کا نائب کپتان تھا اور اپنی تباہ کُن باؤلنگ کی وجہ سے دُنیا بھر میں شہرت اختیار کر چکا تھا، ایک روز میرے بیٹے سے ملنے آیا تو اُس نے حسبِ معمول میرا حال چال بھی دریافت کیا۔ فیصل جاوید نے جونہی اُسے بتایا کہ ابّو سخت اذیّت میں ہیں اور ان کا مرض کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تو اُس نے ڈاکٹر غیاث النبی طیّب صاحب کا ٹیلی فون ملایا اور اُنھیں گزارش کی کہ وہ 'میرے انکل کو وقت دے دیں'۔ اِس کام کے لیے آصف کو کافی زوردار سفارش کرنا پڑی۔ ڈاکٹر صاحب نے مہربانی فرمائی اور اگلے روز کا وقت دے دیا۔

میری مختلف Prescriptions پر مختلف ڈاکٹر صاحبان نے چار بیماریوں کا ذکر کر رکھا تھا۔ پہلی ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے دو بیماریوں کا اِمکان ردّ کر دیا اور باقی دو میں سے ایک کون سی لاحق ہے کا پتہ چلانے کے لیے مجھے لاہور کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کر لیا۔ ہسپتال میں پورے دن پہ محیط .W.D.T کیا گیا جس میں مریض کا پانی بند کر دیا جاتا ہے اور بار بار خون اور پیشاب کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ ایک شخص جو روزانہ 10 لیٹر سے زیادہ پانی پی رہا ہو اُسے یک دم پانی سے محروم کر دینا اور وہ بھی 12 گھنٹوں کی طویل مُدّت کے لیے ............ الامان، الامان ............ کوئی اذیّت سی اذیّت تھی۔ ہر آدھ گھنٹے بعد نرس کی چُبھنے والی سوئی مجھے دستِ مسیحا نہیں بلکہ نیشِ عقرب لگ رہی تھی۔ میری زبان لکڑی کی طرح خشک اور اکڑی ہوئی تھی اور بستر سے اٹیچ باتھ روم تک جانے کے لیے میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ بس نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اِس اُمید میں لمحات گزر رہے تھے کہ ابھی کوئی اِبنِ مریم آئے گا اور اُس کے چُھوتے ہی میرے دُکھ کافور ہو جائیں گے۔ رات 12 بج کر پانچ منٹ پر ڈاکٹر غیاث النبی صاحب تشریف لائے اور کچھ رپورٹس دیکھ کر لوٹ گئے اور رات کو کلینک پہ ملنے کی ہدایت کی۔ اگلی سہ پہر لیب رپورٹس مکمّل ہوئیں تو مَیں حسبِ حکم کلینک پہ حاضر ہو گیا۔ وہاں یہ بات منکشف ہوئی کہ یہ مرض diabetes insipidus ہے اور یہ ایک لا علاج مرض ہے۔ جس طرح diabetes nilitus (شوگر) کے مریض کو انسولین دی جاتی ہے اِسی طرح شوگر کی اِس بہن کو Desmopressin

دی جاتی ہے اور بس یہی اِس کا علاج ہے۔ لہٰذا جیل روڈ سے یہ دوائی خریدی گئی اور تا دمِ تحریر روزانہ اس کا ایک پھوار (Spray) استعمال کر رہا ہوں اور الحمدُ للہ تندرست زندگی گزار رہا ہوں۔ اِن مراحل سے گزرے کم و بیش ایک ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا کہ ایک دوست تیمارداری کے لیے آئے جو طب سے کچھ شغف رکھتے تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ یہ مرض بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے لیکن بہت زیادہ اذیّت ناک ہے۔ اِس میں شوگر کی سی تمام علامات موجود ہوتی ہیں لیکن پیشاب یا خون میں شوگر کی موجودگی نہیں پائی جاتی، اِس لیے اِسے ذیابیطسِ غیر شکری کہتے ہیں۔ اُنھوں نے اس کا علاج کر لینے کا بھی دعویٰ کیا لیکن مَیں نے Desmopressin لینے میں ہی عافیت سمجھی۔ اِس مرض کی تشخیص کے دوران میرے سینے میں موجود پاکستانی مسیحاؤں کے بارے منفی جذبات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اگر چہ اچھے نہیں بل کہ بہت اچھے ڈاکٹرز سے بھی واسطہ پڑا لیکن بات تو کثرت کی ہوتی ہے۔ ڈاکٹرز کی فیس اور اُن کے بلز پر کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے۔ ان کا حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی انکم کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ یہ بازاری لوگوں کی طرح سودے بازیاں کرتے ہیں اور پھر ستم رسیدہ اور حالات کے پاٹوں میں پسے مریضوں کی تحقیر و تذلیل بھی کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ 2021 میں جب مَیں لاہور کے ایک معروف پلما نالوجسٹ سے ملا تو اُس کے مُتکبّرانہ اور بدتمیزانہ رویّہ کے پیشِ نظر میرے ایک ساتھی نے اُس کے خلاف کارروائی کے لیے دو کروڑ روپے کا نوٹس تیار کیا۔ لیگل نوٹس ٹائپ بھی ہو چکا تھا لیکن مَیں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ قانون کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مَیں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس پلما نالوجسٹ کے ساتھ عدالت میں اُس سے کہیں زیادہ ہوتی جو وہ اپنے کلینک میں مریضوں کے ساتھ کرتا ہے۔

**عدلیہ بچاؤ تحریک**: جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کر چکا ہوں، مَیں لڑکپن سے ہی پاکستانی سیاست کا سنجیدہ طالب علم رہا ہوں۔ میری یہ دلچسپی پولیٹیکس میں نہیں بل کہ سٹیٹس مین شپ (Statesmanship) میں رہی ہے۔ جب پاکستان کے بے مہار حکمرانوں نے افتخار محمد چوہدری چیف جسٹس پاکستان کے خلاف خلاف غیر قانونی اور غیر اخلاقی کارروائی کر کے عدالتی نظام کو بلڈوز کرنا چاہا تو پوری قوم نے صدائے احتجاج بلند کی۔ اسی کے نتیجے میں 'عدلیہ بچاؤ تحریک' کا آغاز ہوا۔

میری تعیناتی اُن دِنوں جناح ہال لاہور میں تھی، پاکستان کا دل لاہور اور پھر لاہور کا دل مال روڈ، جس کا آغاز ہی پی۔ ایم۔ جی آفس، ایوانِ عدل، ناصر باغ، پنجاب یونیورسٹی، ٹولنٹن مارکیٹ بلڈنگ، انارکلی اور جناح ہال سے ہوتا ہے۔ اس مرکز میں بیٹھ کر سیاسی تحریکوں کا قریبی مشاہدہ بہت آسان ہو جاتا ہے اور اگر آپ کسی تحریک میں کوئی عملی شرکت چاہتے ہیں تو یہ علاقہ اسے ممکن بنا دیتا ہے۔

اِس تحریک کے حوالے سے مَیں اپنے تجربات و مشاہدات تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا کہ یہ صفحات کوئی ریسرچ پیپر نہ ہیں۔ یوں بھی ہم عصر تاریخی واقعات پر قلم اُٹھانا کارِ دُشوار ہوتا ہے۔ اِس تحریک سے میرا لگاؤ اور اس کے سرکردہ لوگوں سے میری محبت، بالخصوص اعتزاز احسن اور منیر اے ملک جیسی خوب صورت شخصیات سے میرا قلبی لگاؤ شاید مجھے غیر جانبدار نہ رہنے دے۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ محبّت یا نفرت کے بغیر نہ تو بنتی ہے اور نہ لکھی جا سکتی ہے۔ اِسی لیے ایڈورڈ گبن (1794 - 1737)، جیسا مؤرخ رچرڈ اوّل (1199 - 1157) اور والٹر ریلے (Walter Raleigh, 1552 - 1618) پر شدید خواہش کے باوجود قلم نہ اُٹھا سکا۔ اور یہی وہ حقیقت تھی جس کے نتیجے میں اس کا شہرہ آفاق کام "The History of the Decline and th Fall of the Roman Empire" منظرِ عام پر آیا۔ گبن کا خیال تھا کہ اِس کام میں اُس کی محبت یا نفرت شامل نہیں ہوگی۔ کچھ سچ اس لیے نہیں کہے جاتے کہ اربابِ قوّت و اِختیار ناراض ہو سکتے ہیں۔ جس طرح کہ ہندوستان میں سر جادوناتھ سرکار کا معاملہ ہوا۔ جادوناتھ جنگِ آزادی پر تحقیقی کام اِسی لیے نہ کر سکا کہ اس سے وہ انگریزی سرکار ناراض ہوتی جس نے اُسے 'سر' کا خطاب دے رکھا تھا۔ لہٰذا وہ اورنگ زیب کے دَورِ حکومت کو اپنے حلقۂ کار میں لایا کہ اِس سے اُسے جو نفرت ملی، اس سے صرف وہ کمزور لوگ ناراض ہوئے ہوں گے جنھیں ہندوستانی مسلمان کہا جاتا ہے۔

یہ مسئلہ ہر قلم کار کو پیش آتا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی انسان اپنے فطری جذبات کو پرے نہیں پھینک سکتا۔ مَیں افتخار محمد چوہدری سے کوئی عقیدت نہیں رکھتا۔ اُن کی شخصیت کوئی متاثر کُن شخصیت نہ ہے لیکن مجھے 'چیف جسٹس آف پاکستان' سے بے پناہ محبت ہے۔ مَیں نے اس کے لیے احترام کے جذبات سے اپنے سینے کو ہمیشہ معمور رکھا ہے اور مجھے کہنے دیجیے کہ 'وہ کچھ غلط نہیں کرتا'۔ لہٰذا اُس کے خلاف جو 'غلط' ہوا

اُس 'غلط' کے خلاف رائے سازی میں پوری قوّت سے میں نے اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ مَیں نے اِس تحریک میں عملاً حِصّہ لیا اور اس لانگ مارچ میں بھی اپنا حِصّہ ڈالنے میں کامیاب ہوا جس کے نتیجے میں عدلیہ کے عزت و وقار بحال ہوئے۔

اِس تحریک کا آغاز 9۔مارچ، 2007 کو اُس وقت ہوا جب جنرل پرویز مشرف نے غیر آئینی طور پر چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو معطّل کر دیا، بغیر یہ بتائے کہ اُن کا جرم کیا تھا۔ بس مشرف کی اِسی حرکت سے 'عدلیہ بچاؤ تحریک' کا آغاز ہوا اور خوش بختی سے اِس کی قیادت اعتزاز احسن جیسے دانش ور، منیر اے ملک جیسے مخلص اور باوقار انسان اور علی احمد کُرد جیسے جوشیلے اور نڈر راہنما کے ہاتھوں میں آئی۔ اِس تحریک میں 5۔مئی، 2007 کو ساہیوال میں وکلاء کے پُر امن مشعل بردار جلوس پر پٹرول پھینک کر درجنوں وکلاء کو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلاء کر دیا گیا۔ ان میں کم و بیش ایک درجن قانون دان جامِ شہادت نوش کر گئے۔12۔مئی، 2007 کو کراچی میں تحریک کے حامی اور مخالفین، دو بڑے گروپس کا آمنا سامنا ہوا تو بدنامِ زمانہ تنظیم کے ہاتھوں 40 سے زیادہ افراد لُقمۂ اجل بن گئے۔

3۔نومبر، 2007 کو پرویز مشرف نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی تو عدلیہ کو ایک اور شدید دھچکا لگا لیکن یہ دھچکا عدلیہ کے دامن پر داغ کا باعث نہ بنا۔ 97 قابلِ احترام ججز نے اِس ایمرجنسی کے خلاف 'اعلانِ بغاوت' کیا اور PCO کے تحت حلف سے انکار کر دیا۔ یہ انکار بالآخر پرویز مشرف کے استعفیٰ پر منتج ہوا۔

بدقسمتی دیکھیے کہ 2008ء کے انتخاب میں کامیابی کے بعد اور مسلم لیگ (ن) سے بھور بن معاہدے کے باوجود آصف علی زرداری نے اپنے رویّے سے ثابت کیا کہ وہ عدلیہ کا کھویا ہوا وقار اور مقام بحال نہیں کرے گا۔ چونکہ PML(N) بھور بن معاہدے پر عمل درآمد کرانے میں ناکام رہی، اس سے وکلاء پرو جوڈیشری اور پرو گورنمنٹ کے خانوں میں تقسیم ہوتے محسوس ہونے لگے، حالانکہ میری نظر میں یہ خیال ہرگز درست نہ تھا اور اعتزاز، کُرد، منیر اے ملک اور حامد خاں جیسے لوگ پورے خلوص اور پوری قوت سے 'جنگِ آزادی' لڑنے میں مصروف رہے۔ یہ لوگ اِتنے محتاط اور غیر جانب دار تھے کہ اعتزاز احسن نے بھٹو فیملی سے ذاتی تعلقات کے باوجود پی پی حکومت کی مخالفت کی اور اپریل، 2008 میں جب پرویز

مشرف کا ایک وزیر شیر افگن نیازی وکلاء کی نفرت اور غصّے کا شکار بنا اور ٹرنر روڈ لاہور پر اپنے وکیل کے چیمبر میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تو اعتزاز احسن نے ہی اُسے وہاں سے آزادی دلوائی۔ اور جب اُس کی گاڑی پر حملہ کیا گیا تو اعتزاز احسن اُسے بچانے کے لیے گاڑی کے اوپر چڑھ گئے۔ مَیں نے یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شیر افگن کو اگر یہ معاونت نصیب نہ ہوتی تو دل کا وہ مریض شاید خوف اور تشدّد سے وہیں مر جاتا۔ اُس رات یہ اطلاع ملی کہ پرویز مشرف نے گورنر پنجاب کو فون پر کہا کہ شیر افگن نیازی کی مدد کریں اور اُسے رات گورنر ہاؤس میں ہی ٹھہرائیں۔

اِس جدّ وجہد کا آخری مرحلہ یہ تھا کہ 12۔ مارچ، 2009، جمعرات کو وکلاء نے اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ کا آغاز کر دیا۔ اُس روز لاہور سے اسلام آباد کی طرف کوئی قافلہ تو روانہ نہ ہوا لیکن وکلاء ایوانِ عدل اور ہائی کورٹ کے درمیان مال روڈ پر متحرک اور احتجاج کرتے نظر آئے۔ مَیں کوئی 11 بجے حافظ جوس کارنر سے جوس پینے کے لیے دفتر سے باہر نکلا تو کالے کوٹوں کی قطار در قطار بہار نظر آئی۔ دل میں خیال آیا کہ دو سال کی طویل مُدّت پہ محیط یہ جہدِ مسلسل کبھی کامیابی سے ہم کنار ہوگی یا نہیں، اور ذکی وارثی کا یہ شعر گنگناتا جوس کارنر پر پہنچ گیا۔

یاس و امید یوں رہیں راہِ طلب میں ساتھ
چار قدم ہٹا دیا ، چار قدم بڑھا دیا

میری 12 مارچ، 2009 کی ڈائری کا ورق ہے:

''وکلاء کا لانگ مارچ شروع ہو گیا۔ ملک کے مختلف حِصّوں سے قافلے اسلام آباد کی طرف چل دیے۔''

14۔ مارچ کی ڈائری ہے:

''صبح قافلے لاہور سے چلیں گے۔ بس یہی دن اہم ترین دِن ہوگا۔''

اگلے روز، 15۔ مارچ کو کنٹینرز کے بنے ٹائی ٹینک عوام کے سمندر میں ڈوب گئے، جس میں بڑا کریڈٹ نواز شریف کو جاتا ہے۔ 'ہم عوام' ابھی شاہدرہ میں تھے تو کچھ اچھی خبریں ملنا شروع ہو گئیں اور گوجرانوالہ نہیں پہنچے تھے کہ طویل جدوجہد رنگ لے آئی۔ وزیرِ اعظم یوسف رضا گیلانی نے اپنی نشری تقریر میں جورات

گئے نشر ہوئی ججز بحالی کا عندیہ دے دیا اور لانگ مارچ گوجرانوالہ میں ختم ہو گیا۔

**رسولِ ؐ خدا سے شاباش:** 'خواب' کا لفظ پوری معلوم انسانی تاریخ میں ہمیشہ ہی زیرِ بحث رہا ہے۔ جناب یوسف علیہ السّلام کے معجزاتی علم سے فرائڈ کے مباحثِ لا حاصل تک خواب پر گفت وشنید سے ہر کس وناکس کی دلچسپی قائم رہی ہے۔فرائڈ کے خیال میں خواب انسان کی تحت الشعوری خواہشات کا مظہر ہے۔ حالتِ بے داری میں جو جذبات انسان کے اندر پرورش پاتے رہتے ہیں، حالتِ نیند میں وہی خیالات خواب میں نظر آتے ہیں،لیکن یہ نظریہ متفق علیہ نہیں ہے۔ہم جانتے ہیں کہ ہم ایسے خواب بھی دیکھتے ہیں، جن کے واقعات ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔لہٰذا ہم خواب کو ناآسودہ خواہشات کا نام نہیں دے سکتے۔

مجھے یاد ہے کہ مَیں نے کبھی یہ روایت پڑھی تھی کہ بدترین جھوٹ، جھوٹا خواب بیان کرنا ہے۔ اور اِس حدیثِ مبارکہ میں تو کوئی شُبہ ہی نہیں کہ رسولِ ؐ خدا نے فرمایا کہ جو شخص میرے ساتھ کوئی ایسی بات منسوب کرے جو مَیں نے نہیں کی تو پھر وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔لہٰذا کوئی مسلمان جھوٹا خواب بیان کرنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا جب کہ اُس میں آقائے دو جہاں ؐ کا ذِکرِ خیر بھی آئے۔اِن تمہیدی کلمات کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ 2009 کے آغاز میں مَیں نے علمِ حدیث کے موضوع پر بچّوں کے لیے ایک کتاب ترتیب دی جس کا مقصد اپنے سکول کے بچّوں کے علاوہ عام طلباء وطالبات کو حدیث کا علم دینا تھا۔ 100 صفحات کی ضخامت کی اِس چھوٹی سی کتاب میں حدیث کی مختصر تاریخ،علمِ حدیث کی بنیادی باتیں مثلاً اصطلاحات وغیرہ اور لباس، طہارت، نماز اور آداب وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے ابواب شامل ہیں۔اِن میں احادیث کا عربی متن، اُردو ترجمہ اور آخر میں خلاصہ دیا گیا ہے۔

پروگرام کے مطابق منتخب ابواب مختلف کلاسز کو پڑھانے شروع کر دیے گئے اور لاہور میں کتاب سرائے، اُردو بازار لاہور کو اِس کا سیل پوائنٹ بھی بنا دیا گیا۔کتاب سرائے کی وساطت سے 'الحدیث' خیبر پختون خوا کے بعض دینی مدارس تک بھی پہنچ گئی جنھوں نے اِسے اپنے نصاب کا حِصّہ بنا لیا۔ میرا ایمان اور عقیدہ ہے کہ آقا رحمت اللعالمین ؐ اپنی اُمّت کے معاملات سے آگاہی رکھتے ہیں۔

وہ ہمارے دُکھ سُکھ کو محسوس کرتے ہیں اور ہمارے اعمالِ صالحہ پر ہمیں اپنے شرفِ پسندیدگی سے مطلع فرماتے ہیں۔ میری اِس سوچ کو اِس بات سے تقویت ملتی ہے کہ محبوبِؐ خدا نے نُورالدّین زنگی کو ایک حکمِ بے ابہام دیا؛ بوصیریؒ کو رِدائے مبارک عطا کی؛ اقبالؒ کو بربطِ سلما سے نوازا، علم الدین کو غازی بنایا، محمد علی جناحؒ کو ہندوستان پہنچنے کی تاکید فرمائی اور اُنھیں ایک بڑا مسلم راہنما بنایا اور میرے شُترِ بے مہار قلم کو پاکیزگی عطا فرمائی۔

جن ایّام میں مذکورہ بالا ُالحدیث‘ منظرِ عام پر آئی اس سے کچھ پہلے میری رفیقاتِ کار میں ایک بہت جان دار کردار عائشہ نامی ایک ٹیچر کا تھا۔ عائشہ نہایت ہی مختلف قسم کی، سنجیدہ طبع اور کم گولڑکی تھی۔ ہم میاں بیوی اکثر اُس کی ذات کو زیرِ بحث لاتے اور ایک دوسرے سے سوال کرتے کہ اس کے پاس کیا خاص چیز ہے۔ ہم اس سے گپ شپ اور سماجی موضوعات پر بات چیت کی کوشش کرتے لیکن وہ ہوں ہاں سے زیادہ کوئی رسپانس نہ دیتی۔ ایک روز چھٹی کے وقت مَیں نے اُس سے کہا کہ عائشہ! مَیں آج تمھیں گھر نہیں جانے دُوں گا تاوقتیکہ تم یہ راز نہ بتاؤ کہ تمھارے پاس کیا خاص عطائے الٰہی ہے۔ عائشہ کچھ دیر خاموشی کے بعد گویا ہوئی:

’’ہمارے گھر میں ایک کارڈ لٹکا ہوتا تھا جس پر لکھا ہوا تھا’’ اللہ کا ٹیلی فون نمبر۔‘‘ دراَصل وہ پانچ ڈائل بنا کر اُن پر پانچوں نمازوں کی فرض، وِتر، سُنّت اور نوافل کی تعداد لکھی ہوئی تھی۔ مَیں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے ابھی نماز بھی ڈھنگ سے پڑھنا نہیں آتی تھی لیکن مجھے اللہ سے باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ لٰہذا مَیں اپنے گھر کے ٹیلی فون سے وہ نمبر ڈائل کرتی رہتی تھی۔ وہ کسی کا نمبر ہوتا تو مِلتا۔ لیکن مَیں ڈائل کرتی رہتی تھی۔‘‘

عائشہ ُداستان‘ کہتی کہتی خاموش ہوگئی۔ کمرے پہ ایک مقدّس سکوت طاری تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خود ہی برف توڑ دے گی لیکن وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں خاموش بیٹھی رہی۔ بالآخر میں نے سوال کیا: ’’تو پھر‘‘؟

’’بس سر! پھر ایک روز نمبر مِل گیا‘‘ اُس نے جواب دیا۔

اس سے آگے وہ کچھ کہتی بھی تو مَیں سُن نہ پاتا۔ یہ عائشہ ہمارے لیے نیکی کی ایک علامت کے طور پر اپنے

جانے کے بعد بھی ہمارے درمیان موجود رہی۔ گھر میں اور سکول میں اکثر اُس کا ذکر ہوتا اور اُسے عہدِ رواں کے ایک مثالی کردار کے طور پر یاد کیا جاتا۔

20-21۔اپریل،2010 کی رات جب مَیں درود شریف پڑھتے پڑھتے سو گیا تو مَیں نے دیکھا کہ ہمیشہ کی طرح انتہائی باوقار اور باپردہ لباس میں عائشہ آتی ہے اور کہتی ہے کہ ''سر! آقاؐ کا پیغام ہے کہ اصغر علی جاوید سے کہنا کہ مجھے 'الحدیث' بہت پسند آئی ہے۔''

میری 21۔اپریل 2010 کی ڈائری کے ورق کی ایک سطر ہے:

''آج سارا دِن مَیں جہانوں کے اس سب سے بڑے تحفے کی وصولیابی پر مسرور ہوتا رہا۔''

**وہ جنھیں ہم جانتے ہیں:** یہ اگست،2010 کی بات ہے مجھے میری ادبی تنظیم 'دریچہ' کی طرف سے بھارتی شاعر اور ہدایت کار گلزار پر ایک مضمون لکھنے کا کہا گیا۔ اجلاس کی شام مَیں نے مضمون پڑھنا شروع کیا تو اس میں گلزار کا کوئی ذکر نہ تھا سوائے آخری پیرا کے جس میں گُلزار کی بیٹی میگھنا گلزار اور گلزار پر اُس کی تحریر کردہ بائیوگرافی 'Because He Is' کا ذکر تھا۔ اِسی پیرا میں بتایا گیا کہ یہ سمپورن سنگھ کالرا وہی شخصیت ہے جسے لوگ گُلزار کے نام سے جانتے ہیں۔ اراکینِ دریچہ نے اِس انداز کو بہت پسند کیا اور خاص طور پر معروف نقاد ارشد نعیم نے اس کی بہت تعریف کی۔ پھر مختلف ادبی شخصیات پر اِس طرح کے بائیوگرافیکل پروفائلز کا سلسلہ چلتا رہا۔ ازاں بعد مَیں نے اِس میں مذہب، سیاست اور فلم و موسیقی کے ایسے لوگوں کو بھی شامل کر لیا جن پر ہم اکثر بات کرتے ہیں لیکن ہم اُن کی زندگی بل کہ اصل نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ کچھ عنوانات تھے: میز بانِ نبوّت، رقص کناں لاہوری، شاعری کا ساحر، راگ سے آگ اور ننگرہار کا پٹھان۔

27 عظیم لوگوں کی زندگیوں پر اُن مختصر مضامین کو 2012ء میں ''وہ جنھیں ہم جانتے ہیں'' کے عُنوان سے شائع کر دیا گیا۔ دراَصل یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہم جانتے ہیں لیکن نہیں جانتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں انگریزی میں known but unknown people کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری میں اِس نئی روایت کو پڑھے بغیر تو نہیں سمجھا جا سکتا لیکن کتاب کی ابتداء میں شاہین عباس کا یہ

شعر ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرنے کے لیے سُو دمند رہے گا:

اب سلامت نہیں ملتے مجھے تاریخ کے لوگ

اِتنے ٹکڑے مِرے ہاتھوں سے روایت کے ہوئے

فیصل جاوید، انفارمیشن آفیسر محکمہ تعلقاتِ عامہ پنجاب کا دیباچہ بھی قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ لکھتے ہیں:

## بِسمِ اللہ کیجئے

کہا جاتا ہے کہ فکشن میں نام اور تاریخ کے سِوا ہر چیز درست ہوتی ہے اور نان فِکشن میں صرف نام اور تاریخ صحیح ہوتے ہیں۔ الزام یہ بھی ہے کہ رائٹر سے اگر 'عورت' چھین لی جائے تو اس کی تہی دامنی پر رونا آئے گا۔ وہ شعر، پھول، بچّے اور مزدور کا سہارا لے گا لیکن یہ سہارے جب کارگر ثابت نہیں ہوں گے تو وہ عورت ہی کی طرف پلٹ آئے گا۔ زیرِ نظر کتاب میں اصغرعلی جاوید نے ایسا ''فِکشن'' تخلیق کیا ہے جس میں نام اور تاریخ بھی درست ہے اور جو عورت کے بغیر بھی تکمیل کی منازل طے کر گیا ہے۔

اِنسان کا بہترین مطالعہ ''اِنسان'' کا مطالعہ ہے۔ جو انسان اپنے ہم جنسوں کے ساتھ دلچسپی نہیں رکھتا، اسے کچھ بھی نام دے لیں، سِوائے ''اِنسان'' کے۔ اِس وقت آپ کے ہاتھوں میں انسان ہی کا مطالعہ ہے۔ حُسن وعشق کی قید سے آزاد، افسانے کا کلائمکس لیے یہ ''فِکشن'' اپنی نوعیت کی پہلی کاوش ہے، جو ادب کی اصطلاح میں فِکشن نہیں ہے۔ مؤلف ایک مشکل پسند اِنسان ہے۔ ادب میں تجربات اِس کا شوق ہے۔ اشفاق احمد مرحوم کا ایک افسانہ ''محسن محلّہ'' خوب صورت، مکمل اور بھرپور افسانہ ہے۔ کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ اصغرعلی جاوید نے اِس عظیم افسانہ نگار کی اِجازت سے ''محسن محلّہ'' کو اِس طرح آگے چلایا کہ وہ وسعت اشفاق احمد کے افسانے کا ہی حِصّہ معلوم ہوتی ہے لیکن اگر آپ اصغرعلی جاوید کے ''محسن محلّہ'' کو علیحدہ طور پر پڑھیں تو وہ آپ کو ایک مکمل ادبی اکائی نظر آئے گی۔ (دُکھوں کے صحرا میں تنہا لڑکی)

اِن سوانحی مضامین میں بھی اصغرعلی جاوید نے ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ یہ کہانیاں ہیں اُن عظیم لوگوں

کی جو روزانہ ہماری گفتگو میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ہم ان کا نام تو ادب اوراحترام سے لیتے ہیں لیکن اِس سے آگے کچھ نہیں۔ یہ ہیں Known but Un-known لوگ۔

آج تک افسانے کی کوئی بھی تعریف قابلِ قبول نہیں مانی گئی لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ ''یہ ایک نثری قِصّہ ہے جو اپنے اندر ایک کلائمکس رکھتا ہے'' تو یہ مضامین افسانوی رنگ لیے ہوئے ہیں۔لیکن چونکہ یہ فِکشن نہیں، نان فِکشن ہے اور مؤلف نے فِکشن اور نان فِکشن کے درمیان خطِ فاصل کا خیال رکھا ہے، اِس لیے ہم انھیں افسانہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ جو کچھ بھی ہیں آپ کے لیے بھرپور دلچسپی کا سامان ہیں۔

بِسم اللہ کیجئے۔

# فیصل جاوید

انفارمیشن آفیسر

محکمہ تعلقاتِ عامہ پنجاب

**چِٹھی نہ کوئی سندیس:** کہیں لڑکپن میں جگجیت سنگھ کی آواز میں 'یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو' جیسی شُہرہ آفاق نظم نجانے کیسے سُننے کا اتفاق ہوا۔گلوکار کے نام کا تو فوراً ہی پتہ چل گیا لیکن شاعر کے نام کا پتہ چلانا پڑا کہ یہ سُدرشن فاکر ہے۔اس سماعت کے بعد فاکر کی شاعری اور جگجیت سنگھ کی گائیکی میری روح میں سرایت کر گئیں لیکن فراغت کے زیادہ لمحات جگجیت سنگھ کی گائی غزلیں سُننے میں صرف ہوتے۔

ہندوستان میں گائیکی کوئی نیا فن نہیں ہے۔طوائف کے اِدارے نے اِس کی بہت پرورش کی ہے۔ یہاں طوائف کے جو دس روپ تھے، یا شاید اب بھی ہیں، اُن میں بیسوا، دیوداسی، ڈُومنی، کنچنی، کنجری، کسبی، نوچی، پُتریا، رنڈی اور طوائف شامل ہیں۔'طوائف' کا کردار ہر طرح کے معاملات پر حاوی ایک بااختیار، باوقار اور باحیثیت کردار تھا جو ناچتی بھی تھی، گاتی بھی تھی، نازنخرہ بھی کرتی تھی اور اگر اربابِ اختیار اِس سے زیادہ کے طلب گار ہوتے تو یہ اس مطالبہ کو خوش بختی اور عزت کا معیار سمجھتی۔لیکن ڈُومنی ہندوستانی طوائف کا وہ رُوپ تھا جس کا پیشہ گائیکی تھا۔اس ڈومنی نے فنِ گائیکی پر بہت احسان فرمایا ہے۔

ہندوستان میں اِس فن کی اصل آبیاری کلاسیکل گلوکاروں نے کی۔ پھر کچھ مخصوص گھرانے جن کا اوڑھنا بچھونا ہی گیت تھا، اور ہے، اُنھوں نے اِس فن کو نکتۂ کمال تک پہنچا دیا۔ شام چوراسی، پٹیالہ، گوالیار اور جے پور، اور پھر پاکستان میں فیصل آباد، لاہور، کراچی اور دیپال پور کے وہ گھرانے جن کا ذریعہ معاش ہی فنِ گائیکی ہے، عوام النّاس میں محبّت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان مخصوص معتبر گھرانوں کے علاوہ بھی پاک و ہند میں بہت سے بڑے گویّے پیدا ہوئے۔ لیکن جو نا قابلِ فراموش نام ہیں اُن میں اُستاد اُمید علی خاں، بڑے غلام علی خاں، فتح علی خاں، مبارک علی خاں، برکت علی خاں، کے ایل سہگل، طلعت محمود، مہدی حسن، نصرت فتح علی خاں، غلام علی، حبیب ولی محمد، استاد احمد حسین، استاد محمد حسین، گوہر جان، بیگم اختر، روشن آرا بیگم، نور جہاں، فریدہ خانم، ملکہ پکھراج، عابدہ پروین، گُل بہار بانو اور ٹینا ثانی کے نام شامل ہیں۔ یہی لوگ جانتے ہیں کہ' سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی' کیا ہوتا ہے۔ جن دِنوں ہندوستان میں غزل کے گائیک پاک و ہند سے چُن چُن کر غزل منتخب کر رہے تھے اور فن کے قدردانوں سے پذیرائی حاصل کر رہے تھے، ہمارے پاکستانی گائیک پیچھے رہ گئے۔ غزل گائیکی کے اِس حالیہ دَور میں پنکج ادھاس، چندن داس، راجندر مہتہ، نینا مہتا، اشوک کھوسلہ، بھوپندر سنگھ، انوپ جلوٹا، مدھو رانی، جگجیت سنگھ اور چترا سنگھ کے نام انتہائی قابلِ قدر ہیں، لیکن جو تاثیر جگجیت سنگھ قائم کرنے میں کامیاب ہوا، اُس کی کوئی دوسری مثال نہیں مِلتی۔ عوامی پذیرائی جو جگجیت سنگھ کے حصّے میں آئی وہ اُسی کا مقدّر ٹھہری۔

میرے گھر سے دفتر کا فاصلہ تقریباً ایک گھنٹہ کا تھا۔ اِس دوران سو بار درودِ ابراہیمی پڑھنا مُدّت سے میرا معمول تھا۔ جو وقت بچ رہتا وہ دیگر تسبیحات کے کام آجاتا۔ واپسی پر گاڑی میں جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی غزلیں ہوتیں اور مَیں ہوتا۔ اُس کا انتخابِ کلام، اُس کی آواز میں موجود سوز اور سلیقے سے کی گئی کمپوزنگ اُس کی ہر غزل کو ہی شاہکار بنا چکی ہے۔ اُس نے اپنے مدّاحوں سے بے پناہ محبت حاصل کی ہے۔ یہ عظیم فن کار 10۔ اکتوبر، 2010 کو اپنے کروڑوں چاہنے والوں کو اُداس چھوڑ کر رُخصت ہو گیا۔ اُس کی موت سے پیدا ہونے والا خلا کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ آنجہانی جگجیت کے بہت سے دیگر چاہنے والوں کی طرح مَیں بھی اُس کی موت پر اُداسی اور رنجیدگی میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ اُس کا یہ دُکھ کئی ہفتے سُنتا رہا۔

'چٹھی نہ کوئی سندیس، جانے کون سا ہے وہ دیس، جہاں تم چلے گئے'

جگجیت کی گائی جو غزلیں مَیں ہزاروں بار سُن چکا ہوں، اُن میں یہ قابلِ ذِکر ہیں:

'تم اِتنا جو مسکرا رہے ہو، کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو'

'اُس موڑ سے شروع کریں پھر یہ زندگی'

**حیاتی حضورؐ دی:** وطنِ عظیم میں پنجابی زبان کے سب سے بڑے سیوک جناب الیاس گھمن سابق چیف انجینئر واپڈا، جو درجنوں کتب کے مصنّف بھی ہیں، کی خواہش پر اکتوبر، 1998 میں شروع کیا گیا پنجابی سیرت کی قسط وار اشاعت کا سلسلہ اُن کی پیشہ وارانہ مصروفیات کے باعث تعطّل کا شکار ہو گیا تھا لیکن مَیں نے سیرت نگاری کا کام نہ روکا۔ 2008 میں جب مَیں نے محسوس کیا کہ یہ کام اب کتابی شکل میں لائقِ اشاعت ہے تو مَیں نے مسوّدہ الیاس گھمن کو ارسال کر دیا لیکن بوجوہ اُن کی طرف سے تاخیر ہوتی رہی۔ ایک روز پروفیسر عبدالجبار شاکر نے ایک ملاقات میں 'باعثِ تاخیر' پر بات کی تو ساتھ ہی یہ پیش کش بھی کی کہ وہ اپنے اشاعتی اِدارہ 'کتاب سرائے' اُردو بازار لاہور سے پنجابی سیرت کی اشاعت کے لیے تیار ہیں لہٰذا گھمن صاحب کو اطلاع دینے کے بعد مَیں نے مسوّدے کی ایک نقل 'کتاب سرائے' کے حوالے کر دی۔ اِس ضخیم کتاب کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ پر کم و بیش دو سال کا عرصہ لگ گیا۔ بلا شبہ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن میری غفلت اور تن آسانی بھی تاخیر کا باعث بنی۔ بِالآخر پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم سعید نے پروف ریڈنگ میں میرا ہاتھ بٹایا اور یوں 2011 میں کتاب کی حتمی شکل اشاعت کے لیے تیار ہو گئی۔ کم و بیش ایک سال کی تاخیر کے بعد 13۔ دسمبر، 2012 کو سالوں پہ محیط میری کاوش بعنوان ''حیاتی حضورؐ دی'' منظرِ عام پر آ گئی۔

یہ دن میری زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ مَیں کتاب کو بار بار چومتا رہا اور سجودِ شکر ادا کرتا رہا کہ سال ہا سال کی محنت ٹھکانے لگی۔ یہ اللہ کی عطا کردہ ہر نعمت سے بڑی نعمت تھی کہ میرے بے بس ہاتھوں سے اپنے محبوبؐ کو ایک تحفہ دِلا دیا۔ سبحان اللہ والحمدللہ۔

'حیاتی حضورؐ دی' اپنے ڈکشن، ضخامت اور تحقیقی انداز کی بدولت بہت مقبول ہوئی۔ پنجابی پیاروں اور سیرت النبیؐ سے دلچسپی رکھنے والے دوستوں نے اِسے بے حد سراہا۔ 16۔ فروری، 2013 کو پلاک

(PILAC) میں کتاب کی تقریبِ پذیرائی ہوئی جس میں ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد، ڈاکٹر صغریٰ صدف، ڈاکٹر محمد اکرم سعید اور سعدیہ شوکت نے اظہارِ خیال کیا۔

3۔مئی، 2013 کو پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں مسعود کھدّر پوش ایوارڈ کی تقریب ہوئی تو 'حیاتی حضورؐ دی' کو اوّل انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ ایک خوب صورت تقریب تھی جس کی کمپیئرنگ حسبِ معمول معروف اداکار شجاعت ہاشمی نے کی۔ کتاب کی تقریب اور مسعود کھدّر پوش ایوارڈ نے کتاب کو بہت شہرت بخشی اور اب پنجابی حلقوں میں میری پہچان 'اصغر علی جاوید سیرت والا' کے حوالے سے ہونے لگی۔

11۔جنوری، 2014 کو جب میں نمازِ مغرب ادا کر رہا تھا تو میرا موبائل فون مسلسل چنگھاڑ رہا۔ سلام کے بعد فون دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ راولپنڈی کے ایک سرکاری نمبر سے کالز تھیں۔ مَیں نے نمبر ملایا تو مجھے بتایا گیا کہ 'حیاتی حضورؐ دی' صدارتی ایوارڈ کے لیے منتخب ہو چکی ہے اور 12۔ربیع الاوّل کو ایوارڈ کے حصول کے لیے 11۔ربیع الاوّل (13۔جنوری) کی شام مجھے اسلام آباد میں اپنی موجودگی کنفرم کرنی ہے۔ اِس خبر کے ساتھ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے ڈاکٹر اشفاق ورک کو ساتھ لیا اور 13۔جنوری کی شام حسبِ ہدایت ہم فیصل مسجد اسلام آباد کے ہوسٹل میں پہنچ گئے۔ صبح ہمیں صدرِ پاکستان کے مہمانوں کے پروٹوکول کے ساتھ ہوسٹل سے ایوانِ صدر لے جایا گیا، جہاں صدر ممنون حسین نے اپنے دستِ مبارک سے ایوارڈ سے نوازا اور پھر ایک پُر تکلّف ظہرانہ بھی دیا۔ واپسی پر بڑے بھائی ڈاکٹر شوکت علی اور چھوٹے بھائی ارشد علی کے علاوہ دیگر اہلِ خاندان نے میرا استقبال کیا۔

صدارتی ایوارڈ کے حصول پر 1998 میں شروع ہونے والا میرا وہ سفر تمام ہوا جس کے لیے مَیں نے بے پناہ جدّ وجہد کی۔ شبانہ روز محنت سے بعض اوقات صحت کے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ اِس دوران دو شہروں کے درمیان میرے روزانہ سفر میں بھی کوئی کمی نہ آسکی کہ اس کا تعلق میرے روزگار سے تھا۔ کتاب کے مراحل اور نوکری کی تکمیل ایک ساتھ ہی تمام ہوئے تو احساس ہوا کہ محنت ٹھکانے لگی۔ اُن دِنوں مجھے حضرت سلطان باہوؒ کی یہ ابیات بہت یاد آتی رہیں:

لوہا ہوویں پیا کٹیویں، تاں تلوار سدیویں ہُو
کنگھی وانگوں پیا چریویں، تاں زُلف محبوب بھریویں ہُو

مہندی وانگوں پیا گھٹیویں، تاں تلی محبوب رنگیویں ہُو

وانگ کپاہ پیا پنجیویں، تاں دستار سدیویں ہُو

عاشق صادق ہوویں باہو، تاں رس پریم دی پیویں ہُو

**'حیاتی حضورؐ دی' اور محبّت**: 'حیاتی حضورؐ دی' کی تالیف کے دوران اِس بات پر میرا ایمان پختہ تر ہوگیا کہ اگر کسی قلم کار کے سینے میں نبیؐ کی محبت بدرجہ اتم موجود نہیں ہے تو اُسے کائنات کی اس عظیم ہستی پر قلم نہیں اُٹھانا چاہیے اور اگر کسی ضرورت یا شوق سے آغاز کر دیا ہے تو پھر آقاؐ سے محبت کی بڑھوتری کے لیے دُعا اور سعی کرتے رہنا چاہیے۔ جب ہمارا ایمان ہی مکمل نہیں ہوگا تو ہم نبیؐ کی ذات سے انصاف کی مخلصانہ کوشش نہیں کریں گے۔ لہٰذا سیرت نگاری کے لیے پہلی شرط محبت ہے اور اگر سیرت سے محبت کی خوشبو نہیں آ رہی تو پھر اُسے تاریخ، سوانح یا پھر کوئی بھی دوسرا نام دے لیں، سِوائے سیرت النبیؐ کے۔

محبت کیا ہے؟ اس پر کچھ خیالات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن ہشام سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ، جناب عمرِ فاروقؓ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے تو اُنھوں نے عرض کی کہ یا رسولؐ اللہ! آپ مجھے اپنی جان کے سوا سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ یہ سُن کر آقاؐ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے (کامل تب ہو گے) جب مَیں تمھیں تمھاری جان سے زیادہ محبوب ہو جاؤں گا۔ جنابِ عمرؓ نے عرض کی کہ اللہ کی قسم آپ اب مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اے عمر! اب تمھارا ایمان مکمل ہوگیا۔ مہربان آقاؐ نے یہ اصول اُسے سمجھایا، جس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا اور یہ کہ عمرؓ سے شیطان بھی ڈرتا ہے۔ لیکن یہ عظمت اپنی جگہ، کامل ہونا ہے تو محمدؐ کی محبت شرطِ اوّل ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ حضرت اُمِّ سلیمؓ نبی کریمؐ کے قیلولہ کے لیے چمڑے کا فرش بچھایا کرتی تھیں۔ جب آپؐ کی آنکھ لگ جاتی تو مَیں آپؐ کا پسینہ مبارک اور گرے ہوئے مُوئے مبارک ایک شیشی میں جمع کر لیتا۔ جنابِ انسؓ نے وصیت کی تھی کہ یہ پسینہ اُنھیں دفنانے سے پہلے اُن

کی میّت پر لگایا جائے۔لہٰذا ایسا ہی کیا گیا۔

غزوۂ اُحد میں حضورؐ کے جسمِ اطہر پر آنے والے زخموں کو جناب مالکؓ بن سنان اپنی زبان اور ہونٹوں سے صاف کرتے رہے۔آپؐ نے مالکؓ سے فرمایا کہ خون تھوک دو۔محبت کی شِدّت سے سرشار صحابی نے جواب دیا کہ واللہ! میں ہرگز آپؐ کا خون نہیں تھوکوں گا اور وہ خون نگل لیا۔بظاہر صحابی کا یہ فعل دو لحاظ سے غلط تھا۔ایک یہ کہ خون حرام چیز ہے اور دوسرے یہ کہ اُنھوں نے حُکمِ نبیؐ ماننے سے انکار کیا۔لیکن آقاؐ نے اِرشاد فرمایا کہ جو شخص کسی جنّتی کو دیکھنا چاہے تو وہ مالکؓ بن سنان کو دیکھ لے۔

غزوۂ اُحد ہی کے موقعہ پر ایک انصاری صحابیہ کو یہ خبر دی گئی کہ آپ کے شوہر، بھائی اور باپ تینوں معرکہ میں شہید ہو گئے ہیں تو اس نے کہا کہ خدارا! یہ بتاؤ کہ میرے آقاؐ تو خیریت سے ہیں؟ اُسے بتایا گیا کہ ہاں آپؐ بخیریت ہیں لیکن وہ چہرۂ انور کی زیارت کے لیے بھاگ نکلی۔جب تسکین ہو گئی تو کہنے لگی کہ بس اب ہر مصیبت آسان ہے۔

یہ تو ہیں تاریخِ اسلام کے بہترین ایّام سے محبت کی کچھ مثالیں۔اب سوال یہ ہے کہ ازاں بعد ’محبت‘ سے محبت کیسے کی گئی اور آج یہ کیا تقاضا کرتی ہے۔حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ محبت، محبوب کے علاوہ دل سے ہر چیز کو مٹا دینے کا نام ہے۔(رسالہ قشریہ)

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ محبوب کی صفات کا محبّ میں آجانا، محبت کہلاتا ہے۔

ولی کامل جناب نبداد بن حسینؒ فرماتے ہیں کہ محبّت رغبت ہوتی ہے۔محبّت بے قراری ہے۔

شیخ ضیاء الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ محبّت محبوب کے ساتھ اُس کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں میں موافقت کا نام ہے۔

قارئین! میری خوش بختی ہے کہ میرے سینے میں اللہ نے ایسی ہستی کی محبت رکھ دی ہے، جس سے وہ خود محبّت کرتا ہے۔’حیاتی حضورؐ دی‘ پر کام کرنے کی ابتداء سے بہت پہلے رُسوائے زمانہ شاتمِ رسولؐ سلمان رُشدی کی ’شیطانی آیات‘ پر ردِّ فعل کے طور پر مَیں نے ’عورت، مغرب اور اِسلام‘ تصنیف کی۔اُس عہد میں میرے مطالعہ میں یہ وسعت بھی نہ تھی۔یہ صرف آقاؐ سے محبت کا نتیجہ تھا۔اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور کسی مسلمان کو نہیں ہونا چاہیے، کہ حضورؐ محبت کا جواب بھرپور محبت سے دیتے ہیں۔آپ نے

پیچھے پڑھا ہے کہ حکم عدولی کرنے والے مالک بن سنان کو جنت کی بشارت دے دی گئی۔ وجہ آپ قارئین کو معلوم ہے۔

'عورت، مغرب اور اِسلام' جیسی سادہ، مختصر اور عام سی کتاب کا مغرب کی تین یونیورسٹیز ترجمہ کر چکی ہیں۔ پنجابی زبان میں شہرہ آفاق قلم کاروں، عظیم الشّان اولیائے کرام اور صوفیاء نے وہ کام کر دکھایا ہے کہ دُنیا کی بہت سی زبانیں اس کے سامنے ہیچ نظر آتی ہیں۔ حضرت سلطان باہوؒ، میاں محمد بخشؒ، بُلھے شاہؒ اور وارث شاہؒ جیسی قد آور ہستیاں اب پنجابی زبان کو نصیب نہ ہیں لیکن اللہ اور اُس کے محبوبؐ نے 'حیاتی حضورؐ دی' کا کام میرے لیے خاص کر رکھا تھا۔ وجہ آپ معلوم کریں۔

میرے لیے جب بھی ممکن ہوتا ہے اور جب بھی اللہ توفیق بخشتا ہے، میں اللہ اور اُس کے محبوبؐ سے بات چیت بھی کر لیتا ہوں اور اپنی محبت کا اظہار بھی۔ قارئین استفسار کر سکتے ہیں کہ اللہ سے گفتگو کا ڈھنگ اور سلیقہ تو ہمیں محبوبِؐ خدا نے بتا دیا، جنابِ محبوبِؐ خدا سے گفتگو کیسے کی جاتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ بیان مشکل ہے۔ آپ جواب ڈھونڈنے کی کوشش کریں لیکن یاد رکھیں کہ 'محبت' شرطِ اوّل ہے۔ مذکورہ بالا تالیف کے دوران جب مَیں درجنوں کُتب کی چھان پھٹک کے بعد بھی ایک مسئلہ سے نہ نکل سکا تو مجھے سامنے دیوار پر فلم میں اصل واقعہ دِکھا دیا گیا۔ جب جناب عمرِ فاروقؓ کی صورتِ پاک دیکھنے کو اضطراب بڑھا تو اللہ نے اُن کی زیارت بخش دی۔ مَیں خلیفۂ دوم کا قد کاٹھ، وجاہت، داڑھی اور مونچھیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مونچھوں پہ مجھے زیادہ حیرت ہوئی۔ اُس شان سے ہی لگتا تھا کہ اگر ایک فاروق اور پیدا ہو جاتا تو آج کُرّۂ ارض کا کوئی گوشہ اِسلام کی روشنی سے منوّر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ قارئین! محبت شرط ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں ایک بزرگ بشر بن حافی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک روز بشر نشہ کی حالت میں گھر سے نکلے۔ راستے میں زمین پر ایک کاغذ کے پُرزے پر نظر پڑی جس پر 'بِسمِ اللہ الرّحمٰن الرّحیم' تحریر تھا۔ بشر نے تعظیم کے ساتھ اُٹھایا، خوشبو سے معطّر کیا اور ایک پاک صاف جگہ پر رکھ دیا۔ اُسی رات آپؒ نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے بشر! تم نے میرے نام کو خوشبو میں بسایا، قسم ہے مجھے اپنی عزت کی مَیں تمھارے نام کی خوشبو کو دُنیا و اخرت میں پھیلاؤں گا۔ حضرت علی ہجویریؒ لکھتے ہیں کہ آپؒ طریقت کے اماموں میں سے ایک ہیں۔

محبت کا جواب محبت ہی ہوتا ہے بشرطیکہ محبت خالص ہو۔ اِرشادِ ربانی ہے کہ ''اے ایمان والو! تم میں سے جو بھی حق تعالیٰ کے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا جو خدا کو محبوب رکھیں گے اور خدا اُن کو محبوب رکھے گا''۔ حدیثِ قُدسی ہے کہ بندہ جب کثرتِ نوافل سے میرا قُرب حاصل کر لیتا ہے تو مَیں اُسے محبوب بنا لیتا ہوں۔ جب وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے تو مَیں اُس کے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں اور زبان بن جاتا ہوں کہ وہ مجھی سے سُنتا ہے اور مجھ ہی سے دیکھتا ہے۔ گویا محبّت کا جواب، محبّت ہی ہے۔ تو منزل کے حصول کے لیے پہلی سیڑھی کیا ہوئی؟ جواب ہے محبت۔

**ربِّ رحیم:** حیاتِ انسانی ایسے تجربات و حوادث سے بھری پڑی ہے جو دمِ واپسیں بھی انسان کے سینے میں ہی دفن رہتے ہیں، شاید لوگوں کے خوف کی وجہ سے یا کسی دیگر مصلحت کے تحت۔ حسین بن منصور حلاّج کے اُستاد عمرو بن عثمان نے حسین کو ایک بات مخفی رکھنے کا حکم دیا تھا لیکن اُس نے اُسے راز نہ رہنے دیا۔ بات باریک تھی اِس لیے لوگ سمجھ نہ سکے اور عمرو بن عثمان کو چھوڑ دیا۔ اُنھوں نے حلاج پر ملامت کی اور کہا کہ اے اللہ! حلاج پر ایسا شخص مقرر کر دے جو اسے سُولی پر چڑھا دے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ راز نہ رہنے دینا اور سچ کہتے رہنا حسین کا مزاج تھا، وہ جو دیکھتا تھا کہہ ڈالتا تھا۔ اُس نے ایک دفعہ جنید بغدادیؒ کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ حضرت عبدالرحمٰن جامی 'نفحات الانس' میں لکھتے ہیں کہ جنیدؒ نے اندر سے آواز دی کہ کون ہے؟ کہا کہ خدا ہوں۔ جنید نے جواب دیا کہ تُو خدا نہیں ہے مگر خدا کے ساتھ ہے۔ (ص:157)

سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 115 کا گہرا اور مخلصانہ مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہر چیز میں اللہ ہی اللہ ہے۔ این مَیری شمل لکھتی ہیں کہ ''اِس آیت کو آسانی سے اسلام کی ہمہ اوستی تعبیر کے لیے مستعار لیا جاتا ہے۔'' (نیّرِ تاباں مولائے روم، صفحہ 385)۔ سالک کا مقصدِ حیات قُربِ اِلٰہی ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی معرفت میں اِس قدر ڈوب جاتا ہے کہ کسی لمحہ بھی اُس کا دھیان غیر اللہ کی طرف نہیں جاتا، یہاں تک کہ وہ اپنی ذات کو بھی فنا کر دیتا ہے۔ ایسے میں اُسے کسی چیز کا غم اور خوف نہیں رہتا۔ جب اُسے اپنی ہستی نظر ہی نہیں آتی تو پھر ڈر کس چیز کا، لہٰذا اُس کے لیے سچ کہنا کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ حسین بن منصور نے جس وقت خود کو خدا کہا اُس وقت اُسے خدا کے علاوہ کسی ہستی اور چیز کا اِدراک ہی نہیں تھا۔ استغراق کا یہ عالم تھا کہ محو و اثبات کا تصوّر رہی ختم ہو چکا تھا، لہٰذا اُس وقت جو سچ اُسے نظر آیا، اُس نے کہہ دیا۔ جرم کیا ہوا؟

مَیں بعض اوقات اپنے احباب سے یہ عرض کرتا ہوں کہ نبوّت کا سلسلہ ختم ہو چکا، وحی کا نہیں ہُوا تو اِس پر اظہارِ حیرت کیا جاتا ہے کہ کیا یہ دو جدا چیزیں ہیں۔ ہاں یہ دو جُدا چیزیں ہیں۔ اللہ نے اپنے بندوں کی راہنمائی کا سلسلہ موقوف و معطّل نہیں کر دیا۔ وہ جب چاہتا ہے اور جس کی چاہتا ہے راہنمائی بھی فرماتا ہے اور اُسے حکم بھی دیتا ہے، خواب و بے داری کسی بھی حالت میں۔ جہاں کہیں اللہ اور بندے کا رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے تو بعض اوقات محویت اور استغراق کی وجہ سے بندہ پر دیوانگی بھی طاری ہو جاتی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ پاک کو اِتنا زیادہ یاد کرو کہ لوگ تمھیں دیوانہ کہنے لگیں۔ اِسی طرح حضرت ابو ہُریرہؓ سے روایت ہے کہ آقاؐ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے پراگندہ بال لوگ ایسے ہیں کہ جن کو دروازوں پر سے دھکّے دیے جاتے ہیں لیکن وہ ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اُن کی قسم پوری فرما دے۔ (صحیح مسلم) گویا چیزیں وہ نہیں ہوتیں جو نظر آتی ہیں۔ ایک صحابی دیوانہ نظر آ سکتا ہے اور اُلجھے بالوں والا پریشان حال انسان اِتنا کامل ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اللہ کی قسم کھالے تو اللہ اُس سے محبت کی وجہ سے اُس کی قسم کو پورا کر دے۔

قارئین! اِن تمہیدی کلمات کے جو چاہیں مطالب و معانی اخذ فرمالیں، مجھے یہ کہنا ہے کہ اللہ کا اپنے بندے سے رشتہ اور تعلق اُسی طرح قائم اور اُسی طرح مضبوط ہے جس طرح اُس روز تھا جب اُس نے سوال کیا تھا 'اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ'۔ اس 'میثاقِ عام' میں اللہ نے اگر بندے کو یہ کہا ہے کہ کہیں بھول نہ جانا کہ مَیں تمھارا رب ہوں تو معاہدے کے فریقِ اوّل ہونے کے ناطے ربوبیّت کی ذمہ داری قبول فرما کر بندے پہ احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ اِسی ازلی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیّتِ عامہ کے عقیدے پر متفق رہی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر درجہ اور ہر طبقہ کے انسانوں کا خدا کی ربوبیتِ کُبریٰ پر اتفاق و اجماع اِس بات کی پُختہ دلیل ہے کہ اللہ نے اپنے بندے کو تنہا نہیں چھوڑا۔ اور اگر وہ بندے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے تو وہ بندے کی مدد اور راہنمائی کیوں نہیں کرے گا۔ یہ کارِ دیگر ہے کہ بندہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلے، اگرچہ اس پر بھی وہ وارننگ دیتا ہے کہ اے جن و اِنس! میری سلطنت سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ، لیکن ایسا کر نہیں سکو گے۔ (الرحمٰن: 33)

2012 کی بات ہے کہ ایک روز مَیں کسی سوچ بچار میں گم تھا کہ اچانک مجھے ایک کتاب دکھائی

گئی جس کا ٹائٹل تھا 'ربِّ رحیم' اور نیچے ایک کونے میں 'اصغر علی جاوید' لکھا تھا۔ اِس سے مَیں کسی تحیّر میں مبتلا نہیں ہوا کہ ایسے تجربات ماضی میں ہو چکے تھے لیکن اِسے نظرانداز کر دینا بھی عقل وفہم کے خلاف تھا۔ سو چند ایّام کے بعد مَیں نے اسماء الحسنٰی کا تحقیقی مطالعہ شروع کر دیا۔

اوّلین مسئلہ جو درپیش تھا، وہ یہ تھا کہ آخر 'ربِّ رحیم' ہی کیوں؟ مَیں نے رُوحُ البیان میں پڑھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے تین ہزار نام ہیں، جن میں ننانوے اسمائے حسنیٰ کا قرآنِ پاک میں ذِکر ہے۔ اِبنِ کثیر، اِمام رازی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پانچ ہزار نام ہیں۔ دُنیا کے مشہور افسانوں میں سے ایک افسانہ 'The Nine Billion Names of God' ہے جو آرتھر سی۔ کلارک کے قلم کا شاہکار ہے۔ یہ کہانی تبّت کے بُدھوؤں کے گرد گھومتی ہے جنھیں یقین ہے کہ اللہ کے 9 بلین نام ہیں اور وہ بُدھ اُنھی پر کام کرتے ہیں۔

اللہ نے قرآنِ پاک میں 2697 بار اِسمِ مبارک 'اللہ' کا ذکر کیا ہے۔ پھر مختلف اسمائے پاک کے ازواج بنائے گئے ہیں۔ صرف 'غفور الرّحیم' کی تکرار 69 بار کی گئی ہے۔ تو پھر 'ربِّ رحیم' ہی کیوں؟ جس کا ذکر صرف ایک بار آیا ہے۔ سعی کی تو منکشف ہوا کہ انسانوں کو ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب جھولی بھر دی گئی ہوگی۔ کشکول تنگ پڑ جائے گا۔ دامن کی ساری وسعتیں اپنی انتہا کو پہنچ جائیں گی اور بندگانِ خدا بس بس کے آوازے لگا رہے ہوں گے۔ اہلِ جنت ہی نہیں، جنت بھی مبہوت ہوگی۔ ایسے میں اچانک اُوپر سے ایک نور چمکے گا۔ خالق اپنے بندوں سے کہہ رہا ہوگا، 'السّلامُ علیکم'۔

اللہ نے اپنے بندوں کو جب اِس سب سے بڑے تحفے سے نوازنا ہے تو اس وقت یہ عطا 'ربِّ رحیم' کی طرف سے ہوگی۔

سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ (یٰسٓ:58)

جواب مل چکا تھا۔ مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ راہنمائی کر دی گئی تھی۔ لہٰذا مَیں نے حافظ احمد یار اور حافظ انعم حسین کو ساتھ لیا اور کام کی ابتداء کر دی۔ اِس دوران بار بار یہ ارشاداتِ ربّانی سامنے آتے رہے کہ:

'اے نبیؐ! کہہ دیجیے کہ اگر میرے پروردگار کے کلماتِ حکمت (لکھنے) کے لیے سمندر سیاہی بن جائے تو ضرور سمندر اِس سے پہلے ہی نبڑ جائے کہ میرے پروردِگار کے کلماتِ حکمت تمام ہوں، اگرچہ اِتنی ہی

مدد اور لے آئیں۔' (18:109)

اور یہ کہ:

''اور اگر جتنے درخت ہیں زمین میں قلم ہوں اور سمندر ہو اس کی سیاہی، اس کے پیچھے ہوں سات سمندر (تو پھر بھی) اللہ کی باتیں تمام نہ ہوں۔ بے شک اللہ زبردست ہے حکمتوں والا'' (31:27)۔

اب کہیئے قارئین! کوئی پہاڑ، کوئی سمندر، کوئی جن یا انسان دعویٰ کرسکتا ہے کہ میں نے حق ادا کر دیا ہے مالک کی تسبیح بیان کرنے کا؟ مَیں نے تو بس اُن آیاتِ قرآنی کو یکجا کر دیا ہے جن میں اللہ نے اپنی رحمت و رافت کا ذکر فرمایا ہے۔ تقسیم و ترتیب کچھ یوں ہے:

رَبِّ الرَّحِیم، اَلرَّحمٰن الرَّحِیم، غَفُوْرُ الرَّحِیم، عَزِیْزُ الرَّحِیم، التَوَّابُ الرَّحِیم، الرَّؤُفُ الرَّحِیم، البرّ الرَّحِیم، اَلرَّحمٰن، اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْن، خَیرُ الرّٰحِمِیْن، الرَّحِیمُ الْوَدُوْد، غَفُوْرُ الْوَدُوْد، الرَّحِیم الْغَفُوْر، اَلْعَزِیْزُ الْغَفَّار، اَلْعَزِیزِ الْغَفُوْرُ، غَفُوْرًا شَکُوْرًا، غَفُوْرُ شَکُوْر، حَلِیْمًا غَفُوْرًا، عَفُوًّا قَدِیْرًا، خَیرُ الْغٰفِرِیْنَ، رَؤُفٌ، رَبِّ الْعِبَاد، التَّوَّابٌ حَکِیْمٌ، غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ، عَفُوًّا غَفُوْرًا، رَبٌّ غَفُوْرٌ، غَنِیٌّ کَرِیْم، عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ، اَلْوَهَّابُ، اَلْغَفَّارُ، تَوَّابًا رَحِیمًا، غَفُوْرُ اور حَلِیْمٌ۔

علاوہ ازیں کتاب زیرِ ذکر میں 31 ایسی آیاتِ کریمہ کا بھی ذکر ہے جن سے رب تعالیٰ کی رحمت بے حساب ٹپکتی ہے۔ مثلاً:

''تمھارے رب کی رحمت میں بڑی وسعت ہے'' (16:147)

''میری رحمت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے'' (7:156)

اور ''آس مت توڑو اللہ کی رحمت سے'' (39:53)

اب میری ڈائری کے 28.07.2015 کا ورق ملاحظہ فرمائیں۔ لکھا ہے:

''15-7-28 کا خوب صورت دن تمام ہوا۔ تین سال سے زیرِ التوا 'ربِّ رحیم' مکمّل ہوگئی۔ رات کے 12:05 بجے ہیں۔ مَیں نے شکرانے کے دو نفل ادا کر کے ربِّ رحیم سے التجا کی ہے کہ یہ مشکل

کام میرے کرنے والا نہیں تھا، پتہ نہیں کیوں آپ نے میرے ذمہ لگا دیا۔"

اَلحمدُلِلّٰہ، ثُمَّ اَلحمدُ لِلّٰہ

29-7-15

12:15 AM

**کچھ بڑے حادثات:** سقوطِ ڈھاکہ تاریخِ پاکستان ہی نہیں، تاریخِ اِسلام کے بڑے سانحات میں سے ایک ہے۔ 16۔ دسمبر کا دن آتا ہے تو ہر حسّاس پاکستانی کا چہرہ مرجھایا نظر آتا ہے۔ 2014 کا یہی 16۔ دسمبر تھا کہ کچھ بین الاقوامی سازشوں کی تکمیل کے لیے میرے وطنِ عزیز میں مہکنے والے کچھ خوشنما پھولوں کو پشاور میں مسل دیا گیا۔ بے گناہ معصوم بچے خون میں لت پت تڑپتے رہے اور کرب وبلا کی تاریخ کو تازہ کیا جاتا رہا۔ عہدِ حاضر کیا، پوری تاریخِ اقوامِ عالم اِس طرح کی کوئی دوسری مثال شاید ہی پیش کر سکے۔ چند ٹکوں کی خاطر عظمتِ اِسلام کے نام پر، اِسلام کے روشن چہرے پر سیاہی مل دی گئی اور کم و بیش ڈیڑھ سو معصوم فرشتوں سے خون کی ہولی کھیلی گئی۔

APS پشاور کے سانحہ کے بعد قوم کو اِس قدر غمزدہ 22۔ جون، 2016 کو دیکھا گیا جب بین الاقوامی شہرت کے حامل پاکستانی قوال امجد صابری کو کراچی میں قتل کر دیا گیا۔ قطع نظر اِس کے کہ اس کا جرم کیا تھا، قوم کی افسردگی دیدنی تھی۔ چند ہی روز بعد 8۔ جولائی کو کراچی میں ہی امن کے پیام بر اور مشہورِ عالم انسان پرست فرشتہ عبدالستار ایدھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اُس روز بھی ہر پاکستانی آنکھ اشکبار دیکھی گئی۔ حضرت ایدھی کو 25 سال قبل تیار کردہ قبر میں سرکاری اعزاز کے ساتھ اُتارا گیا۔ تینوں مسلح افواج کے سربراہان، صدرِ پاکستان، وزیرِ اعظم کے نمائندہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب اور سندھ کے گورنر اور وزیرِ اعلیٰ نمازِ جنازہ میں شریک تھے۔ امجد صابری کے جنازہ کی طرح جناب ایدھی کے جنازہ میں شرکت کا اعزاز عزیزی فیصل جاوید کو بھی حاصل ہوا۔ دونوں ہی مواقع پر وہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے ساتھ وزیرِ اعظم اور صوبہ پنجاب کی نمائندگی کرنے والوں میں شامل تھا۔ اُن دِنوں وہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے شعبہ تعلقاتِ عامہ سے منسلک تھا۔

امجد صابری کا ذکر جب بھی سُننے کو ملے تو یہ کلام بے ساختہ زبان پر آ جاتا ہے:

مَیں قبر اندھیری میں گھبراؤں گا جب تنہا
اِمداد مِری کرنے آ جانا رسولؐ اللہ
روشن میری تُربت کو لِلّٰہ ذرا کرنا
جب وقتِ نزع آئے ، دیدار عطا کرنا

امجد کی خوب صورت آواز اور اللہ کا عطا کردہ سلیقہ اور ڈھنگ دل پہ عجیب سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی سماعت فرمائیے گا۔

**عدلیہ سے شِکوے:** میں نے معروف ترین ماہرینِ قانون اور دانش وروں کی زبان سے متعدد بار یہ جملہ سُنا ہے کہ پاکستان کو جتنا نقصان پاکستانی عدلیہ نے پہنچایا ہے، اور کسی اِدارے نے نہیں پہنچایا۔ 2023 کے جن ایّام میں زیرِ نظر الفاظ نوکِ قلم پر آ رہے تھے، ان میں بھی پاکستان کی لائقِ صد اِحترام عدلیہ ہمیشہ کی طرح بحرانی کیفیت میں تھی، یہاں تک کہ عدالتِ عظمیٰ کو بھی قوم کے کسی طبقہ کا اعتماد حاصل نہ رہا۔

اعلیٰ عدالتوں پر عوام کی بداعتمادی کا آغاز اُس وقت ہوا تھا جب 1954 میں مشرقی پاکستان اسمبلی میں مُسلم لیگ کے اراکین کی تعداد 10 کی حد تک کم ہوگئی اور اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مُسلم لیگ عوام کا اعتماد تیزی سے کھو رہی ہے۔ اُن ایّام میں دوسرا حادثہ یوں ہوا کہ دستور ساز اسمبلی نے گورنر جنرل ملک غلام محمد کی عدم موجودگی میں 1935 کے انڈیا ایکٹ کی دفعہ 10 بھی منسوخ کر دی، جس کے تحت گورنر جنرل کابینہ کو برخواست کر سکتا تھا۔ یہ کاروائی بڑی عجلت میں کی گئی اور یوں گورنر جنرل ناراض ہو گئے۔ اُنھوں نے رائے عامہ سے فائدہ اُٹھایا اور ایک اعلان کے ذریعے 24 اکتوبر 1954 کو ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا؛ اسمبلی توڑ دی اور وزیرِاعظم محمد علی بوگرہ کو نئی کابینہ بنانے کی دعوت دی گئی جو اُنھوں نے منظور کر لی۔

مولوی تمیزالدین خاں، جو منسوخ شدہ اسمبلی کے صدر تھے، نے گورنر جنرل کے اقدام کو سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا اور فیصلہ مولوی تمیزالدین کے حق میں ہو گیا۔ مولوی صاحب کا موقف تھا کہ اسمبلی

میری ہے، میں اس کا صدر ہوں، گورنر جنرل کون ہوتا ہے ایک ادارے کو قتل کرنے والا؟ اس کے باوجود سپریم کورٹ نے، حکومت کی اپیل پر سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کے برعکس، فیصلہ حکومت کے حق میں دے دیا اور یوں مولوی تمیزالدین سپیکر آئین ساز اسمبلی یہ مقدمہ ہار گئے۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ پاکستان کی عدلیہ کا پہلا متنازعہ فیصلہ قرار دیا گیا۔ اس فیصلہ کے ساتھ ہی اُس وقت کے چیف جسٹس، جسٹس محمد منیر اور عدالت عظمیٰ پر تنقید کے عمل کا آغاز ہوگیا۔ ازاں بعد سپریم کورٹ کے بہت سے ایسے فیصلہ جات ہیں جنھیں ماہرین قانون کے علاوہ عوامی حلقوں میں بھی زیر بحث لایا گیا اور اُنھیں ناپسندیدہ اور غیر مقبول فیصلے قرار دیا گیا' جن میں مشہور، 'نظریہ ضرورت' اور بھٹو کی سزائے موت کے فیصلے سرفہرست نظر آتے ہیں۔

قابل احترام اعلیٰ عدلیہ کے چہرے سے دھبے صاف کرنے والا 20 جولائی کا فیصلہ عوامی توقعات کے عین مطابق آیا' جس سے آمرانہ اور یک طرفہ فیصلوں کے حکومتی رجحان کی زبردست حوصلہ شکنی ہوئی۔ لیکن یہ سب کچھ حادثاتی طور پر اور رحم دلانہ انداز میں نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے مکمل طور پر ہم نوا قوم اور قانون سے وابستہ افراد کی ایک ان تھک جدوجہد نظر آتی ہے۔ یوں اعتزاز حسن، حامد خاں، منیر اے ملک، علی احمد کرد، قاضی انور، طارق محمود اور احسن بھون جیسے دانشور وکلاء کی قیادت میں ایک مکمل تحریک کا رُوپ دھار لینے والی جہد مسلسل بالآخر بہترین ثمرات پر منتج ہوئی۔

چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف صدارتی ریفرنس کی سماعت کے دوران چیف جسٹس اور بارز کے وکلاء نے عدالت عظمیٰ کے 13 رکنی بینچ کی توجہ بار بار اس جانب مبذول کرائی کہ ماضی میں اس معزز عدالت سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں اور اب وقت ہے کہ گئے دنوں کی اُن غلطیوں کا ازالہ کیا جائے اور عوام کو، اور ایک جمہوری سلطنت کو مزید اذیت سے دُور رکھا جائے۔ سنیئر ایڈووکیٹ فخر الدین جی ابراہیم نے تو بلوچستان ہائی کورٹ بار کی نمائندگی کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ: ''ماضی کی غلطیوں کے ازالہ کا وقت آن پہنچا ہے، کیونکہ ریاست کا بیڑا ڈوب رہا ہے اور عوام سپریم کورٹ کو واحد نجات دہندہ کے طور پر دیکھ رہے ہیں''۔ لہٰذا عدلیہ کو چاہیے کہ وہ خود کو ایک آزاد ادارہ ثابت کریں۔

اس منظر نامہ کی طرف نظر ڈالنے کے بعد اَب ہم پس منظر اور پیش منظر کی طرف بڑھتے ہیں، اور پہلے پس منظر:

جسٹس افتخار محمد چوہدری نے نے 30 جون 2005 کو بحیثیت چیف جسٹس سپریم کورٹ اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا اور 9 مارچ 2007 کو اپنی غیر فعالیت تک کم وبیش پانچ ہزار سوؤ موٹو مقدمات کا آغاز کیا' جس سے کچھ حکومتی ادارے اور کچھ رفقائے کار، جن پر کام کا بوجھ بڑھ رہا تھا، ناراض ہونا شروع ہوگئے۔ اس سے ایک طرف تو اُن کی سخت گیری زبان زدعام ہوئی تو دوسری طرف پاکستان سٹیل ملز کی پرائیوٹیائزیشن کیس پر چیف جسٹس کے ریمارکس نے ارباب اختیار کی ناراضی کو مہمیز کردیا۔ چیف جسٹس نے قرار دیا کہ عارف حبیب گروپ کے کرتا دھرتا، شوکت عزیز کے سابق کلائنٹ اور ذاتی دوست ہیں، لہٰذا یہ فروخت اسی بناء پہ غیر قانونی ٹھہرتی ہے۔

اس مقدمہ کی بازگشت اپنے عروج پر تھی کہ مبّینہ طور پر امریکی ایجنسیوں ایف۔ بی۔ آئی اور سی۔ آئی۔ اے اور پاکستانی ایجنسیوں آئی۔ ایس۔ آئی، ایم۔ آئی اور آئی۔ بی کے ہاتھوں اُن پاکستانیوں کے اغوا کا مسئلہ سامنے آیا جنھیں نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کرتے ہوئے غائب کردیا گیا۔ اس مسئلہ کو جب سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا تو چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی سربراہی میں ایک بینچ نے وزارت داخلہ اور ایجنسیوں کے نمائندگان کو ہدایت کی کہ وہ عدالت میں حاضر ہوکر پیدا ہونے والے سوالات کے جواب دیں۔ ظاہر ہے اس طرح کی کاروائی خفیہ ایجنسیوں کے کارناموں کو منظر عام پر لارہی تھی لہٰذا اُنہی ایجنسیوں نے پاکستانی قوم کے اُس فرد واحد کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنانا شروع کیا، جو اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتا تھا، اور کر رہا تھا۔ چیف جسٹس کے خلاف یہی سازش 9 مارچ 2007 کو اُن کی معطّلی پر منتج ہوئی۔ بظاہر الزمات یہ تھے:

i۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے سرکاری حکام کو غیر قانونی طور پر مجبور کیا کہ وہ اُن کے بیٹے کو میڈیکل کالج میں داخلہ دلائیں۔ ازاں بعد اُنہیں گریڈ 18 میں پولیس افسر بھرتی کرالیا۔

ii۔ وہ 1700 سی سی کار کے استعمال کا اختیار رکھتے تھے لیکن اُنھوں نے 3000 سی سی مرسڈیز کار اپنے زیر استعمال رکھی۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی گاڑیاں اُن کے زیر استعمال رہیں۔

iii. اُنھوں نے اپنے استحقاق سے زیادہ پروٹوکول کی توقع رکھی۔ وہ متقاضی تھے کہ ائیر پورٹس پر سنئیر افسران اُن کا استقبال کریں۔ مزید برآں وہ ذاتی تقریبات کے لئے ہیلی کاپٹرز اور جہاز استعمال کرتے تھے۔

iv۔ اُن کا خاندان RAZIA-1 نمبر کی بی ایم ڈبلیو کار استعمال کرتا تھا۔

v ۔ اُنھوں نے زبانی اور تحریری طور پر احکامات کے ذریعے ایسے مالی فوائد حاصل کیئے جنکی مالیت 55 ملین روپے تک تھی۔

vi۔ وہ اُس سے زیادہ اختیارات کے متقاضی تھے جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے۔

13 مارچ 2007 کو سپریم جوڈیشل کونسل نے چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس کی سماعت کا آغاز کیا تو پورے پاکستان میں غم وغُصہ کی لہر دوڑ گئی۔ پوری وکلاء برادری مجسم احتجاج تھی اور قوم وکیلوں کی ہم نوا تھی۔ تاہم سپریم جوڈیشل کونسل نے سماعت 16 مارچ تک ملتوی کر دی۔ اُس روز غیر فعال چیف جسٹس نے ایک چہار صفحاتی پریس ریلیز جاری کی جس میں اُنھوں نے موقف اختیار کیا کہ نہ تو صدر مشرف اور نہ ہی سپریم جوڈیشل کونسل بااختیار ہے کہ وہ اُنھیں کام کرنے سے روکے۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اُن کے گھر کے ٹیلی فون منقطع کر دیئے گئے ہیں اور گاڑیاں اُٹھالی گئی ہیں۔ 16 مارچ 2007 کو غیر فعال چیف جسٹس نے سپریم کونسل سے گذارش کی کہ چونکہ اُن کے وکلاء کو حکومت نے اُن سے ملنے کی اجازت نہیں دی لہٰذا سماعت 26 مارچ تک ملتوی کر دی جائے لیکن کونسل نے اگلی تاریخ سماعت 21 مارچ مقرر کر دی۔ اُس روز شدید احتجاج ہوا اور عوامی توجہ ہٹانے کے لئے حکومتی اہل کاروں نے 'جیو ٹیلی ویژن' اسلام آباد کے دفاتر پر حملہ کر دیا۔

اس صورت حال نے پورے ملک میں بے چینی کی شدید لہر کو جنم دیا۔ قومی مطالبات یہ تھے:

i. آئین کی بالادستی ii. قانون کی حکمرانی iii. بنیادی حقوق کا تحفظ

اُنہی دنوں مختلف بار کونسلز کی جانب سے چیف جسٹس کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ اس سلسلے کی ایک دعوت سٹی بار ایسوسی ایشن کراچی کی جانب سے دی گئی جہاں جسٹس چوہدری نے 12۔ مئی، 2007 کو پہنچنا تھا۔ چیف جسٹس جونہی کراچی ائیر پورٹ پر پہنچے، مبینہ طور پر ایم کیو ایم نے اپنے روایتی تشدد پسند حربوں کا استعمال شروع کر دیا اور جسٹس چوہدری کے استقبال کے لئے آنے والوں پر فائرنگ شروع کر دی، جس کے نتیجے میں 42 بے گناہ افراد مارے گئے اور 140 کے قریب زخمی ہو گئے۔

اُسی روز ایک پرائیوٹ ٹی وی چینل 'آج' کراچی پر بھی حملہ کیا گیا۔ چیف ایگزیکٹو ارشد زبیری کے مطابق ''ہمارے کیمرہ مین ریلی کی فلم بنانے میں مصروف تھے کہ اچانک اسلحہ برداروں نے ہمارے دفتر پر فائرنگ شروع کردی۔ 6 گھنٹے کی مسلسل فائرنگ کے باوجود وہاں کوئی سکیورٹی اہل کار نہ پہنچ پایا۔ایم کیوایم کے لوگوں نے 'آج' بلڈنگ کو آگ لگادی' جو یہ چاہتے تھے کہ پرتشدد کارروائی کی لائیو کوریج روک دی جائے''۔

12 مئی کے ان واقعات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پورے مُلک میں اربابِ اختیار کے خلاف نفرت کے جذبات اپنے عروج پہ پہنچ گئے۔ 14 مئی کو سپریم کورٹ کے ایڈیشنل رجسٹرار سید حماد رضا کو خفیہ ہاتھوں نے محض اس لئے قتل کردیا کہ اُنھوں نے جسٹس چوہدری کے خلاف حکومت کا آلہ کار بننے سے انکار کردیا تھا۔اس قتل نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور یوں حکومت کے عزّت ووقار کے تابوت پر آخری کیل نیک سیرت حماد کا قتل ہی ثابت ہوا۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں آمریت کے سیاہ کارناموں کی جب فہرست ترتیب دی جائے گی تو حماد رضا کا قتل ٹاپ پوزیشنز میں آئے گا۔

14 مئی کو ہی جسٹس فلک شیر نے چیف جسٹس کیس کی سماعت سے معذرت کی تو ایک تیرہ رکنی فل بینچ تشکیل دیا گیا جس میں جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے (سربراہ)، محمد نواز عباسی، فقیر محمد کھوکھر، میاں شاکر اللہ جان، ایم جاوید بٹر، تصدق حسین جیلانی، سید سعید اشہد، ناصر الملک، راجہ فیاض احمد، چوہدری اعجاز احمد، سید جمشید علی، غلام ربانی اور حامد علی مرزا شامل تھے۔فل بنچ کے سامنے پہلے جسٹس چوہدری نے اپنا موقف پیش کیا اور ازاں بعد چیف آف سٹاف ٹو پریذیڈنٹ، ڈی جی ملٹری انٹیلی جینس اور ڈی جی، آئی بی کے بیانات حلفی حکومت کی طرف سے داخل کئے گئے، جو نہ صرف میڈیا میں مذاق بنے رہے بلکہ عدالت میں بھی کوئی مثبت تاثر قائم نہ کرسکے۔ 17 جولائی کو اسلام آباد میں جسٹس چوہدری کے استقبال کے لئے لگائے گئے ایک کیمپ میں بم کے ذریعے کم وبیش 15 افراد کو شہید کردیا گیا۔ چیف جسٹس کے حامیوں کے مطابق یہ قتل بھی خفیہ ہاتھوں ہی کی کارستانی تھی۔20 جولائی 2007 کو تیرہ رکنی بنچ نے چیف جسٹس کی غیر فعالیت کو غلط قرار دیتے ہوئے صدارتی ریفرنس مسترد کردیا تاہم تین ججز نے ریفرنس کالعدم قرار دینے سے اختلاف کیا، اگرچہ غیر فعالیت کو غلط

قرار دیا۔

چیف جسٹس کی بحالی سے اُمید و آس کا ڈوبتا ہوا ٹائی ٹینک پھر وسیع سمندروں میں تیرتا نظر آنے لگا اور قوم نے عدالت عظمیٰ سے یہ اُمید وابستہ کرلی کہ اب پھر سوال اُٹھے گا کہ:

i. اُن ماؤں کے آنسو کیوں نہیں پونچھے جاتے جن کے جگر گوشوں کو امریکہ کے ہاتھوں بیچ دیا گیا؟

ii. دوہری شہریت والا شوکت عزیز وزیر اعظم پاکستان کیسے بن گیا؟

iii. کیا صدر، ملٹری چیف ہوسکتا ہے؟

iv. کیا پرویز مشرف کے پاس صدارتی انتخاب میں حصّہ لینے کا اختیار تھا بھی یا نہیں؟

v. کیا ایک قیدی سے کیا گیا معاہدہ دنیا کے کسی قانون میں لائق اعتبار اور قابل عمل ہوتا ہے جبکہ پولیس حراست میں لیا گیا بیان لائق حجت نہ ہے۔

vi. لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے معمہ سے کتنے ماسک اتر سکیں گے؟

vii. کیا پاکستان کی سیاسی تاریخ کا سب سے بھاری مینڈیٹ حاصل کرنے والا وزیر اعظم اپنے وطن واپس لوٹ سکے گا؟ (2007 کے تناظر میں پڑھا جائے)

اور اس عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔ تازہ ترین اطلاع کے مطابق جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم نے شریف برادران کی غیر آئینی جلاوطنی کے خلاف پٹیشن تیار کرلی ہے اور دنگل شروع ہونے والا ہے۔

یہ مطالبہ بھی سامنے آرہا ہے کہ 12 مئی اور 17 جولائی کو جو خونچکاں داستانیں رقم کی گئیں، اُن کی اعلیٰ سطحی عدالتی تحقیقات کے بعد متاثرہ خاندانوں کو معاوضہ دیا جائے اور ذمہ داران کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ حماد رضا قتل کیس بھی اسی فہرست میں آجائے گا۔

خیال کیا جارہا ہے کہ پاکستان تحریک انصاف یا کسی دیگر فرد واحد کی طرف سے MQM کو دہشت گرد یا غیر قانونی جماعت قرار دلوانے کے لئے عدالت سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اُمید ہے کہ ٹیسٹ کیس نواز، شہباز کی جلاوطنی ہی بنے گا۔

قارئین! ہم لکھنے والے بھی کتنے خوش فہم ہوتے ہیں۔ 21 جولائی، 2007 کی میری درج بالا خواہش اب حسرت بن گئی ہے۔ آج 2023 میں وطن عزیز کے چوبیس کروڑ باسیوں کو پتلی تماشہ کی نہ نظر آنے

والی ڈوری کے ساتھ کس طرح نچایا جا رہا ہے، کبھی وقت ملے تو سوچیئے گا۔

اِن دِنوں عدلیہ فیصلے کرتی ہے لیکن انتظامیہ عمل نہیں کرتی بل کہ عدلیہ کی توہین کرتی ہے۔ بینچ بنتے ہیں جو چیف جسٹس کا اختیار ہے لیکن نہ صرف حکومت اور فریقینِ مقدمہ بل کہ خود بینچ کے معزز ارکان اعتراض اُٹھاتے ہیں اور بینچ ٹوٹ جاتے ہیں۔ عدالتِ عظمیٰ کے نصف درجن ججز کی دیانت اور دانش کو ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے۔ پارلیمنٹ میں عدلیہ کی تحقیر و تذلیل پر مبنی تقاریر کا سلسلہ جاری ہے اور عدلیہ اِس پر کسی کارروائی سے قاصر نظر آتی ہے۔ شاید ایسا کرنے والوں کا خیال ہے کہ اِس سے وہ ججز کو مرعوب کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں اور اب وہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کریں گے جو برسرِ اقتدار طبقہ کے مطلوبہ مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ عوامی حلقوں میں بھی کچھ اِسی طرح کی رائے سازی جاری ہے۔

اِن دِنوں سپریم کورٹ کے جس قابلِ احترام جج کو سب سے زیادہ ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے، وہ لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس کی ذمہ داریوں سے کامیابی سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔ اُن کے فیصلے اچھے اور طریقِ کار باوقار ہوتا تھا، لیکن وہ ہدف ہیں۔ سپریم کورٹ کے سینئر موسٹ جج کی سوشل میڈیا پر تذلیل کی جا رہی ہے بل کہ اُن کے والدِ محترم جو تحریکِ پاکستان کے راہنما تھے، کو بھی معاف نہیں کیا جا رہا۔ چیف جسٹس سے منسوب آڈیوز وائرل ہو رہی ہیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہ ہے۔ آخر یہ کیوں ہے؟ اِس کا سادہ اور سیدھا جواب یہ ہے کہ عدلیہ کی اہلیت، دیانت اور وقار کا فقدان ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ کمزور معاشرے میں کمزور کے لیے طاقتور قانون ہوتا ہے اور طاقتور کے لیے کمزور قانون۔

قانون کے ایک طالبِ علم اور اُستاد ہونے کی وجہ سے اگرچہ مجھے عدالتی نظام سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے لیکن کچھ ذاتی قانونی معاملات میں بھی مجھے تلخ تجربات سے گزرنا پڑا ہے۔ ان یادوں کو قلم بند کرتے ہوئے مذکورہ حوادث کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

پنجاب پبلک سروس کمشن میں ایک مقدمہ یہ تھا کہ ایک نوجوان نے نئی بھرتی پر سروسز ہسپتال سے میڈیکل سرٹیفیکیٹ حاصل کر کے محکمہ کو اپنی حاضری رپورٹ دے دی تاکہ اُس کے پوسٹنگ آرڈر جاری کر دیے جائیں۔ محکمہ نے اس پوسٹنگ آرڈر کو بوجوہ معرضِ التوا میں رکھا۔ التوا کے اِن لمحات میں چیف منسٹر پنجاب نے حکم جاری فرمایا کہ پنجاب گورنمنٹ کے تمام کنٹریکٹ ملازمین کو مستقل کر دیا جائے۔ لہٰذا اِس حکم نامہ کی رُو سے

ہمارے سائل کو بھی ریگولر کر دیا گیا۔ اِس کرم فرمائی کے نتیجے میں اُس کی سروس بک پر ریگولر کیڈر کا اندراج کر دیا گیا اور ایک طویل مُدّت تک اُس کی تنخواہ سے جی پی فنڈ کی کٹوتی ہوتی رہی۔ پھر اچانک خبر ملی کہ اُس کے ریگولرائزیشن کے آرڈرز کالعدم قرار دے کر اُسے واپس کنٹریکٹ پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ یہ کسی بھی پبلک سرونٹ کے لیے ایک انتہائی تکلیف دِہ امر ہونا قدرتی بات تھی۔

اِس زیادتی کے خلاف پنجاب پبلک سروس کِمشن میں اپیل ہی واحد چارہ جوئی تھی لہٰذا اِس کے لیے لاہور کے دو ایسے جہاندیدہ اور تجربہ کار ماہرینِ قانون سے مشاورت کی گئی جنھیں اِن معاملات (Service Matters) کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ یہ بزرگ جناب شبیر احمد بٹ سابق ڈائریکٹر لیگل اینڈ لیبر واپڈا اور جناب عصمت کمال خاں تھے۔ اپیل جناب شبیر احمد بٹ نے تیار کی لیکن بحث کے روز وہ بیمار پڑ گئے جس کے نتیجے میں یہ ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ مَیں نے کوئی بیس منٹ کی بحث کے دوران معزز رُکن کِمشن کو قائل کر لیا کہ محکمہ کی یہ کارروائی دو وجوہات کی بِناء پر غلط ہے۔ ایک تو یہ کہ وزیرِ اعلیٰ کے حکم نامہ سے پہلے سائل حاضری رپورٹ دے چکا تھا لہٰذا وہ حکومت پنجاب کا ملازم بن چکا تھا اور دوسرا یہ کہ کسی ملازم کو ریگولر کیڈر میں لا کر اُسے کسی بھی بِناء پر دوبارہ کنٹریکٹ پر نہیں دھکیلا جا سکتا۔ معزّز رُکن کا رویّہ اطمنان بخش تھا اور وہ میرے مقدمہ سے اتفاق کر چکے تھے۔ اُس روز دوسرا دلچسپ اور حیران کُن تجربہ یہ ہوا کہ سرکاری وکیل نے معزّز رُکن کِمشن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''سر! وکیل صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔'' اِس کا واضح مطلب یہ تھا کہ فاضل دوست مقدمہ سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ لہٰذا بحث کے خاتمہ پر پارکنگ کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے سائل کو اور سائل نے مجھے مبارک باد دی۔ تعجّب ہے کہ فیصلہ ہمارے خلاف آیا جسے دونوں بزرگ ماہرینِ قوانینِ ملازمین پڑھ کر مسکراتے رہے۔ جج صاحب نے لکھا کہ اپیل کنندہ غلطی سے ریگولر کر دیا گیا تھا، احساس ہونے پر وہ حکم واپس لے لیا گیا لہٰذا یہ کوئی کیس نہیں بنتا۔ اِس کی واحد وجہ یہ تھی کہ اس باوقار نشست پر ایک ایسے آدمی کو بٹھا دیا گیا تھا جو کبھی بھی قانون کا طالبِ علم نہ رہا تھا اور Service Matters سے اُسے بالکل آگاہی نہ تھی۔

مذکورہ بالا فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ سپریم کورٹ میں یہ اپیل دیگر لاکھوں مقدمات کی طرح دیر تک ستم کشِ انتظار رہی۔ کِمشن کے فیصلہ سے ایک تو اپیل کنندہ کی دو سال کی

سروس ضائع ہوگئی، دوسرے PMS کے لیے اُسے سالوں انتظار کی زحمت میں مبتلاء کر دیا گیا۔لٰہذا مَیں نے جناب چیف جسٹس آف پاکستان کو خط لکھا کہ نوجوان کو انتظار کی اذیّت سے نکالا جائے۔ چند ایّام کے بعد CJP کی کال موصول ہوئی کہ اپنا مسئلہ بتائیں۔مَیں نے گزارش کی کہ مسئلہ تو خط میں لکھ دِیا گیا ہے کہ ہماری اپیل کی سماعت فرمالیں۔اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی ۔ کچھ دیر کے بعد مَیں نے جناب جسٹس انور ظہیر جمالی صاحب کو ایک دوسرا خط ارسال کیا، جس کے نتیجے میں اپیل ڈبل بینچ میں سماعت کے لیے فِکس کر دی گئی۔میرے دوسرے خط میں کی گئی فریاد سے پتہ چلتا ہے کہ وطنِ عزیز میں انصاف کا حصول کتنا بڑا امتحان ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

Dear Sir,

I am a veteran columnist, internationally known author and Presiential award winner biographer of the Prophet Muhammad (P.B.U.H). I have penned hundreds of articlas in Urdu, English and Punjabi. My Book "Aurat, Maghrib aur Islam" has been translated into English by Arizona University U.S.A (library.arizona.edu) and it is a part of studies of Toronto University, Canada (library.utoronto.ca). My criticism on Wali Khan's "Facts are Facts" and Salman Rushdi's "Satanic Verses" are very popular among the readers. My work on Seerat ul Nabi (S.A.W) is available there in the Library of Congress, U.S.A (catlog.loc.gov).

I am 63 years old pensioner and facing problems due to serious illness. For this very reason I made a request on 08-02-2016 for an early hearing of an appeal, filed by my son Faisal Javed in the Superme Court of Pakistan (copy attached). The said request is still unresponded.

Dear Sir, I very humbly request your lordship to kindly issue an order for early hearing of the said appeal, before the Almighty God calls me back and I leave my only son in the desert of sorrows.

Asghar Ali Javed

سپریم کورٹ کے مذکورہ ڈبل بینچ کے ایک رُکن جسٹس عمر عطاء بندیال بھی تھے جو اِن دِنوں (2023 میں) پاکستان کے چیف جسٹس بھی ہیں اور جن کا نام بھی شاید اسی فہرست میں آئے گا جس کے ٹاپ پر جسٹس منیر کا اور اُس سے تھوڑا نیچے مولوی مشتاق کا نام آتا ہے۔ اِس لیے کہ عدالتِ عظمیٰ کی جتنی توہین وتذلیل اس چیف جسٹس نے برداشت کی ہے شاید کوئی دوسرا نہ کرتا۔ سالوں کی اذیت اور لاکھوں کے اخراجات برداشت کرنے کے بعد اور جناب چیف جسٹس پاکستان کی مداخلت کے بعد سائل کو جو کچھ ملا اُسے پڑھنے کے بعد ایک عام عادمی بھی اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اگر قانون کے بین الاقوامی ماہرین یہ کہتے ہیں کہ کیا پاکستانی جج لاء گریجویٹ نہیں ہوتے ،تو ہمیں برداشت کر لینا چاہیے۔

قانون سے نصف صدی پہ محیط دلچسپی کے نتیجہ میں ،مَیں یہ بات مکمّل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آج ہمارے معاشرے کی تباہ حالی کی اصل وجہ نا انصافی اور نا قابلِ اعتبار عدالتی نظام ہے۔ عدل کے بغیر معاشرہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ حکمِ الٰہی ہے کہ انصاف کرو کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ انصاف کی اہمیت کو زمانہ قبل از اِسلام میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکا تھا جس کا بہترین ثبوت حلف الفضول ہے۔ عدل کے ترازو کو اِتنی مضبوطی سے تھاما جانا چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے پلڑوں تزلزل پیدا نہ کر سکے۔ یعنی محبت وانسیت اور عداوت ودُشمنی ،جیسی بھی ہو جب آپ پر عدل کی ذمہ داری ڈالی جائے تو آپ کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آنی چاہیے۔ خیبر کے یہود سے جب حسبِ معاہدہ آدھی پیداوار لی جاتی تھی تو آپؐ پیداوار کے دو حصّے کر کے یہود کو اختیار دیتے کہ اپنی مرضی کی ڈھیری منتخب کر لو۔ ایک مرتبہ دَورِ فاروقی میں زلزلہ آیا۔ جنابِ عمرِ فاروقؓ کے ہاتھ میں دُرّہ تھا۔ آپؓ نے زمین پر مارا اور کہا کہ اے زمین! ٹھہر جا۔ کیا عُمرؓ نے تیرے اُوپر عدل قائم نہیں کیا؟ بس یہ کہنا تھا کہ زمین ساکت ہو گئی۔ اِس سے معاشرے میں عدل وانصاف کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے نا قابلِ فراموش کیس کا تعلق میرے ایک نواسے سے ہے۔ اُس کے والدین کے درمیان علیحدگی کے بعد والد نے کئی بار ماں سے بچے کو جُدا کرنے کی کوشش کی جن میں گارڈین کورٹ میں دائر کیے گئے دو مقدمات بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں مقدمات عدم پیروی کی بناء پر خارج ہو گئے۔ تیسری بار اُس نے گارڈین کورٹ میں اپنے والدین کو آگے لگایا اور کیس کی 'بھرپور تیاری' کی۔ جب خاتون گارڈین

جج نے بغیر شہادت کے درخواست نمٹانے کا فیصلہ کیا تو فریقِ ثانی کی 'بھرپور تیاری' عیاں ہوگئی۔ شہادت میں فریقِ ثانی کے کردار اور گھر کے ماحول پر کہنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن ہمیں بغیر وجہ بتائے اس حق سے محروم کر دیا گیا۔ اس کے خلاف عدالتِ عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکتا تھا لیکن دوستوں کا خیال تھا کہ کوئی گارڈین جج یہ جُرأت ہی نہیں کر سکتی کہ وہ بچّہ ایک حقیقی ماں سے لے کر سوتیلی ماں، دادی یا کسی دیگر عورت کے حوالے کر دے۔ یاد رہے کہ فریقِ ثانی نکاحِ ثانی کر چکا تھا۔

چونکہ گارڈین جج صاحبہ کے مجموعی رویّے سے ہم خطرہ بھانپ چکے تھے، اِس لیے ہم لوگ بے تابی سے منتظر تھے کہ وہ 'وفاداری' کس طرح نبھاتی ہیں۔ اور پھر وہی ہوا۔ اس فیصلہ میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ دادا دادی بچّے کو اُس کے گھر سے لیں گے اور 24 گھنٹے بعد واپس اُس کے گھر چھوڑیں گے۔ عدالت یہ بھول گئی کہ اِس طرح بچّے کو 24 گھنٹوں میں تقریباً ساڑھے تین سو کلو میٹر سفر طے کرنا پڑتا۔ اس کا ہوم ورک، اُس کی صبح کی سکول کی تیاری اور اُس کی صحت کا کیا بنتا۔ علاوہ ازیں سارا فیصلہ رومی، شیکسپیئر، ملٹن اور فیض کی شاعری کو شرما رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ایسی عدالت بچّے کی بخیریت واپسی کی توقع کر رہی تھی جو 10 سال کی طویل مُدّت میں زرِ ڈگری نہیں دلا سکی اور آج بوقتِ تحریر (دسمبر، 2023) طویل مُدّت سے بچے کو نان نفقہ نہیں دلا سکی۔

محترمہ کے فیصلے کے خلاف مَیں جب اپیل میں گیا تو وہاں مَیں نے محتاط تر رویّہ اپنایا۔ حالات سے پتہ چلا کہ وہ طاقت جو سول جج صاحبہ کے اعصاب پر سوار تھی اُس نے ابھی جان نہیں چھوڑی۔ متعفّن اور بدبودار نظامِ انصاف کی سڑاند سے میرے ہوش اُڑ گئے۔ ایک ایسی عدالت جس کو اللہ نے اِتنا اِختیار دے رکھا ہو کہ اُس کے قلم سے انسان پھانسی کے تختے پر جھول جائے، اِتنی بے بس بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے سمجھ آنے لگ گئی کہ بھٹو کو پھانسی کیسے ہوئی تھی۔

ہم نے عدالتِ اپیل کو بتایا کہ متنازعہ فیصلے کے مطابق اِس بچے کو گھر سے دُور بھیجا جائے گا، اجنبی لوگوں کے حوالے کیا جائے گا، حقیقی ماں سے دُور کر دیا جائے گا اور ایک ایسے گھر میں رکھا جائے گا جہاں اللہ ہے نہ رسول، تو اس کی زندگی اور آخرت دونوں ہی برباد ہو جائیں گے۔ جج صاحب انتہائی معقول انسان تھے، ہم کسی نہ کسی طرح اُن کی مجبوری سمجھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ربِّ ذوالجلال والاِکرام

سے دُعا تو کر ہی رہا تھا، دُنیاوی وسائل بھی کام آئے اور اپیل منظور ہوگئی۔ جج صاحب نے لکھا:

"If the respondents were so keen in meeting with the minor, they ought to make sacrifice instead of compelling the mother to live without his minor son ____ impugned order to the extent of terms of visitation schedule seem to have been passed in hasty and slipshod manner, hence required interference by this court."

اُن دِنوں اہلِ وطن کی وطن کے عدالتی نظام پر تنقید، بل کہ اِس سے نفرت بڑی آسانی سے سمجھ آتی رہی۔ ''آخری موقعہ، آخری موقعہ، آخری موقعہ، پھر آخری موقعہ، پھر 1200 روپے ہرجانہ، پھر 500 روپے ہرجانہ، پھر قطعی آخری موقعہ، قطعی آخری موقعہ اور پھر قطعی آخری موقعہ۔'' ایک حسّاس اِنسان بلبلا کے رہ جاتا ہے۔ آرڈر شیٹ دیکھ کر سر شرم سے جھک جاتا ہے اور الفاظ سے بُو آنے لگ جاتی ہے۔

یہاں ایک کیس یاد آ رہا ہے۔ مَیں اور چوہدری محمد اسلم صاحب سابق ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ایک آئینی درخواست میں لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس صفدر سلیم شاہد صاحب کے روبرو پیش تھے۔ فریقِ ثانی پیش نہ ہوا تو جج صاحب نے کیس انتظار میں رکھ لیا۔ ہم نے عرض کی کہ جناب وہ آج بھی نہیں پیش ہوں گے۔ دو دِن بعد ہماری عدم موجودگی میں آئیں گے، ایک سو روپے کے کاغذ پر جھوٹا بیانِ حلفی دیں گے، حکمِ امتناعی حاصل کریں گے اور پھر دو سال پار۔ جب ہم نے یہ بتایا کہ ایسا ماضی میں ہو چکا ہے تو عدالت نے فرمایا کہ آپ انتظار کریں، اب ایسا نہیں ہوگا۔ اور پھر عدم پیروی پر نہیں بل کہ میرٹ پر فیصلہ ہوا اور ایک گھنٹے بعد فیصلہ سُنا بھی دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جسٹس صفدر سلیم شاہد تنہا یا اس طرح کے چند دوسرے بااصول اور دلیر انسان ہمارے کتنے دُکھوں کا مداوا کر سکیں گے؛ کتنی آنکھوں سے آنسو پونچھیں گے اور کتنے قلوب کو تسکین بخش پائیں گے کہ انصاف ہوگیا۔

آج ہم مولوی تمیز الدین کیس اور بھٹو کیس کے حقائق جاننے کے لیے اپنی سیاسی تاریخ اور عدالتی رویّے کا غیر جانب دارانہ اور مخلصانہ مطالعہ کرتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ بھٹو کیس کو ہی لیجیے، ایک آمر نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے اور ہنری کسنجر کی دھمکی کو عملی شکل دینے کے لیے دُنیا بھر کی نظروں

میں پاکستان کو بے وقار کر دیا۔سری لنکا کے سابق چیف جسٹس ٹی۔ڈبلیو۔راجہ رتنم اپنی معروف کتاب ’عدلیہ کا بُحران‘ میں لکھتے ہیں کہ’’18۔مارچ،1978 کو جب ہائی کورٹ نے بھٹو کو موت کی سزا دی تھی تو اُس وقت سے اُن کی جان بخشی کے لیے کئی اپیلیں کی گئی تھیں جن میں مصر، لیبیا، تیونس، الجیریا، ترکی، ایران ،متحدہ عرب امارات کے علاوہ غیر مُسلم مُما لک رومانیہ، یونان، آسٹریلیا کے سربراہان شامل تھے۔ یہاں تک کہ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کرٹ والڈ ہائم نے بھی جنرل ضیاء سے رابطہ کیا لیکن فیصلہ تو ہو چکا تھا۔اِسلامی سربراہی کانفرنس اور ایٹم بم کٹھ پُتلی حکمران کو برداشت نہ ہوئے اور عدلیہ دُم چھلہ بنی رہی۔ میرا خیال ہے کہ مُسلم دشمن دہشت گردوں کو اِس سے قبل ہی بھٹو کی کتاب "The Myth of Independance" سے اُس کے اِرادوں کا پتہ چل چکا تھا۔کسی آمر کے ہاتھوں کسی دانش ور کی تذلیل کوئی اچنبھے کی بات نہ ہے لیکن بھٹو کے ساتھ جو لاہور ہائی کورٹ میں ہوا اُس پہ تاریخ ضرور انگشت بدنداں رہے گی۔کوئی شخص جتنا بھی سادہ، قانونی پیچیدگیوں سے پرے اور فہم و دانش سے کورا ہو، آپ اُس کے آگے بھٹو کی سپریم کورٹ میں اپیل کا فیصلہ رکھیں، وہ متحیّر اور غم زدہ ہو جائے گا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ سات قابلِ احترام جج جسٹس انوار الحق، جسٹس محمد اکرم، جسٹس کرم اِلٰہی چوہان، جسٹس نسیم حسن شاہ، جسٹس دراب پٹیل، جسٹس غلام صفدر شاہ اور جسٹس محمد حلیم جو اپیل بینچ میں شامل تھے، اُن میں چار اوّل الذّکر جج صاحبان نے بھٹو کی سزائے موت کو بحال رکھا اور تین مؤخر الذّکر جج صاحبان نے مخالفت کی۔ سزائے موت دینے والے چاروں ججز کا تعلق پنجاب سے تھا جب کہ مؤخر الذّکر بِالترتیب بلوچستان، سرحد اور سندھ سے تھے۔اِس بات سے عام آدمی کو مقدمہ کی صحت کا اندازہ کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ مجھے اُس وقت سخت حیرت ہوئی جب میں نے ایک سابق چیف جسٹس کو افتخار احمد کے ساتھ انٹرویو میں یہ کہتے سُنا کہ ہر جج بہادر نہیں ہوتا، نوکری بھی بچانی ہوتی ہے۔

2023 میں جس طرح سپریم کورٹ کے ہاتھوں نظام کی تذلیل ہوئی، اس کے لیے مؤرخ قلم تھامے عمیق نظروں سے نظارہ کر رہا ہے۔

**ڈاکٹر شوکت علی اور ڈاکٹر بنگش:** بچپن سے سُنتے آئے ہیں کہ اللہ تقدیر بھی بدل دیتا ہے لیکن اس کے لیے دُعا کا طاقتور ہتھیار درکار ہوتا ہے۔’’نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں‘‘ لیکن اُستاذی

واصف علی واصف فرمایا کرتے تھے کہ اگر بدل جائے تو تقدیر کیا ہوئی۔ زندگی کے عمیق مشاہدات و تجربات میں وہ ایّام جنھوں نے مجھے آبدیدہ رکھا، اُن میں جگر کے سرطان کے مریض، بڑے بھائی کی بیماری اور وفات کے دن بہت اہم ہیں۔ بھائی ڈاکٹر شوکت علی نے آخری ایّام میں سے کچھ وقت میرے ہاں بھی گزارا، معلوم نہیں کیوں، لیکن یہ اُن کی خواہش تھی۔

مَیں دیکھتا تھا، اُن کی بیٹیاں کس خشوع سے ذِکرِ الٰہی میں مصروف رہتی ہیں۔ پاکستان میں مقیم سعدیہ اور شازیہ، دوبئی سے صوبیہ اور کویت سے سمیرا، سب میرے گھر اکٹھی ہو جاتی تھیں اور اللہ سے اپنے والد کی زندگی کی بھیک مانگتی تھیں۔ یہ دُعائیں طاقتِ پرواز سے بھرپور اُس سمیع و بصیر اللہ کے حضور پیش ہوتیں تو میری دانست میں جواب ملتا کہ ہر شئے اپنے مقدّر میں رہن رکھی جا چکی ہے۔ بھابھی کی صحت ٹھیک تھی۔ وہ عابدہ اور زاہدہ عورت تھی۔ ہمہ وقت تسبیحات اُس کا معمول تھا لیکن وہ بھولی نہیں جانتی تھی کہ تقدیر اور تدبیر کی جنگ میں جیت ہمیشہ تقدیر کی ہوتی ہے۔ اِنسان بھلا خود کو کتنا محفوظ کر سکتا ہے! چراغ کو تُندیٔ بادِ مخالف سے تو بچایا جا سکتا ہے لیکن باتی اور تیل بھی تو ختم ہو سکتے ہیں۔ زندگی اپنا ہی بوجھ برداشت کرنے سے عاجز آ جاتی ہے، کیا کیا جائے۔

برادرِ عزیز کی زندگی بچانے کی جدوجہد کے دوران دو تین بار شیخ زید ہسپتال میں خدمات انجام دینے والے، پاکستان میں موجود دو میں سے ایک ٹرانسپلانٹ سرجن ڈاکٹر بنگش سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ مَیں نے اس ملاقات پر ایک کالم بھی تحریر کیا جو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اُنھوں نے جولائی، 2017 میں پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ ''پڑھے لکھے ہو کر بے وقوف مت بنو، فوراً ڈونر کا بندوبست کرو۔ دیکھو، ایک وقت آئے گا کہ آپ کہو گے کہ ڈونر اور مریض دونوں حاضر ہیں، لیکن مَیں کہوں گا کہ دونوں کو واپس لے جاؤ۔'' یکم اگست کو ذہن سازی کے بعد جب شیخ زید ہسپتال گئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بنگش ملک سے باہر ہیں۔ 10۔ اگست کو مَیں اُنھیں پاکستان کے معروف فرشتہ صفت انکالوجسٹ، ڈاکٹر شہریار کے پاس لے گیا۔ اُنھوں نے چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھے اپنے مریض کو دیکھا تو مریض کو اور ہمارے تیسرے ساتھی عبدالوحید کو باہر جانے کی ہدایت کی اور مجھے نسخہ حاصل کرنے کے لیے کمرے میں رُکنے کی تاکید کی۔ ڈاکٹر شہریار کا بازو یا ہاتھ زخمی تھا لہٰذا نسخہ تحریر کرنے میں مَیں نے اُن کی مدد کی۔ کہنے لگے کہ جو ہونا تھا ہو چکا

ہے۔ چند ایّام باقی ہیں البتہ یہ ادوّیات ان کی زندگی 6 ہفتے بڑھا سکتی ہیں۔ اُنھوں نے استقبالیہ سے خاتون کو بلایا؛ فیس واپس کی اور فرمانے لگے کہ کِس سے کِس چیز کی فیس لوں۔ مَیں آپ کے لیے دُعا گو ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کریں۔

پھر ایک روز مَیں نے ڈاکٹر بنگش سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور اُنھیں ڈاکٹر شہریار سے اپنی ملاقات کی رُوداد سُنائی۔ پُر جوش، مخلص اور ماہر سرجن میرے دُکھ پر افسردہ ہوا اور کہنے لگا کہ مَیں نے تمھیں کہہ دیا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم کہو گے کہ ڈاکٹر صاحب! ڈونر اور مریض دونوں حاضر ہیں اور مَیں کہوں گا کہ 'وہ' بھی تو حاضر ہے۔ اور ڈاکٹر شہریار کے قیاس کے مطابق 12 ستمبر کو ایک خوش مزاج، ہر دلعزیز اور مخلص اِنسان داعیِ اجل کو لبّیک کہہ گیا۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا ، خدا مغفرت کرے

مجھے یاد آ رہا ہے کہ ہمارے والد صاحب نے اپنی ڈائری نما نوٹ بُک پر زندگی کے آخری ایّام میں شاید مایوسی کے عالم میں ایک جگہ لکھا تھا:

اِک فُرصتِ گُناہ مِلی ، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پرور دِگار کے

بھائی کی وفات سے چند روز قبل شفیق خاں نامی اُن کے ایک دوست تیمارداری کے لیے تشریف لائے۔ خاں صاحب نے خیریت دریافت کی تو بھائی نے مُسکراتے ہوئے وہی شعر دُہرا دیا جو مَیں اور بھائی ابّا جی کی ڈائری پر پڑھا کرتے تھے۔ اُن کی اِس ادا نے میرے اعصاب پر ایک کاری ضرب لگائی اور مَیں کتنی ہی دیر سوچتا رہا کہ انسان کتنا بے بس ہے۔ ایّام کی گنتی اس کی مرضی اور خواہش کے برعکس ہوتی ہے تو پرور دِگار کے حوصلوں پر شِکوہ کر کے مطمئن ہو جاتا ہے، یا کچھ مطمئن ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر شوکت علی صاحب کو اُسی شام بعد نمازِ مغرب اُن کی پسندیدہ جگہ، والدہ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ یہ اس قبرستان کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ میری ڈائری کا اگلے روز کا ورق ہے:

’’ آہیں، سِسکیاں، فریادیں اور پُرنم آنکھیں۔ زبانوں پر صرف ایک ہی بات ہے،

اچھا! ڈاکٹر شوکت علی چلا گیا؟ وہ ایک بڑا انسان تھا‘‘

اور 14۔ ستمبر کے صفحہ پر صرف یہ لکھا ہے:

’’وہ باتیں تِری وہ فسانے تِرے‘‘

22۔ ستمبر، جمعہ: ’’اور اب ایام ڈاکٹر شوکت علی کے بغیر گزر رہے ہیں، لیکن اُس کا ذِکر مسلسل موجود ہے۔

اللہ بھلا کرے اُس کا، بھلا آدمی تھا۔ مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک گیا مجھے‘‘

6۔ اکتوبر، جمعہ: ’’پریشان طبیعت، بجھا دِل اور پُرنم آنکھیں۔

بس یہی کچھ ہے آج کل تو۔

ڈاکٹر شوکت علی نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے، اللہ بھلا کرے اُس کا‘‘

مَیں جب کبھی 2018 کی ڈائری کی ورق گردانی کرتا ہوں تو مَیں انگشت بدنداں ہو جاتا ہوں کہ آخر میرے جیسے مضبوط اعصاب کا آدمی اِتنا کمزور کیوں پڑ گیا تھا۔ ایک روز 27۔ اگست، 2018 کی ڈائری پر نظر پڑی۔ لکھا تھا:

’’ڈاکٹر صاحب کو گئے سال ہونے کو ہے ............ وہ واپس آئے نہ مَیں ............ اِتنی بھری دُنیا میں کوئی ایک ہو جسے کہوں کہ ’یار! آج مَیں دُکھی ہوں‘ ............ کوئی نہیں ہے ............ کیا بدقسمتی ہے! ............ کیا کیا جائے؟ ............ دوسری طرف قبروں پر نظر جاتی ہے تو گِنی نہیں جاتیں ............ تھک جاتا ہوں اِدھر اُدھر ............ اُدھر اِدھر کے چکروں میں ............ کیا کروں؟‘‘

12۔ ستمبر، 2018 (پہلی برسی) کی ڈائری ہے:

’’ڈاکٹر صاحب کو رُخصت ہوئے ایک سال بیت گیا۔ پتہ چل گیا کہ سال کیا ہوتا ہے۔ مرکزیت کیا ہوتی ہے، یہ بھی پتہ چل گیا۔ بے سہارگی کیا ہوتی ہے، یہ بھی پتہ چل گیا............ اللہ سے رحم کی دُعا ہے۔‘‘

ڈاکٹر صاحب مرحوم اور فرحت جاوید مجھے ’صاحب جی‘ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ایسا کیوں تھا؟ مجھے معلوم

نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ یہ اُن میں قدرِ مشترک تھی۔ اب کبھی کہیں سے یہ لفظ سماعت سے ٹکراتا ہے تو دماغ پھٹنے لگتا ہے اور چہرے کی رنگت ایک بار پھر زرد ہو جاتی ہے۔

2017 ڈاکٹر شوکت علی کے علاوہ عزیز بہن رُخسانہ نور اور ہم سب کی آپا، آپا بانو قُدسیہ کو بھی چھین کر لے گیا، خدا اِن سب لوگوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

# مسیحا میرے عہد کے

افراد، اقوام اور اِدارے اکثر و پیشتر اپنی تحقیر و تذلیل کا سامان خود ہی کرتے ہیں اور پھر اگر عزت و توقیر کی منازل طے کرتے ہیں تو یہ بھی اُن کے اپنے کردار کی ہی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اگر پولیس اور ڈاکٹرز کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تو یہ بِلا سبب نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس گھر میں مقتول کی نعش پڑی ہوتی ہے اُسی گھر میں تھانیدار چرغے اُڑا رہا ہوتا ہے۔ پھر وہ جس چابک دستی سے حقائق کو توڑتا مروڑتا ہے، اُسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آدم کی اولاد ذِلّت اور کمینگی کی کِس اتھاہ گہرائی میں جا گری ہے، لیکن سوسائٹی کی کم نصیبی کہ بقول ناصر:

جو گراں تھے سینۂ خاک پر، وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر

وہ دوسرا اِدارہ جس نے چھاج بھر بھر کے عوام کی نفرت مول لی ہے وہ عہدِ حاضر کی مسیحائی ہے۔ اِبنِ مریم کے اکثر 'جانشین' اپنی گراوٹ میں پولیس سے دو ہاتھ آگے نظر آتے ہیں۔ تعلیم مکمّل کرتے ہی یہ نہایت مہارت اور فنکارانہ انداز سے اُن لوگوں کی جیبیں کاٹنے کی تدبیریں شروع کر دیتے ہیں جو پہلے ہی قدرت کی ستم ظریفی کا شکار ہوتے ہیں۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فہم و شعور اپنی بے بسی پر نوحہ کناں ہوتے ہیں کہ آخر یہ کیا تعلیم تھی۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

یہ غیر ضروری ہی سہی، پھر بھی لکھ رہا ہوں کہ کِسی بھی طبقے میں تمام افراد برابر نہیں ہوتے۔ سو جب کِسی اِدارے کی اچھائی یا بُرائی بیان کی جاتی ہے تو majority کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے یا پھر بیان کرنے والا

اپنے تجربات ومشاہدات کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔

میرے عہد کا مسیحا کتنا غیر ذمہ دار اور لالچی ہے اور کچھ لوگ مسیحائی کو خاک آلود ہونے سے بچانے کے لیے کتنی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں، یہ بتائے بغیر یہ خودنوشت ادھوری رہے گی۔ یہاں جو مَیں پہلی مثال دے رہا ہوں اس کا تعلق غیر ذِمّہ دارانہ رویّے سے ہے۔

واپڈا میں ڈسٹری بیوشن کمپنیاں یعنی لیسکو ،فیسکو وغیرہ بننے سے پہلے یہ اِدارہ ایریا الیکٹرسٹی بورڈ کہلاتا تھا۔اُن دِنوں مَیں ایریا الیکٹرسٹی بورڈ لاہور کی سٹاف یونین کا چیئرمین تھا کہ میرے پاس شاہدرہ ڈویژن کا سلیم نامی ڈرافٹس مین آیا۔

''دیکھیئے چیئرمین صاحب! ہمارے واپڈا کے ڈاکٹرز کا حال'' یہ کہتے ہوئے اُس نے بے ترتیب سے کاغذات کا ایک پلندہ میری میز پر پھینک دیا۔مَیں نے ٹریڈ یونینسٹ کا روایتی انداز اپنایا،اُسے بیٹھنے کا کہا اور تحمّل سے اُس کی بات سُنی تو پتہ چلا کہ اُس کی بیوی گائنی کے کسی مسئلے کا شکار تھی۔اُس نے محلّے کی کِسی لیبارٹری سے پریگننسی ٹیسٹ کرایا اور لَیب نے غلط طور پر رپورٹ negative کی دے دی۔ اس کا مطلب تھا کہ عورت کسی مسئلہ کا شکار ہے۔سلیم کے لیےنوجوان بیوی کا یہ مسئلہ اُتنا ہی اذیت ناک تھا جتنا کِسی بھی محبت کرنے والے دوسرے خاوند کے لیے۔وہ تفصیلی معائنے کے لیے اگلے روز اُسے واپڈا سنٹرل ہسپتال لاہور لے گیا۔خاتون میڈیکل آفیسر نے مسز سلیم کا معائنہ کیا اور پریگننسی کو negative قرار دیتے ہوئے سپیشلسٹ کی رائے کے لیے گائناکالوجسٹ کی طرف ریفر کر دیا......گائناکالوجسٹ نے خود بھی معائنہ کیا اور لیبارٹری سے ٹیسٹ بھی کرایا۔اگلے روز رپورٹ وہاں بھی نیگِٹو ہی مِلی ۔اِس رپورٹ کے بعد گائناکالوجسٹ کو اُس کی تشخیص کے مطابق جو مرض ملا وہ تھا Amenorrhea ۔مَیں اِس لفظ سے واقف نہیں تھا۔جب ڈکشنری دیکھی تو معنی مِلا ''بندشِ حیض''۔

گائناکالوجسٹ نے اِس نام نہاد مرض کے خاتمے کے لیے ادویات بھی تجویز کر دی تھیں۔ایک ڈاکٹر کی رائے کے مطابق وہ ادویات اگر استعمال کر لی جاتیں تو خاتون اور اُس کے پیٹ میں پرورش پانے والے بچے، دونوں کی موت واقع ہو سکتی تھی۔لیکن ہُوا یہ کہ سلیم کی والدہ نے اتفاق سے پوچھ لیا کہ وہ بیوی کو روزانہ موٹر سائیکل پر بٹھا کر کہاں لے جاتا ہے؟

''کہیں نہیں ماں جی، کہاں جانا ہوتا ہے؟ بس یونہی گھومتے پھرتے ہیں۔''سلیم نے جواب دیا۔

''نہیں پُتر !اس حال وچ موٹر سائیکل تے پھرنا ٹھیک نہیں''

''کِس حال میں ماں جی؟''

''پُتّر ! ہُن تُوں ابّا بنن والا ایں'' (ماں جی نے جواب دیا)

مَیں نے یہ کیس سنٹرل یونین کی طرف ریفر کرتے ہوئے اُن سے معاملات کی درستی کا کہا لیکن وہاں وہی ہوا جس کی اُمید تھی۔مَیں اُن دِنوں روزنامہ 'مشرق' میں لکھا کرتا تھا۔نتیجتاً یہ مسئلہ ''یہ قتل کِس کی گردن پر ہوتا'' کے عُنوان سے 'مشرق' میں شائع ہوگیا۔اور پھر ایک رسمی انکوائری کے بعد معاملہ ٹھپ ہوگیا۔

2006 کی بات ہے میری ایک بھانجی شمائلہ بیمار پڑ گئی۔طویل عرصہ تک تشخیص کے بعد لاہور کی ایک معروف ماہرِ سرطان ڈاکٹر نے اُسے کینسر کی مریضہ قرار دیا اور کیموتھراپی کے لیے فوری طور پر اُسے 9 لاکھ روپے جمع کرانے کا کہا۔کینسر کے خلاف کام کرنے والے ایک معروف ہسپتال کی بھی یہی رائے تھی لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ صُبح مطلوبہ رقم ڈاکٹر موصوفہ کے پاس جمع کرادی جائے۔لیکن ایک روز کی تاخیر اِس لیے ہوگئی کہ مریضہ کا بھائی (میرا بھانجا) اُسے علاج کے لیے بیرونِ ملک بھیجنے پر بضد تھا۔اُسی روز کہیں سے مشورہ ملا کہ میو ہسپتال میں قائم اس شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر شہر یار صاحب سے بھی رائے حاصل کر لی جائے۔لہٰذا اگلے روز مَیں، بڑے بھائی اور شمائلہ کے چچا یونس ڈاکٹر صاحب سے ملے۔ڈاکٹر موصوف نے مریضہ کے معائنے اور رپورٹس دیکھنے کے بعد یہ کہا کہ یہ ایک معمولی سا مرض ہے جسے طب کی دُنیا میں ککوشی کہا جاتا ہے؛ کسی دوائی کی ضرورت نہیں ہے، چند ہفتوں بعد اِن شاءاللہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔اور وہی ہُوا جو ڈاکٹر شہر یار نے کہا تھا۔یوں ایک ڈاکٹر کے update knowledge اور خلوص کی وجہ سے ایک انسانی زندگی سالوں کی غیر ضروری اذیت اور اہلِ خانہ لاکھوں روپے کے ضیاع سے بچ گئے ............ بس اللہ کا کرم۔

جن دِنوں پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ کے مزے لوٹنے والے یوسف رضا گیلانی عنانِ اقتدار سنبھال رہے تھے،ایک پرائیویٹ تعلیمی اِدارے کی نوجوان سربراہ مِس فائزہ کی طبیعت بگڑنے لگی۔مقامی ڈاکٹروں نے رائے دی کہ اس کے گُردوں میں کوئی پرابلم ہے لہٰذا اُسے شیخ زید ہسپتال لاہور میں داخل ہو

جانا چاہیے۔ یوں فائزہ اپنے 'قاتل' کی تلاش میں شیخ زید ہسپتال لاہور میں داخل ہوگئی۔ 'حسبِ ضابطہ' اُس کا علاج کیا گیا۔ جب ڈاکٹرز کو مطلوبہ نتائج نہ ملے تو اُنھوں نے فائل پر CRF (ایک طبی اصطلاح جس کا مطلب ہے گُردوں کا فیل ہوجانا) لکھتے ہوئے اُسے گردے کی ٹرانسپلانٹیشن اور Doner کے بندوبست کی ہدایت کی۔ فائزہ کا ایک بھائی جنوبی افریقہ میں مقیم تھا۔ آخر بہن کا رِشتہ تھا وہ بہن کی محبت میں اُسے گُردہ donate کرنے پاکستان پہنچ گیا۔ اور ہاں، یہ رشتے بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے غموں میں اور ہماری خوشیوں میں ہمیں تنہا نہیں رہنے دیتے۔ یہ کبھی ڈھول کی آواز پر ہمارے ساتھ ناچتے ہیں اور کبھی 'کلمۂ شہادت' کی آوازیں لگاتے ہوئے اپنے ہی ایک رِشتے کو منوں مٹی تلے دبا آتے ہیں۔

فائزہ کی والدہ نے مجھے بتایا کہ ایک روز ہسپتال کے ایک شخص نے (نام نہ بتانے کا وعدہ ہے) راز داری سے اُس کے ساتھ بات چیت شروع کی اور اُنھیں قائل کرلیا کہ وہ بیٹی کو وہاں سے لے جائے۔ لہٰذا وہ شیخ زید ہسپتال سے فارغ ہوکر سیدھے چوبرجی لاہور میں ایک ہومیو ڈاکٹر کے پاس گئیں اور فائزہ کا علاج شروع کردیا گیا۔ اب ہومیو پیتھک دوائی چھوڑے بھی اُسے کئی سال بیت گئے ہیں۔ وہ شادی شدہ ہے اور امریکہ میں اپنے خاوند کے ساتھ صحت مند زندگی گزار رہی ہے۔ الحمدللہ وہ اپنے ہی گُردوں کے ساتھ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اچھی صحت کے ساتھ زندہ ہے۔

**اور یوں بھی ہوا:** اِس سے کچھ ہی دیر پیشتر مَیں اپنی ایک بیٹی کو گلے کی تکلیف کی وجہ سے ایک ENT سپیشلسٹ کے پاس لے کر گیا۔ وہ کرنل ڈاکٹر فوج سے سابق ہیں اور پاکستان کے ایک فوجی آمر پرویز مشرف کے بھی معالج رہے ہیں۔ اُنھوں نے ایک دوا تجویز کی جو پورے شہر میں دستیاب نہ ہوسکی۔ مَیں نے میڈیسن سے متعلقہ ایک عزیز سے بات کی تو اُنھوں نے کہا کہ جناب ''یہ ڈیل کی آئٹم ہے۔ ڈاکٹر کے کسی قریبی دُکاندار سے پوچھیں۔'' اور اُس کی بات درست ثابت ہوئی اور ڈاکٹر کے ساتھ والے سٹور سے دوائی مل گئی۔ ازاں بعد مجھے خیال آیا کہ مَیں پوچھ لوں کہ یہ ''ڈیل کی آئٹم'' کیا ہوتی ہے؟ جواب ملا، اِس میں 50% ڈاکٹر کا ہوتا ہے۔

2008 کی ایک دوپہر مَیں لاہور سے شیخوپورہ جارہا تھا کہ اچانک مجھے سینے میں جلن سی محسوس ہوئی۔ مَیں ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ پیاس کی شِدّت نے مُجھے بے حال کردیا۔ اِس بیماری کا ذکر

گزشتہ صفحات میں موجود ہے ۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اس کی تشخیص کے دوران لاہور کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں جو میرے ساتھ ہوئی اُس پر پاکستان کا ایک مِڈل کلاس شہری اعلیٰ درجہ کی قوتِ برداشت کے ساتھ ہی زندہ رہ سکتا ہے۔

میری بیوی نے اپنے مرض الموت میں کچھ وقت ڈی۔ایچ۔کیو ہسپتال شیخوپورہ میں بھی گزارا۔ چونکہ MVR کا کیس تھا اور اب مریضہ کے معدہ میں خون جمع ہو رہا تھا لہٰذا اُنھیں دل کے وارڈ میں داخل کر لیا گیا۔ جب امراضِ قلب کے نوجوان کنسلٹنٹ کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی تو فزیشن سے رابطہ کیا گیا۔ فزیشن ایک باریش، ہمدرد اور نیک نیّت نوجوان تھے لیکن وہ بھی تشخیص میں ناکام رہے۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ امراضِ معدہ کے ماہر ڈاکٹر (Gastroenterologist) کی رائے لی جائے۔ یہی وہ کردار تھا جس کی نااہلیت اور عدم دلچسپی ایک گھرانے کی تباہی کا باعث بنی۔ اُس نے رائے دی کہ چونکہ والو کی تبدیلی کے مریض خون پتلا کرنے والی ادویات کے زیرِ اثر ہوتے ہیں، اِس لیے بعض اوقات یہ صورتِ حال بن جاتی ہے۔ اِتنی سطحی سی بات تو محلّے کا کوئی نان بائی بھی کر سکتا تھا لہٰذا ڈاکٹر کو بتایا گیا کہ MVR 32 سال پہلے ہوا تھا اور یہ کیفیت آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی لیکن اُس نے اِسے ایک معمولی اتفاقیہ مسئلہ قرار دیا اور کہا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب مریضہ بہتر ہو جائے گی۔ یوں ہمیں ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر موصوف ایک سے زیادہ ہسپتالوں میں پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہے اور 'اپنے' مریضوں کے لیے شبانہ روز محنت کرتا ہے لیکن سرکاری ہسپتال میں اُس نے مریضہ کی کیفیت کو سمجھنے میں سچی دلچسپی نہ لی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ایک سنجیدہ کیس ہے اور اِس میں دلچسپی نہیں، سچی دلچسپی کی ضرورت ہے، ڈیل کارنیگی کی تعریف کے مطابق 'سچی دلچسپی'۔

DHQ ہسپتال شیخوپورہ سے ڈسچارج ہونے اور ڈاکٹرز ہسپتال لاہور میں داخل ہونے کے درمیانی وقت میں، جس کے ضائع ہونے کا ذمہ دار نا تجربہ کار ڈاکٹر تھا، مریضہ اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹرز ہسپتال میں گزرنے والے 6 ایّام اُس فصل کو کاٹنے میں گزرے جو Gastroenterologist نے بوئی تھی۔

دُکھ و اَلَم کے اُن کبھی نہ بھول سکنے والے لمحات میں مجھے برادرِ عزیز چوہدری محمد عبداللہ ایڈووکیٹ کی بیگم، بھابھی زاہدہ، بہت یاد آئیں۔ چوہدری صاحب ڈینٹسٹ کے آگے روتے رہے کہ

جناب اگر دانت کے اِس بگاڑ میں آپ کو ذرا بھی کسی خطرے کی بُو آتی ہے تو ہمیں بروقت بتا دیجئے گا لیکن ڈینٹسٹ نے اسے ایک بالکل سادہ کیس قرار دیا۔ چوہدری صاحب جب اپنی مرضی سے بیگم کو لاہور کے ایک ماہر ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تو ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اُس کے کینسر ہونے میں رتی بھر شُبہ نہیں ہے۔ اور پھر چند ہفتوں میں تین معصوم بچّوں کی ماں، اور لاتعداد خوبیوں والی وفا شعار بیوی مُلکِ عدم کو سِدھار گئی۔

میری بیوی کی زندگی کے آخری 6 ایّام جو اُس نے لاہور کے ایک بڑے ہسپتال میں گزارے، میری زندگی کے انتہائی اذیت ناک ایّام تھے۔ اُس مہنگے ہسپتال میں آپ کی نظروں سے اوجھل آپ کے مریض کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے، بس اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن مریض کے لواحقین کے لیے وہاں کوئی سہولت نہیں ہے۔ وہ مریض کو ہی نہیں، مریض کے لواحقین کو بھی اللہ یاد کرا دیتے ہیں۔ مجھے وہاں کے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ وہاں کی شرح اموات 80 فیصد ہے۔ دوسرے الفاظ میں اُن کی 80 فیصد وصولیاں ایسے لوگوں سے ہیں جو وہاں سے اپنے پیاروں کی میّت لے کر جاتے ہیں۔

مَیں 23 نومبر، 2023 کو جب یہ سطور قلم بند کر رہا تھا اُس روز میں صرف دو کالمز کا مطالعہ کر سکا، ایک جناب سعود عثمانی کا 'ایک بہادر یورپی ملک' اور دوسرا جناب محمد اظہار الحق کا 'بلدیاتی ادارے، اِسلام آباد اور میئر'۔ مؤخر الذکر سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''دو تین ہفتے پہلے جب خبر چلی کہ اسلام آباد کے دو سرکاری ہسپتالوں کے سربراہ فوج سے لیے جائیں گے تو مجھے یہ خبر بالکل نہ بھائی۔ سِول محکمے، سول افراد ہی کے چارج میں رہنے چاہئیں۔ یہ ایشو کچھ صحافی دوستوں اور کچھ دیگر اصحاب سے شیئر کیا۔ اُن میں سے کچھ دوست ثقہ ہیں اور سچ بولنے کے لیے مشہور۔

امید یہ تھی کہ میرے نقطۂ نظر کی تائید ہوگی اور وہ اِس فیصلے کی مخالفت کریں گے، مگر تعجّب ہوا کہ زیادہ تر کی رائے اس فیصلے کے حق میں تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ جس طرح ان دونوں شفا خانوں میں مریض رُل رہے ہیں، انتظار گاہوں میں بیٹھ بیٹھ گل سڑ رہے ہیں اور بدنظمی نے ان ہسپتالوں کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اس کے پیشِ نظر فوجی افسر ہی آ کر کچھ کریں تو کریں۔ اِس پر اپنا ذاتی تجربہ یاد آ گیا۔

چند سال پہلے ایک نیفرالوجسٹ سے ملنا تھا جو بظاہر اسلام آباد کے بڑے سرکاری ہسپتال سے وابستہ تھا۔ کئی دن جاتا رہا۔ مالیات کا سربراہ پروٹوکول بھی دیتا اور چائے بھی پلاتا مگر ڈاکٹر دستیاب نہ ہوا۔ پانچویں دن

شام کو اُس کے نجی مطب میں گیا، نذرانہ پیش کیا تب ''حضرت'' کی زیارت ہوئی۔''

میرے تجربات و مشاہدات یا جناب محمد اظہار الحق کا تجربہ صورتِ احوال کو پوری طرح منعکس نہیں کرتا۔ حقیقت اس سے کہیں زیادہ تلخ ہے۔ بڑے ڈاکٹرز نے پالیسی یہ رکھی ہے کہ جب کوئی وزیر مشیر کال کریں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اُن کے آستانوں پہ حاضری دے دیں اور اگر وہ ہسپتال تشریف لائیں تو سُرخ قالین سے اُن کا استقبال کریں اور ہسپتال کے مریضوں کو بذریعہ پیام بر ذاتی کلینک پر بقول اظہارالحق صاحب 'زیارت' کی تاکید کریں۔ یہ پالیسی انھیں لائسنس دے دیتی ہے کہ وہ عوام الناس کی چمڑی اُتار دیں۔ اِسلام آباد کے سرکاری ہسپتال کے نیفرالوجسٹ سے مشاورت کرنے کے لیے جناب اظہار الحق کِسی بہروپ کے ساتھ نہ گئے تھے بل کہ اظہار الحق ہی بن کر گئے تھے۔ اگر ڈاکٹر نے اُنھیں شرفِ ملاقات نہیں بخشا تو عام آدمی تو اِس خواہشِ ناجائز پر ہی گردن زدنی ٹھہرے گا کہ وہ کِسی سرکاری ہسپتال میں کِسی سپیشلسٹ ڈاکٹر کو مِل لے۔

نجی ہسپتالوں کے لیے، پوش علاقوں میں، بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر کے لیے جاری دوڑ کِسی نظر میں لائقِ تحسین بھی ہوسکتی ہے بشرطیکہ مسیحائی کے اِس مقدّس شُعبے کو اِس حد تک نہ گرادیا جائے کہ لوگ اپنے مسیحا سے ہی نفرت کرنے لگیں۔ لاہور جس میں ان ڈالر ساز کارخانوں کی تعداد سینکڑوں میں ہوگئی ہے، اسی شہر میں ڈاکٹر طارق بنگش اور کینسر کے ماہر ڈاکٹر شہر یار بھی خدمتِ انسانیت میں مصروف ہیں۔ ان عظیم لوگوں کا نام جونہی سماعت سے ٹکراتا ہے، ہمارے سر ادب واحترام کے جذبے کے وفور سے جُھک جاتے ہیں۔ اِس کی ایک جھلک میرے 30۔ستمبر، 2016 کے ایک کالم میں نظر آتی ہے۔ کالم کا کچھ حصّہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

# پنجاب میں جگر کی پیوند کاری

''صوبائی دارالحکومت لاہور میں واقع شیخ زید ہسپتال میں پنجاب حکومت کی جانب سے جگر کی پیوند کاری کا بھی آغاز کیا جاچکا ہے، جونہایت کامیابی سے جاری ہے۔ گزشتہ روز شیخ زید ہسپتال لاہور کے لیور ٹرانسپلانٹیشن یونٹ میں پاکستان کے ایک تاریخ ساز مسیحا ڈاکٹر طارق بنگش سے ملاقات ہوئی تو احساس

ہوا کہ ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔'' ڈاکٹر بنگش کا تعلق خیبر پختون خوا سے ہے، لیکن وہ پنجاب میں بیٹھ کر مذکورہ ہسپتال کے اس نہایت ہی اہم شعبے کے سربراہ کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

شیخ زید ہسپتال کے لیور ٹرانسپلانٹیشن یونٹ نے اپنی عملی زندگی کی شروعات اگست 2011 میں کی، جب سیّد عامر رضا نامی ایک مریض جگر کے ناکارہ پن کی وجہ سے کاتبِ تقدیر کے آگے دست بدُعا تھا۔ اُنہی دِنوں لاہور کا میٹرک کا ایک طالبِ علم 16 سالہ ارسلان شدید زخمی حالت میں شیخ زید ہسپتال میں داخل ہوا۔ ارسلان نے اپنے والدین کو وصیت کی کہ اگر وہ مرجائے تو اُس کا جگر donate کر دیا جائے۔ پھر وہی ہوا کہ ارسلان تو داعیِ اجل کو لبیک کہہ گیا لیکن سید عامر رضا کو ایک نئی زندگی عطا کر گیا۔ کم و بیش 12 گھنٹے کی اعصاب شکن لیکن انہماک سے بھرپور جدوجہد کے بعد ڈاکٹر طارق علی بنگش کی ٹیم نے ارسلان کے جگر کی عامر رضا کو پیوند کاری کر کے پاکستان میں ایک تاریخ رقم کر دی۔ ڈاکٹر عامر لطیف، ڈاکٹر عمر علی اور ڈاکٹر خاور شہزاد نے ڈاکٹر بنگش کی ٹیم میں شمولیت کر کے اپنے ناموں کو احترام اور مہارت کی علامت کے طور پر محفوظ کر لیا۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بنگش نے 1996 میں ایم بی بی ایس کیا اور پھر مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے لیڈز میں جگر کی پیوند کاری کے 9 مختلف مراکز میں کام کر کے اپنے شعبے میں مہارت حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان تشریف لائے تو ہمیشہ بھارت کی طرف اُٹھنے والی آنکھوں نے اُنھیں اپنا مسیحا و ملجا سمجھنا شروع کر دیا اور ڈاکٹر بنگش نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اُن کی امیدوں پر پورا اُترنے کی کوشش کی۔

24 فروری 2012 کو جگر کی پیوند کاری کے میدان میں ایک اور بڑا قدم اُٹھا، جب کسی غیر ملکی ڈاکٹر کی مدد اور رہنمائی کے بغیر ڈاکٹر بنگش نے کامیاب پیوند کاری کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ہم کسی سے کم نہیں۔ 2015 کے اوائل تک جب شیخ زید ہسپتال کے جگر کی پیوند کاری کے شعبے میں ڈاکٹر بنگش 47 کامیاب پیوند کاریاں کر چکے تھے تو 48 ویں سرجری میں پہلی بار ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ نتائج کی اِس شرح کو دیکھا جائے تو یہ حیران کُن منظر نامہ پیش کرتی اور اہلِ وطن سے سجدۂ شکر بجالانے کا تقاضا کرتی ہے۔

گزشتہ روز کی ملاقات میں ڈاکٹر بنگش نے بتایا کہ وہ اِس یونٹ میں 88 پیوند کاریاں کر چکے

ہیں۔ان مریضوں میں الحمدللہ 79 بقیدِ حیات ہیں۔اُنھوں نے زور دے کر کہا کہ لوگوں کو 90 فی صد کامیابی کومرکزِ نگاہ بنانا ہوگا اوراللہ کی ذات پر بھروسا کرنا ہوگا۔راقم نے جب اُن سے یہ سوال کیا کہ عطیہ کرنے والے لوگوں میں شرح اموات کیا رہی تو اُن کا جواب سُن کر اُن کے ہاتھ چومنے کو جی چاہا۔ فرمانے لگے کہ ریکارڈ کی بات ہے کہ اِس ہسپتال میں جگر کا ایک Doner بھی موت کے مُنہ میں نہیں گیا اورہم اِس بات پر ربِّ ذوالجلال کے بے حد شکر گزار ہیں۔‘‘

ڈاکٹر شہر یار سے میری چند ایک ملاقاتیں ہیں۔کوئی شخص فہم و اِدراک سے بالکل ہی عاری نہ ہو ورنہ اُنھیں مل کر بہت پہلے ہی انسان اِس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ اس شخص سے کوئی بڑا کام لینے والا ہے۔ میری اُن سے پہلی ملاقات اکتوبر، 2006 میں میو ہسپتال لاہور میں ہوئی تھی۔ پیچھے ذکر ہوا ہے کہ میں اپنی بھانجی شمائلہ کو لے کر اُن کے پاس حاضر ہوا تھا۔لیکن مَیں دیانت داری سے یہ سمجھ رہا ہوں کہ اس فرشتہ سیرت انسان کی عظمت کے اعتراف کے لیے گزشتہ صفحات پر کیا گیا سرسری ذکر انتہائی ناکافی ہے۔

تڑپتی انسانیت کے دُکھوں کا مداوا، اِبنِ مریم کا نائب اور مسیحائی کے بلند ترین مرتبہ پر فائز یہ ڈاکٹر گزشتہ چار عشروں سے کینسر کے مریضوں کی شفایابی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اور اب تک ایک لاکھ سے زائد مریضوں کا علاج معالجہ کر چکا ہے۔ دُنیاوی انعام و اِکرام سے بے نیاز، اللہ سے بدل کی اُمید رکھے، شبانہ روز جدوجہد اُس کی زندگی کا خاصہ ہے۔

کینسر کیئر ہسپتال لاہور سے کچھ پَرے، رائے ونڈ روڈ پر رائے ونڈ کے قریب تڑپتی سسکتی انسانیت کے دُکھوں کے مداوا کے لیے شبانہ روز مصروف ہے۔ڈاکٹر شہر یار کے رفقائے کار کا ذکر نہ کرنا بھی ناانصافی ہوگی۔سوعرض ہے کہ یہ ہسپتال اور ریسرچ سنٹر ایک بورڈ آف گورنرز کے تابع ہے۔اس بورڈ کے چیئر پرسن ڈاکٹر شہر یار ہیں اور ممبرز میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالمجید چوہدری، جناب عبدالرّؤف قصوری، پروفیسر ڈاکٹر ریاض الرحمٰن، پروفیسر ڈاکٹر محمد فیاض، جناب ندیم احمد صدیقی، جناب شاہد ملک، محترمہ اریشہ زمان ، محترمہ فرحت پروین، پروفیسر ڈاکٹر نبیلہ شامی اور محترمہ غزالہ طارق شامل ہیں۔

یہ بات ہم لکھنے والوں کے لیے نہایت ہی باعثِ اطمینان ہے کہ ہماری ایک مخلص اور نیک سیرت افسانہ نگار ساتھی محترمہ فرحت پروین بھی اِس عظیم الشّان قابلِ تعریف ٹیم کا حصّہ ہیں جو ڈاکٹر شہر یار

کی معاونت کر رہی ہے۔فرحت پروین کے خوب صورت افسانے مَیں نے پہلی بار ُریستوران کی کھڑکی سے' میں پڑھے تھے۔ وہ میرے افسانوی مجموعہ 'بے منزل مسافتیں' کی تقریبِ پذیرائی میں شرکت کے لیے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ تشریف لائیں اور میرے افسانوں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ زیرِ مطالعہ تحقیقی اِدارہ میں جاں فشاں اور عرق ریز باقی ماندہ ارکان بھی ڈاکٹر شہر یار اور فرحت پروین کی طرح خدا شناس اور انسان پرست ہی ہوں گے۔ڈاکٹر شہر یار کے کینسر کیئر ہسپتال کو کون، کیسے چلا رہا ہے، اِس کی ایک جھلک دیکھیے:

لیسکو کی طرف سے 25 لاکھ کا بل آ گیا۔آخری تاریخ آ گئی۔ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ وہ پریشان تھے کیونکہ اِتنے فنڈز موجود نہ تھے۔ اِتنے میں ایک سادہ سا، درویش سا اِنسان ہسپتال کے دروازے پر آ کر بیٹھ گیا۔اُس سے خیریت دریافت کی اور مسئلہ پوچھا۔ جواب ملا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، بس کچھ فنڈز دینے ہیں۔ پوچھا گیا کہ حضرت! کتنی رقم عطیہ کرنی ہے؟ جواب ملا ''پچیس لاکھ۔'' میں اپنے قارئین سے عرض کروں گا کہ اگر کسی نے معجزہ دیکھنا ہو تو اِس ہسپتال میں چلے جائیں اور اگر فرشتہ دیکھنا ہو تو ڈاکٹر شہر یار کی زیارت کر لیں۔ وہاں ستّر ستّر کروڑ روپے کی ایک ایک مشین ہے لیکن اِس ہسپتال میں کوئی کیش کاؤنٹر نہیں ہے، جہاں مریض پیسے جمع کرائے۔

**اکلاپا:** انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے اور ہم ہیں لیکن دیکھا جائے تو بس ہم ہیں اور قادرِ مطلق ہے۔جُوں جُوں کائنات کی وُسعتیں بڑھ رہی ہیں، دل تنگ ہوتے جا رہے ہیں اور انسانوں کے مابین فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ کہنے کو تو صدائے کُن فیکون بھی دم بدم آ رہی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ہر چیز سمٹ رہی ہے۔ ہر چیز ہائپوکریسی کی نذر ہو رہی ہے۔اِس پالیسی نے انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑا اور اس نے خود کو تنہا کر لیا ہے۔اُستاذی واصف علی واصفؒ نے شاید اِسی طرح کی صورتِ احوال پہ کہا تھا:

کِس طرح کا میلا ہے؟
ہے بھیڑ بڑی لیکن
ہر شخص اکیلا ہے

لیکن مشکل وقت میں ہی آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ اکیلے ہیں۔ یہ اکلاپے کا دُکھ انسان کا سانجھا دُکھ ہے۔ ہم سب اکیلے ہیں........... عجیب بات ہے نا؟........... 'ہم' تو تنہا کی نفی ہے۔ لیکن پھر بھی ہر شخص تنہا ہے۔

زندگی کی کٹھن راہوں پہ چلتے چلتے مَیں کئی بار کرب ناک تنہائی کا شکار ہوا ہوں۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مَیں اکیلا ہوں۔ کوئی سُنانے والا ہے نہ سُننے والا۔ کبھی کبھی مَیں نے اِس تنہائی کو انجوائے کیا ہے لیکن اکثر اس سے دُکھی ہوا ہوں اور ایسے میں اُس سمیع و بصیر کو پکارتا ہوں جو ہر لمحہ سُنتا ہے اور ہر گھڑی دیکھتا ہے، جسے نیند آتی ہے نہ اُونگھ، بس کہیں بھی، کسی بھی وقت اُسے پکاریں، اُسے موجود پائیں گے۔

مجھے ایک متکبّر اور بد دماغ افسر نے ایک بار بر کی ٹرانسفر کر دیا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں روزانہ شیخوپورہ سے آتا ہوں اور لاہور میں میرے پاس کوئی رہائش نہیں ہے۔ ایک سیاسی جماعت کے ان پڑھ غُنڈوں نے مجھ پہ لاٹھیاں برسائیں۔ ٹریڈ یونین میں میرے شکست خوردہ مخالفین نے ایک بار مجھے انتہائی خوفناک اِرادے سے اکیلے میں گھیر لیا۔ ایک طوفانی رات میں مجھے اپنے ننھے بیٹے کی ڈیڈ باڈی فوراً اُٹھانے پر مجبور کیا گیا، اور اِس طرح کے بہت سے دیگر لمحات بھی ہیں جب مَیں نے خود کو بے بس اور تنہا محسوس کیا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسا تو ہر کسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہاں! ہوتا ہے، مَیں بھی یہی کہتا ہوں۔ لیکن اگر کبھی انسانوں کے ہجوم میں انسان خود کو اکیلا محسوس کرے تو پھر کیسا لگتا ہے؟ لیکن نہیں، ایسا بھی ہوتا ہے۔ ٹرین میں آپ کے ساتھ سفر کرنے والے سینکڑوں لوگ ہی سہی، لیکن اُنھیں آپ سے کیا دلچسپی ہے؟ ہمیں بھی تو اُن سے نہیں ہے نا۔ ہم اگلے اسٹیشن پر اُترتے ہوئے کسی کو فی امان اللہ کہیں گے اور نہ کسی کو دیکھ کر ہاتھ لہرائیں گے۔ ایسا ہی ہے نا؟ پھر شِکوَہ کیسا؟ ہوتا ہے ایسا۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے اِرد گرد بہت سے ایسے لوگ موجود ہوں جو بظاہر آپ سے محبت کرتے ہوں؛ آپ سے دوستی کا دم بھرتے ہوں؛ آپ سے پُر جوش مصافحہ کرتے ہوں؛ آپ سے گلے ملتے ہوں؛ کھانے کے دوران پلیٹ اپنے آگے رکھنے کی بجائے پہلے آپ کے آگے رکھتے ہوں؛ روزانہ آپ کے بیدار ہونے سے پہلے برقی سندیسہ میں آپ کی عافیت کے لیے دُعا گو ہوں تو کیا پھر بھی خود کو تنہا محسوس کریں گے؟ کیا اِن حالات میں بھی اکلاپے کا دُکھ آپ کا کلیجہ چاٹے گا؟ جی ہاں، اِس بھیڑ کے درمیان کا اکلاپا سب سے خوفناک اکلاپا ہے۔ یہی مارتا ہے انسان کو۔ کہیں کا نہیں چھوڑتا یہ۔

ایک محفل میں کئی محفلیں ہوتی ہیں شریک　　جس کو بھی پاس سے دیکھو گے، اکیلا ہو گا

آپ نے اِس طرح کی تنہائی کا کئی بار سامنا کیا ہوگا، یقیناً کیا ہوگا۔مَیں نے بھی کئی بار کیا ہے لیکن صرف ایک کا ذکر کروں گا۔

2009 میں میرا بیٹا فیصل جاوید پنجاب یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف کمیونی کیشن اسٹڈیز میں ماس کام کے فائنل سمسٹر کا امتحان دے رہا تھا۔اُن دِنوں لائبریری میں معمول کے مطالعہ کے دوران اُس کی نظر محکمہ تعلقاتِ عامہ کے ایک اشتہار پر پڑی جس میں محکمہ نے آرٹیکل رائٹر کی آسامیوں کے لیے درخواستیں طلب کی تھیں۔فیصل اُن دِنوں اپنے جگری یار 'جانی' جسے دُنیا حافظ عبدالرحمٰن شہید کے نام سے جانتی ہے اور جس نے مولانا سرفراز احمد نعیمی شہید کے ساتھ، جامِ شہادت نوش کیا، کی شہادت پر پریشان تھا اور امتحان کے فوراً بعد مصروف زندگی گزارنا چاہتا تھا۔لہٰذا اُس نے اپنے دوسرے 'فاسٹ' فرینڈ' حافظ عنایت اللہ ملک ناظم اسلامی جمیعت طلباء اور تیسرے دوست عثمان کے ساتھ مل کر درخواستیں جمع کرا دیں ۔امتحان اور انٹرویو کے مراحل طے ہوئے تو فیصل کو سرگودھا میں بحثیت آرٹیکل رائٹر تعینات کر دیا گیا۔

جس وقت بذریعہ ڈاک ہمیں تعیناتی کا حکم نامہ ملا، مَیں، فیصل اور اُس کی والدہ اپنے سکول کے آفس میں کام کر رہے تھے۔مَیں اِس لیٹر کو پھاڑنے ہی والا تھا کہ فیصل نے میرے ہاتھ سے کھینچ لیا اور میڈیکل وغیرہ کے مراحل کے بعد سرگودھا ڈویژن میں جائننگ (Joining) رپورٹ دے دی۔ Joining کے روز مَیں خود اور برادرِ عزیز ڈاکٹر خالد ندیم اُستاد اُردو ادبیات، سرگودھا یونیورسٹی فیصل کے ساتھ گئے اور اُس کے ڈائریکٹر کی بابت اچھی رائے قائم کرتے ہوئے واپس لوٹے۔

بدقسمتی سے فیصل کا وہاں دل نہ لگا اور اُس نے لاہور ٹرانسفر کرانے کے لیے کہا۔اُن دِنوں عطا محمد بلوچ ڈی۔جی۔پی۔آر تھے اور شعیب بن عزیز جیسے صاحبِ قلم سیکرٹری انفارمیشن تھے۔لہٰذا مَیں نے 'قلم کتاب' کے شُعبہ کے لوگوں سے رابطہ کیا اور فیصل کی لاہور ٹرانسفر کے لیے ایک لمبے سفر کا آغاز کر دیا۔ ............عشق کے لامتناہی سفر جیسا سفر۔مَیں نے سب سے پہلے مُسلم لیگ (ن) لاہور کے اعجاز ججی، جو میرا یارِ غار بھی ہے، سے کہا اور ساتھ ہی ڈاکٹر اشفاق احمد ورک سے بھی، جو اُن دِنوں ایف سی یونیورسٹی لاہور میں تعینات تھے اور اپنی پی۔آر کی وجہ سے ہم دوستوں میں ''اُچے پدّھر'' کا بندہ سمجھا جاتا تھا۔اعجاز

دوسرے روز میاں بلال یٰسین ایم این اے سابق وزیر کا ایک ذاتی خط لے کر عطا محمد بلوچ DGPR کو مِلا اور کچھ نہ کچھ کاوش برادرم اشفاق احمد ورک نے بھی کی، لیکن آرٹیکل رائٹر جیسے چھوٹے ملازم کو بھی ٹرانسفر کرانے کے لیے جس قوتِ بازو کی ضرورت تھی، وہ یہ دوست نہیں رکھتے تھے۔

میاں بلال یٰسین کے سندیسہ کے ایک ہفتے بعد مَیں نے میاں نواز شریف کے پانچ پیاروں میں سے ایک، رانا تنویر MNA سے شرفِ ملاقات حاصل کیا اور اپنے موبائل فون سے رانا صاحب کی DGPR سے بات بھی کرادی۔ DGPR صاحب نے اسی طرح کا وعدہ کیا جو اُنھوں نے اعجاز ججی سے کیا تھا کہ بس کرتے ہیں، اِن شاء اللہ جلدی کرتے ہیں۔ مَیں نے دوسری اور تیسری بار رانا صاحب سے التجا کی تو اُنھوں نے عندیہ دیا کہ اِس کام کو چند ماہ لگ سکتے ہیں۔ یوں مَیں اُن سے بھی نا اُمید ہوگیا۔

جنوری 2010 میں خرابیِ طبیعت کی وجہ سے مَیں نے فیصل جاوید کو سرگودھا جانے سے روک دیا اور خود ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک صاحب کے حکم کی تعمیل میں سعود عثمانی صاحب سے رابطہ کیا۔ عثمانی صاحب نے میری موجودگی میں شعیب بن عزیز سے ٹیلی فون پر بات چیت کی اور اُنھیں ایک غزل بھی سُنائی لیکن اُنھوں نے اِس بات کو اخلاقیات کے تقاضوں کے برعکس جانا کہ کئی ہفتوں کے بعد بات چیت کی جائے تو فوراً کوئی کام کہہ دیا جائے۔

ازاں بعد مَیں نے جناب سعود عثمانی کو بار بار یاد دِہانی کرائی لیکن بس 'عزتِ سادات' ہی گئی۔ اُنھی دِنوں مَیں نے ڈاکٹر اجمل نیازی سے بھی گزارش کی کہ وہ شعیب بن عزیز کو 'دوستی کا واسطہ' دیں اور اُنھیں زہرِ ہلاہل کو قند کہنے پر راضی کریں لیکن ان بڑے لوگوں نے زندگی میں کبھی کوئی 'بے ضابطگی' کی ہوتی تو یہ بھی کرتے نا۔

جن دِنوں یہ فرہاد نام نہاد، دُودھ کی نہر نکالنے کی سعیِ لا حاصل کر رہا تھا، اُنھی دِنوں ایک دوست نے مرکزی وزیرِ اطلاعات کا ایک سفارشی سندیسہ DGPR کے نام لکھوایا کہ فیصل جاوید آرٹیکل رائٹر اپنے باپ کی لاہور پوسٹنگ کی وجہ سے گھر میں واحد مرد رُکن (Male Member)، لہٰذا اُسے لاہور ٹرانسفر کر دیا جائے، تاکہ وہ روزانہ گھر جا سکے۔ لیکن اربابِ اختیار ٹس سے مَس نہ ہوئے۔

مَیں نے اپنے ایک بے تکلّف دوست میجر عبدالرحیم ثاقب سے بات کی تو کہنے لگے کہ ''لے ایہہ تے کھبے ہتھ دی کھیڈ اے۔'' بس پھر اُن کے حکم پر مَیں نے اگلی صبح محترمہ یاسمین شاہد صاحبہ (بیگم

ضیا شاہد) سے معاملہ ڈِسکَس کیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ اُنھوں نے شعیب بن عزیز سے اپنے بہت پرانے تعلق کی بنیاد پر اُنھیں کہہ تو دیا ہے لیکن اُن کا اِرادہ کام کرنے کا نہیں لگتا۔

اعجاز حجی، بلال یٰسین، ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک، ڈاکٹر اجمل نیازی، سعود عثمانی، میجر عبدالرحیم ثاقب، بھابھی گُلِ رعنا، محترمہ یاسمین شاہد اور کچھ دیگران، سب مجھے احترام دینے والے لوگ تھے لیکن مَیں نے ان سب انتہائی واجب الاحترام لوگوں کے درمیان خود کو کربناک تنہائی کا شکار پایا۔

زندگی یوں ہوئی بسر تنہا قافلہ ساتھ اور سفر تنہا (گلزار)

''مَیں ہار ماننے والا اِنسان نہیں ہوں۔'' مَیں نے تو کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا لیکن لوگ ایسا ضرور کہتے ہیں۔ پھر جن دِنوں فیصل کو بیمار اور غیر حاضر ہوئے دو ماہ بیت چکے تھے، مَیں نے اُسے اپنی ماں کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ساری عمر لاہور میں گزار دی ہے ابّو نے، ایک ٹرانسفر نہیں کروا سکے۔ بس پھر اگلی صبح مَیں سی ایم ہاؤس بیٹھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مَیں نے اُس کافرستان میں پاؤں رکھا تھا۔ ایک پری زاد میرے بائیں جانب کے کمرے میں تھا اور باہر جو تختی لٹک رہی تھی اُس پر لکھا تھا ''میاں حمزہ شہباز ایم این اے''۔ جس کمرے میں مجھے بٹھایا گیا تھا وہ محمد منشا بٹ سپیشل اسسٹنٹ ٹو چیف منسٹر کا تھا۔ وہ تشریف لائے تو مَیں نے اُنھیں اپنا مختصر تعارف کرایا۔ ''آپ تو کام کے آدمی ہیں۔'' CM کے سپیشل اسسٹنٹ نے کہا۔

''آپ کی کمال مہربانی ہوگی اور مَیں بہت ممنونیت کے ساتھ یہاں سے جاؤں گا، اگر آپ میری مدد فرمادیں تو''۔ میں نے گزارش کی۔

''کیوں نہیں جی۔ مَیں ابھی سیکرٹری انفارمیشن سے بات کرتا ہوں۔'' اور دو منٹ کے بعد سیکرٹری انفارمیشن لائن پر تھے۔ منشا بٹ صاحب نے میری موجودگی میں زور دے کر کہا کہ اِس لڑکے کو لاہور ٹرانسفر کیا جائے۔ مَیں نے ایک دوست نوید رضا کے ذریعے سیکرٹری انفارمیشن کو remind کرانے کا بندوبست بھی کر لیا لیکن ایک ادنیٰ ملازم کو سرگودھا سے لاہور ٹرانسفر کرنے میں اُنھیں کوئی بے اصول کہہ سکتا تھا یا شاید مُسلم لیگ کی حکومت ٹوٹ سکتی تھی۔

مارچ 2010 میں ایک روز حاجی محمد نواز صاحب ڈسٹرکٹ پریذیڈنٹ پاکستان مُسلم لیگ (ن) شیخوپورہ کا فون آیا کہ فیصل جاوید نے مجھے ایک کام کہا تھا، اُس کی موجودہ صورتِ حال کیا ہے؟

’’کچھ نہیں بنا ابھی تو‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’آپ کل گیارہ بجے سپیشل اسسٹنٹ ٹو CM کے کمرے میں پہنچ جائیں۔‘‘ اُنھوں نے حکم دیا۔

مَیں ذِلّت و رُسوائی کی منازل طے کرتا ایک بار پھر منشا بٹ صاحب کے کمرے میں پہنچا تو حاجی محمد نواز ضلعی صدر پی ایم ایل(N)، حاجی غلام نبی ایم پی اے، پیر اشرف رسول ایم پی اے اور دو ایک دیگر ایم پی ایز جناب حمزہ شہباز سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لیے چِٹ اندر بھیج چکے تھے۔ اس میٹنگ کے نتیجے میں CM ہاؤس سے ایک ڈائریکٹو جاری ہوا جس کے نتیجے میں آرڈرز جاری ہو گئے۔ اور پھر 29۔ اپریل 2010 کو CM ہاؤس کو یہ لکھ دیا گیا کہ تعمیلِ اِرشاد ہوگئی ہے۔ اِس دوران، انسانوں کے ہجوم کے درمیان بھی میں شدید اکلاپے کا شکار رہا۔ اِتنا زیادہ کہ مجھے گارشیا کا 'One Hundred Years of Solitude' بھی بے معنی نظر آنے لگا۔

قارئین! ہم ظلمت و جہالت اور بد دیانتی کے گہرے سمندروں میں ڈُبکیاں کھا رہے ہیں۔ پاکستان ریلوے کے سٹیل کے بنے ہوئے سینکڑوں ٹن وزنی پُل چوری ہو رہے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا۔ پاکستان کا سٹیل ملز کا دیوہیکل پروجیکٹ سُو رخوروں کی جیبوں میں چلا گیا ہے۔ گریڈ 18 کا ایک ملازم اربوں روپے کی کرپشن کر کے بھی آزاد پھرتا ہے۔ ایک پٹواری کروڑوں کی جائیدادوں کا مالک بن جاتا ہے۔ پاکستان کے شکار پور کے باسی پانی کی ایک بوند کے لیے اپنی ناریوں کو کوسوں دُور دھکیلنے پر مجبور ہیں اور اُن کے ترجمان ہونے کے دعویدار برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ میں اربوں ڈالر کے اثاثے بنا رہے ہیں۔ کل تک جو تن تنہا مزنگ چونگی کے تِکّے کھاتے نظر آتے تھے آج ہزاروں افراد اُن کی طرف بدنصیبی کا راستہ روکنے پر مامور ہیں اور اُن کو پیسے مَیں اور آپ دے رہے ہیں۔

اور قارئین! یہی وہ مُلکِ خداداد ہے جس میں کھربوں کے قرضے ہڑپ کر جانے والوں کو قانونی تحفظ دے دیا جاتا ہے۔ اور یہی ہے وہ ارضِ پاک جہاں قوم کی بیٹیاں فجر کے بعد ہی کوڑے کے ڈھیر سے روٹی کے ٹکڑے چُنتی نظر آتی ہیں۔

بُوئے خون آتی ہے اِس قوم کے فسانے سے

# رپورٹ پٹواری مفصّل ہے

مَیں نے حضرت واصف علی واصفؒ سے ایک بار سُنا تھا کہ قائدین کی بہتات ہو جائے تو سمجھو قیادت کا فُقدان ہُوا۔ وطنِ عزیز ایک طویل مُدّت سے اِسی طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ قائدین وافر ہیں اور اکثریت اُن کی ہے جن کے سامنے عبداللہ بن اُبی کی روح شرماتی ہے۔ خیال و خواب ہوئے وہ لمحات جب ملک میں ایک آئین تشکیل پایا اور کچھ قانون سازی ہوئی۔ 2023 کے جن ایاّم میں یہ سطور قلم بند ہوئیں اُن ایاّم میں عام سیاسی کارکُن کے ساتھ ساتھ منجھے ہوئے پارلیمنٹیرین بھی یونانی فلاسفروں کو نیچا دِکھانے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ پاکستان اپنی سیاسی تاریخ کے بدترین دَور سے گُزر رہا تھا۔

اُن ایاّم میں میری نظر سپریم کورٹ کے 6۔اکتوبر، 2011 کے ایک فیصلے پر پڑی جس کے مطابق کراچی میں حکمران جماعت (عہدِ گیلانی)، کراچی کی اُس عہد کی نمائندہ لسانی تنظیم، سُنّی تحریک اور جماعتِ اسلامی کے لوگ بھی کراچی کی تاجر برادری سے چندے کے نام پر بھتہ خوری کرتے رہے ہیں۔ میں سوچتا رہا کہ بادی النظر میں یہ سب لائقِ احترام نام ہیں لیکن جب عدالتِ عُظمیٰ نے ان کے چہروں سے نقاب ہٹائے تو کیا سامنے آیا۔ یہ کہ اگر ہمیں کوئی کام ڈھنگ سے کرنا آتا ہے تو یہ چھینا جھپٹی ہے بس۔ اقبال نے سچ ہی کہا تھا:

جن کو آتا نہیں دُنیا میں کوئی فن ، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن ، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں پوشیدہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہو جو اسلاف کے مدفن ، تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

اُس عہد کے بڑوں کے 'زرّیں کارناموں' پر نظر گئی تو مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ بیلٹ کے زور سے بننے والی گیلانی حکومت نااہلیت کے مظاہروں کے ریکارڈ توڑ رہی تھی۔ اس حکومت کے ابتدائی دَور میں وزارتِ پانی و بجلی کا قلمدان راجہ پرویز اشرف نامی ایک صاحبِ بصیرت وزیر کو سونپا گیا۔ اُنھیں قومی اسمبلی کا سپیکر اور پھر پاکستان کا وزیرِ اعظم بننے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔

اُن کی وزارت کے عہد میں ایک روز میرے دفتر کو ایک حکم نامہ موصول ہوا کہ وزیرِ موصوف نے فلاں تاریخ کو قومی اسمبلی میں ایک NAQ کا جواب دینا ہے لہٰذا آج ہی اِس کا مفصّل جواب ارسال کیا جائے کہ اگر لاہور کی تمام سٹریٹ لائٹس کو آٹو میٹک کر دیا جائے تو بجلی کی کتنی بچت ہوگی۔ یہ کام ایڈمن کا تو نہیں تھا لیکن دفتر کے انجینئر سربراہ رُخصت پر تھے لہٰذا میں نے ہیڈکوارٹر کو جواب دیا کہ اِس طرح 9 فیصد بجلی بچائی جاسکتی ہے۔ لیسکو HQ میرے فوری جواب سے بہت خوش ہوا اور درجنوں بڑے بڑے گریڈز والے انجینئرز کو پالنے والے اس دفتر سے جواب بعینہٖ واپڈا ہاؤس کو فارورڈ کر دیا گیا اور پھر وہی جواب فوراً وزارتِ پانی و بجلی کو ارسال کر دیا گیا۔ یقیناً راجہ صاحب مسرور ہوئے ہوں گے کہ فوری کارروائی کر کے اُن کی اُچھلتی ہوئی پگڑی کو بچالیا گیا ہے اور اب وہ دھڑلّے سے قومی اسمبلی میں NAQ کا شافی جواب دے دیں گے۔ اور پھر وہی ہوا اور نمائندگانِ ملک و ملت کو یہ خوش کن خبر سُنا دی گئی کہ آٹو میٹک سوئچز سے 9 فیصد بجلی بچ جائے گی اور یوں بظاہر یہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔

کچھ ایّام کے بعد کچھ ناراضی سے اربابِ بست و کشاد نے سوال کیا کہ یہ تو بتائیں کہ یہ 9 فیصد بجلی کیسے بچے گی۔ یہ سوال تو بہت پہلے کیا جانا چاہیے تھا لیکن تب کیا ہوا اور اب کیا خاص ہوا کہ اس کی وضاحت طلب کی جارہی ہے، میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ ایگزیکٹو انجینئر جو دوست بھی تھے، کہنے لگے کہ جواب آپ نے دیا تھا لہٰذا اب اِسے justify بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا۔ مَیں جمع تفریق کرنے لگ گیا کہ اگر 12 کی بجائے 11 گھنٹے لائٹیں روشن ہوں تو ایک گھنٹے میں 9 فیصد بچت ہوسکتی ہے۔ حساب نے بتایا کہ نہیں ایسا کرنے سے 9 فیصد نہیں بلکہ 8.2 فیصد بچت ہوگی۔ میں کتنی ہی دیر پریشان رہا کہ اگر NAQ کا جواب غلط قرار دے دیا گیا تو مسئلہ بن سکتا ہے۔

انتہائی سوچ بچار کے بعد مَیں نے لکھا کہ اگر یکم جنوری سے 31۔دسمبر کی تمام راتوں کے اوقات کی اوسط نکال لیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ لاہور میں اندھیرے کا فی یوم اوسط وقت 11 گھنٹے ہے، یعنی 13 گھنٹے کا دن اور 11 گھنٹے کی رات۔لیکن آٹو سوئچز سورج غروب ہونے کے چند منٹ بعد آن ہوں گے۔یوں متوقع بچت 9 فیصد ہی بنتی ہے۔یہ جواب بھی پہلے جواب کی طرح تھوڑا ہی معقول تھا، اِس لیے اسے despatch کرنے کے بعد ہم مسکرائے بھی اور روئے بھی۔

مَیں نے انجینئر دوست سے پوچھا کہ بھلا ہمارا پہلا جواب کن بُنیادوں پر وزارتِ پانی و بجلی کو ارسال کر دیا گیا تھا تو کہنے لگا کہ کیا تم نے شہاب نامہ نہیں پڑھا؟ مَیں نے ہاں میں جواب دیا تو کہنے لگا کہ پھر 'رپورٹ پٹواری مفصّل ہے' بھی پڑھا ہوگا۔

''لیکن وہ تو نصف صدی پرانی بات ہے'' میں نے جواب دیا۔

''اب بھی ویسا ہی ہے، بس خاموش رہو''

مَیں شام کو گھر لوٹا تو 'شہاب نامہ' ایک بار پھر پکڑ لی۔'رپورٹ پٹواری مفصّل ہے' کا ایک ایک لفظ مزے لے لے کر پھر پڑھا اور پھر کتنی ہی دیر اِس سوچ میں گم رہا کہ اِتنی طویل مُدّت کے بعد بھی میرا دُکھ قدرت اللہ شہاب کا سا کیوں ہے۔آخر ہماری سمت کب درست ہو گی؟

# پاکستان میں عائلی قوانین

مَیں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایک بار کسی شخص نے حضرت عیسیٰؑ کو تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا کہ اللہ کا نبی اِتنی پریشانی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اُس نے سوال کیا کہ کیا آپ عیسیٰؑ نہیں ہو؟ پیغمبرِ خدا نے جواب دیا کہ مَیں عیسیٰ ہی ہوں۔ اُس نے پھر پوچھا کہ وہی نا جو بیماروں کو شفا یاب کر دیتا ہے اور مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے؟

''ہاں وہی ہوں لیکن یہاں سے تیزی سے بھاگو'' جناب عیسیٰؑ نے کہا۔

''لیکن کیوں آخر؟'' سائل نے پُرتجسّس لہجے میں پوچھا۔

''وہ دیکھو جو پیچھے آ رہا ہے، وہ احمق ہے۔ جاہل ہے۔''

''تو اُس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟''

''جہالت کا علاج نہیں کیوں کہ یہ بیماری نہیں، گرفت ہے۔ عذابِ الٰہی ہے۔''

میری قوم سب سے زیادہ جس معاملہ میں جہالت کا مظاہرہ کرتی ہے، اُس کا تعلق ہماری عائلی زندگی سے ہے۔ ہم ایسے بھونڈے اور مکروہ دلائل کے ساتھ مباحثہ کرتے ہیں کہ دانش ور کو عیسیٰؑ کی طرح بھگا دیتے ہیں۔ مَیں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اپنے دینی مسائل میں احباب میرے سے مشاورت کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ میں دینی تعلیم میں کہیں سے بھی فارغ التحصیل نہیں ہوں۔ اور اگر مَیں نے کچھ مطالعہ کیا بھی ہے تو میری رائے کی کیا اہمیت؟ نقار خانے میں توتی کی آواز کون سُنے گا۔

پاکستان میں بسنے والا سوادِ اعظم یہ سمجھتا ہے کہ بیک وقت تین بار طلاق کہہ دی جائے تو عورت مرد کے نکاح سے فوراً نکل جاتی ہے اور رجوع کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اِصطلاح میں ایسی طلاق کو طلاقِ بائن کہتے ہیں۔ اس عقیدہ کے علمائے کرام کا فرمان ہے کہ اِیسا کرنے والا مرد گناہ گار ہوگا، لیکن طلاق ہو جائے گی۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ سہ پہر چار بجے روزہ افطار کرنے والا روزہ دار

گناہ گار تو ہوگا لیکن روزہ ہوجائے گا۔ یہ منطق میری سمجھ سے ہمیشہ بالا رہی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جو طریقے اور وجوہات ازواج کی علیحدگی کے بتائے ہیں وہ طلاق، خُلع، ایلاء، ظہار، لعان اور فقید الخبر ی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں طلاق اور خُلع عام ہو چکا ہے۔ خُلع میں کافی سوچ بچار سے کام لیا جاتا ہے لیکن طلاق عمومی طور پہ بِلا سوچے، غُصّے یا پریشانی کی حالت میں دے دی جاتی ہے۔ چونکہ معاشرے میں تحمل و برداشت کا فُقدان ہے لہٰذا شرحِ طلاق بڑھتی جا رہی ہے۔ طلاق دینے والوں میں ایک واضح اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنھیں اپنے کیے پہ پچھتاوا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے مرد یا اُن کے بہی خواہ، ازاں بعد اِس رشتے کی تجدید کی مخلصانہ کوشش کرتے ہیں، لیکن قرآن فہمی سے دُور کم علم علماء کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں یا فرقہ کی ضد آڑے آتی ہے۔ طلاق چونکہ غُصّے کی حالت میں دی جاتی ہے لہٰذا مرد اپنا غُصّہ نکالنے کے لیے تین بار طلاق کہہ چکا ہوتا ہے جو جہالت کا ایک شاہکار فعل اور قرآن کو کُھلا چیلنج ہے۔

میرے پاس بہت سے مرد وخواتین تشریف لاتے ہیں کہ کوئی حل ڈھونڈا جائے۔ تعجّب ہے کہ اللہ کے بنائے قوانین کو روند کر اللہ کی مخلوق کے پاس حل ڈھونڈنے نکل پڑتے ہیں۔ جب اللہ نے قرآن میں طلاق دینے کا طریقہ بتا دیا ہے تو اس کے برعکس طریقہ پر طلاق کیسے ہوسکتی ہے؟ بالکل اسی طرح جیسے صبح 8 بجے روزہ رکھ کر رات 9 بجے افطار کرنے سے روزہ نہیں ہوتا حالانکہ ہم نے اتنے ہی گھنٹے بھوک پیاس برداشت کی ہوتی ہے جتنی اصل روزہ دار نے۔ لہٰذا مَیں جب ایسے لوگوں کو کہتا ہوں کہ فوراً اپنی بیوی سے رجوع کرلو تو وہ کہتے ہیں کہ فلاں عالم کے پاس گئے تھے، اُس نے کہا ہے کہ ایک وقت میں تین بار طلاق کہنے سے طلاقِ بائن ہوچکی ہے۔ تو ظاہر ہے میرا جواب یہی ہوگا کہ پھر میرے پاس کیوں آئے ہو؟

مَیں حیران اور پریشان اُس وقت ہوا جب میں نے معروف عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد کی زبان سے یہ سُنا کہ میرا عقیدہ تھا کہ بیک وقت تین طلاقوں سے طلاقِ بائن نہیں ہوتی لیکن جب مَیں نے یہ جانا کہ ہمارے چاروں ائمہِ کرام کی یہ رائے ہے کہ طلاقِ بائن ہو جاتی ہے تو مَیں نے بھی اپنی رائے بدل لی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ معقول دلیل نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم نے اس روایت کو مان لیا کہ آقا پیغمبرِ اعظمؐ وآخر نے ایک 9 سال کی لڑکی کو دُلہن بنا لیا۔ اور یہ اِس لیے مان لیا کہ ہم نے بخاری شریف میں پڑھا ہے اور بخاری شریف کی بابت ہماری رائے ہے کہ ''بعد کتابِ باری، صحیح بخاری''۔

حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے یا حضرت امام بخاریؒ کی ناقص پرکھ پڑچول کا نتیجہ ہے۔اب اگر مَیں یہ عرض کروں کہ ہمارا سوادِ اعظم اپنے عظیم راہنما اور میرے پسندیدہ ترین مفسّر اور سیرت نگار حضرت پیر جسٹس کرم شاہ الازہری کی طلاقِ ثلاثہ پر رائے کا مطالعہ کرلے تو میرے اِس مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔شاید ہمارا قبلہ درست ہو جائے۔

عائلی مسائل کے حوالے سے ایک عجیب وغریب اور پیچیدہ مسئلہ دسمبر، 2014 میں اُس وقت میرے سامنے آیا جب ایک خاتون نے یہ دُکھ بیان کیا کہ بہت پہلے میرے ایک رفیقِ کار نے مجھے یہ کہا کہ ''بہت خوب صورت لگ رہی ہو، میرے ساتھ نکاح کرلو۔'' وہ مزاح کے موڈ میں تھا لہٰذا مَیں نے بھی کہہ دیا کہ ''دیر کس بات کی، کیسے ہوتا ہے نکاح؟............ چلو کرتے ہیں۔'' اُس نے کہا کہ تم کہو کہ ''مَیں خود کو تمھارے نکاح میں لاتی ہوں۔مَیں کہوں گا کہ قبول ہے'' پھر ہم نے ایسا کرلیا اور بات اِس مذاق کے بعد ختم ہوگئی۔

خاتون نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ اب اُس کی شادی ہے اور وہ پریشان ہے کہ وہ کہیں اُس مرد کی منکوحہ تو نہیں ہے۔اُس کی داستان سُن کر مَیں چکرا کے رہ گیا اور اُسے کہا کہ جاؤ، کہیں اور اپنے مسئلہ کا حل تلاش کرو۔شعائرِ اسلام کی توہین کرو گے تو سزا تو مِلے گی۔لیکن ایسا کہتے ہوئے مَیں نے ایک پریشان حال انسان کی مدد کی بھی ٹھان لی، لہٰذا اُسے چند روز بعد رابطے کا کہا۔مَیں نے اُسی شام مفتی منیب الرحمٰن صاحب کو لکھا کہ وہ اگر میری فوری راہنمائی فرمائیں تو مَیں بے حد ممنون ہوں گا۔مفتی صاحب نے کرم فرمایا اور میری التجا کے مطابق فوراً جواب ارسال کردیا۔اِس معتبر اور لائقِ احترام اسکالر کی رائے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ میرے جیسے طالبِ علم ہی نہیں، علمائے اُمّت بھی عائلی مسائل پر کنفیوز ہیں۔مفتی صاحب کی رائے آپ بھی پڑھ لیں اور فیصلہ فرمائیں کہ کیا کرنا چاہیے۔

## دارالافتاء دارالعلوم نعیمیہ

بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، کراچی

مرد اور عورت کے خَلوت میں ایجاب وقبول سے نکاح منعقد نہیں ہوتا

محترم مفتی صاحب السّلامُ علیکم!

**سوال** : ایک خاتون نے کسی مرد سے کہا کہ میں تمھارے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہوں۔ مرد نے کہا: دیر کس بات کی ہے؟ تم تین بار مجھے قبول کرو، میں تمھیں قبول کرتا ہوں۔ پھر دونوں نے ایجاب وقبول کرلیا، اُس مجلس میں کوئی گواہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کی کوئی تحریر، کوئی خلوتِ صحیحہ بھی نہیں ہوئی۔ شرعی حکم بیان فرمائیں۔

اصغر علی جاوید ایڈووکیٹ،

شیخوپورہ

بِسمِ اللہ الرَّحمٰنِ الرَّحیم

الجواب بعون الملک الوہاب

نکاح کا رُکن ایجاب وقبول ہے، مگر نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لیے ایجاب وقبول کے موقع پر مجلسِ نکاح میں دو گواہوں کا ہونا شرط (ضروری) ہے، خواہ لڑکا اور لڑکی براہِ راست ایجاب و قبول کریں یا بذریعہ وکیل، اگر وکیل کے ذریعے ایجاب وقبول ہو تو اِس امر کے ثبوت کے طور پر کہ لڑکی نے ایک مقررہ مہر پر اس لڑکے کے ساتھ اس وکیل کو اپنے نکاح کا اختیار دیا ہے، الگ سے دو گواہوں کا ہونا بہتر ہے۔ گواہوں کے بغیر نکاح پر وعید آئی ہے۔ نبی ﷺ نے اِرشاد فرمایا: اَلْبُغَایَا اللَّاتِیْ یَنْکِحْنَ اَنْفُسَھُنَّ بِغَیْرِ بَیِّنَۃٍ۔ ترجمہ: ’’بدکار عورتیں وہ ہیں جو بغیر گواہوں کے اپنا نکاح کرتی ہیں، (سُنن ترمذی:1133)‘‘۔

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا کہ اگر عورت و مرد باہم ایجاب وقبول کرلیں اور کسی کو اطلاع نہ ہو تو کیا یہ نکاح ہو جائے گا؟ آپ نے جواب میں لکھا کہ دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر نکاح فاسد ہے۔ پھر آپ نے مندرجہ بالا حدیث مبارک کا حوالہ دیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد: 11 ص:219، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)‘‘۔

شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی لکھتے ہیں: وَلَا یَنْعَقِدُ نِکَاحُ الْمُسْلِمِیْنَ اِلَّا بِحُضُوْرِ شَاھِدَیْنِ حُرَّیْنِ عَاقِلَیْنِ بَالِغَیْنِ مُسْلِمَیْنِ رَجُلَیْنِ

اَوْ رَجُلٍ وَامْـرَأَتَیْنِ عُـدُوْلاَ کَـانُوْا أَوْ غَیْـرَ عُدُوْلٍ أَوْ مَحْدُوْدَیْنِ فِی الْقَذْفِ۔ترجمہ: ’’(جب تک مجلسِ نکاح میں ) دو آزاد، عاقل اور بالغ مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں موجود نہ ہوں، مسلمانوں کا نکاح (شرعی طور پر ) منعقد ہی نہیں ہوتا وہ گواہ خواہ عادل ہوں یا غیر عادل یا محدود فی القذف ہوں‘‘۔اِس کی شرح میں علامہ کمال الدین ابنِ ہمام لکھتے ہیں:أَمَّا اشْتِرَاطُ الشَّهَادَةِ فَلِقَوْلِہٖ ﷺ لَا نِکَـاحَ اِلَّا بِشُهُوْدٍ۔ ترجمہ: نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لیے فقہائے کرام نے دو گواہوں کی جس موجودگی کو شرط قرار دیا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی اِس حدیث سے ثابت ہے: ’’(غیر کفو میں ) ولی کی اجازت کے بغیر اور (اِسی طرح) دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا‘‘۔

(فتح القدیر مع ہدایہ،جلد: 3،ص:190,191،مطبوعہ:مرکز اہلِ سُنّت برکاتِ رضا)

وَالصَّحِیْحُ مَا رُوِیَ عَنِ أَبْنِ عَبَّاسٍ قَوْلُهٗ : لَا نِکَاحَ اِلَّا بِبَیِّنَةٍ۔

امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے اِس روایت کو صحیح قرار دیا ہے: ’’گواہوں کے بغیر نکاح جائز نہیں‘‘۔(سُنَنْ ترمذی،جلد2،ص:185)

امامِ اعظم ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے نزدیک نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لیے دو گواہوں کا ہونا شرط ہے۔ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:اتَفَقَتَ الْمَذَاهِبَ الْاَرْبَعَةِ عَلٰی اَنَّ الشَّهَادَةِ شَرْطٍ فِیْ صِحَةِ الزَّوْجِ، فَلَا یَصُحَ بِلَا شَهَادَةِ اثْنَیْنِ غَیْرَالْوَلِیّ لِقَوْلِہٖ ﷺ فِیْمَا رَوَتْهُ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا: لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ وَّشَاهِدِی عَدلٌ " وَرَوَی الدَّارَ قطنی حَدَّثَنَا عَنْ عَائِشَةِ اَیْضاً: لَا بَدُفِی اِنّکَاحَ مِنُ اَرْبَعَة: الولی، والزواج، والشاهدین " وروی الترمذی عن ابن عباس من قولهٖ علیه الصلاةُ والسلام: اَلْبُغَایَاالّلاَّتِیْ یَنْکِحْنَ اَنْفُسَهُنَّ بِغَیْرِبَیِّنَةٍ۔

ترجمہ: ’’(اہلِ سنت وجماعت کے ) چاروں مذاہب کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ (شرعاً ) نکاح کے صحیح ہونے کے لیے گواہی شرط ہے، پس ولی کے علاوہ دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد روایت ہے: ’’ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح درست نہیں ہے، اور امام دارقطنی نے بھی حضرت عائشہؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے: ’’نکاح میں چار افراد کا

ہونا ضروری ہے: ولی، شوہر، اور دو گواہ' اور امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے: بدکار عورتیں وہ ہیں جو بغیر گواہوں کے اپنا نکاح کرتی ہیں، (فقہ الاسلامی وادلتہٗ، جلد: 9،ص:6559)''۔

نکاح کا اعلانیہ طور پر ہونا مستحب ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اِرشاد فرمایا: اَعْلِنُوْا ھٰذَا النِّکَاحَ ، وَاجْعَلُوْہُ فِی الْمَسَاجِدِ، وَاضْرِبُوْا عَلَیْہِ بِالدُّفُوْفِ ۔ترجمہ:''(لوگو!) نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کرو اور ان کی تشہیر کے لیے دف بجایا کرو۔ (سُنن ترمذی: 1089)''۔ اسلام نے دو گواہوں کی شرط اعلان ہی کے لیے رکھی ہے تاکہ کسی کو ہدفِ طعن بنانے کا موقع نہ ملے، اگر ایسا نہ ہو تو اوباش لوگ اسے مذاق بنا لیں گے اور بدی کا راستہ کھل جائے گا، جب کہ اسلام مفاسد کی روک تھام کے لیے ''سَدِّ ذرائع'' کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

11، جنوری 2015ء

مفتی منیب الرحمٰن

رئیس دارالافتاء

دارالعلوم نعیمیہ، کراچی

لہٰذا اِس امر کی شدید ضرورت ہے کی مُسلم فیملی لاء آرڈیننس 1961 سے آج تک ہونے والی تمام قانون سازی پر نظر ثانی کی جائے اور فتاویٰ عالمگیری طرز پر کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے عام مسلمان کو صِراطِ مستقیم نظر آئے۔

**حضورؐ کی حیاتِ پاک:** 'حیاتی حضورؐ دی' پر صدارتی ایوارڈ کے بعد دینی ادب کے قارئین کی طرف سے اِس خواہش کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ اِس کا اُردو ترجمہ بھی کیا جانا چاہیے۔ چونکہ اِس کارِ نیک کا آغاز پروفیسر محمد علی صاحب کر چکے تھے لہٰذا مَیں نے اُردو میں 'حیاتی حضور دی' کی تلخیص کو موزوں جانا۔ زبان و بیان میں سلاست اور سادگی کو پیشِ نظر رکھا تاکہ اسے بچے اور سیرت کے نئے قارئین بھی پڑھ سکیں۔

یوں 164 صفحات پر مشتمل 'حضورؐ کی حیاتِ پاک' ترتیب پا گئی۔ حجم کے لحاظ سے یہ اصل کتاب کا صرف 20% ہے لیکن سیرت کے نئے قارئین نے اسے بنظرِ تحسین دیکھا۔

'حضورؐ کی حیاتِ پاک' کا ایک ایک لفظ مجھے عزیز ہے، یہاں تک کی اس کے ٹائٹل سے بھی مجھے پیار ہے۔اس کے ابتدائی الفاظ یوں ہیں:

''ذرا چشمِ تصور وا کریں۔

آپ اس وقت مملکتِ سعودی عرب میں بحیرہ قلزم سے تقریباً ۷۰ کلو میٹر اور جبلِ قراع کی ریتلی چٹانوں سے تقریباً ۴۰ کلو میٹر کے فاصلے پر سطحِ سمندر سے ۳۰۰ میٹر کی بلندی پر زمین کے عین مرکز پر کھڑے ہیں۔ یہ بل کھاتی ہوائیں جو ہر لمحہ اپنی سمت تبدیل کر رہی ہیں، یہ صرف اِسی شہر کے لیے ہیں۔

یہ شہر دُنیا کا ایک مشہور اور اسلامی دُنیا کا اہم ترین شہر ہے۔ جزیرہ نمائے عرب تو اِس شہر پہ فخر کرتا ہے، اور کیوں نہ کرے؟ اِس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی آدمیت کی۔ جتنا تقدس و احترام اِس شہر کو نصیب ہوا، دُنیا کے کسی اور خِطّے، شہر یا قریہ کو نہ مل سکا۔ یہاں اللہ کے حکم سے اللہ کا پہلا گھر اور عبادت گاہ تعمیر ہوئی اور آج بھی یہ دُنیا کی سب سے بڑی عبادت گاہ ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے نومولود بیٹے اسمٰعیلؑ اور اُن کی والدہ کو تنہا چھوڑا اور پھر وہاں آبِ زم زم کا چشمہ پھوٹا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں فخرِ انسانیت حضرت محمد ﷺ نے جنم لیا اور پھر اپنی اِس جائے پیدائش سے اُنھوں نے بے پناہ محبت کی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے آخری نبیؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور یہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے محبوبؐ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا اور پھر وہ یہ کہتے ہوئے یہاں سے رُخصت ہو گئے کہ اے میری جنم گاہ! تجھے چھوڑنے کو جی تو نہیں چاہ رہا لیکن کیا کروں تیرے لوگوں نے مجھے یہاں رہنے نہیں دیا۔ قارئین! یہ ہے مکہ۔۔!''

مَیں نے اپنے افسانوں، کالمز، مضامین، سیرت النبیؐ اور دیگر کتب میں لاکھوں الفاظ لکھے ہوں گے لیکن اگر مجھے یہ کہا جائے کہ وہ ایک جملہ کون سا ہے جو مجھے اپنی تخلیقات میں سب سے زیادہ عزیز ہے تو مجھے 'حضورؐ کی حیاتِ پاک' کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، لیکن اس کے لیے مجھے تھوڑا سا سیاق دینا پڑے گا۔ آیئے آقاؐ کے آخری لمحات کا ذِکرِ پاک پڑھتے ہیں:

''دن گیارہ بجے کا وقت ہوگا کہ آپؐ اپنا دستِ مبارک (یا شاید صرف انگشتِ شہادت) آسمان کی طرف بلند فرماتے ہیں، ہونٹوں پر کچھ جُنبش ہوتی ہے۔ جنابِ عائشہؓ جلدی سے اپنا کان چہرۂ مبارک کے ساتھ لگاتی ہیں۔حضورؐ فرما رہے ہیں: اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی

محبوبؐ خدا، خدا کے پاس تھے۔کمان کا فرق بھی ختم ہوا۔''

تو قارئین! یہ آخری جملہ مجھے 'اپنی کائنات' میں سب سے زیادہ پیارا ہے۔آپ آقاؐ کی حیاتِ پاک کے اُن خوب صورت لمحات کو تصوّر میں لائیں جہاں کمان کا فرق رہ گیا تھا اور پھر اِس جملے کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھیں اور آقاؐ کی نظرِ التفات میں حِصّہ دار بن جایئے۔

**عیدین اور میرے رفتگان:** جن ایّام میں ہمارے بزرگ دوست مرزا صدیق شاہد صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج نے داعیِ اجل کو لبیک کہا، اُن ایّام میں شیخوپورہ کے نامور اہلِ قلم کی تنظیم ''دریچہ'' کی سربراہی مجھے تفویض کی گئی تھی۔ میں نے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں مرحوم کے لیے ایک تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا جس کے صدر عالمی شہرت یافتہ محقق اور مصنف ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی تھے۔شیرانی صاحب کی ادبی خدمات کا ہر اپنا بیگانہ معترف تھا لیکن اُن کی شخصیت کی مقناطیسیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ حافظ محمود شیرانی کے پوتے اور اختر شیرانی کے فرزند تھے۔لہٰذا اُن کی گفتگو مکمّل انہماک سے سُنی جاتی تھی۔

مرزا صدیق شاہد چونکہ جمعرات کے روز فوت ہوئے تھے اِس لیے شیرانی صاحب نے اپنی تقریر میں ہندوستان کے کسی معروف ولی اللہ کے حوالے سے کہا تھا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو مسلمان جمعرات کے روز فوت ہوتا ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ مَیں اُس کے پسماندگان سے تعزیت نہ کروں بل کہ اُنھیں مبارک باد کہوں۔ اِس روایت سے میری دلچسپی اِس حد تک بڑھی کہ مَیں نے صحاح سِتّہ، تمام کی تمام، چھان ماریں۔ علاوہ ازیں بھی سارے دستیاب مواد کا مطالعہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے حافظ ابنِ قیّم کی 'کتاب الرّوح' سے کچھ نہ کچھ ایسا دستیاب ہو جائے گا جو اِس روایت کو تقویت بخشے کہ جمعرات کی موت افضل ترین موت ہے لیکن بدقسمتی سے سارے ذخیرہ حدیث اور متعلقہ کتب سے کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جو جمعرات کے متوفّی کے وارثان کو مبارک باد کہنے پر قائل کرے۔

شیرانی صاحب کی بات کو بے وزن بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ کے جس ولی کا اُنھوں

نے حوالہ دیا تھا، اُن کے ذاتی مشاہدات و تجربات میں کوئی ایسی بات آئی ہو جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ جمعرات کے متوفّی کو کوئی خاص رعایت سے نوازا جاتا ہے یا اُنھوں نے اِس روایت سے کوئی نتیجہ اخذ کیا ہو کہ جمعہ اور جمعہ کی رات کی موت افضل ہے۔ چونکہ اس روز مرنے والے سے قبر میں سوال نہیں کیا جائے گا۔لیکن قارئین! ایّام اور اوقات کے ساتھ کچھ نہ کچھ خاص تو ہوتا ہے، واللہ اعلم حقیقت کیا ہے۔

حرام مہینوں میں اللہ نے قتال سے منع فرمایا ہے۔عیدین کی ایک اہمیت ہے۔شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ جمعہ مومن کی عید ہے۔ بُدھ کے روز ظہر اور عصر کے درمیان دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اِس کے علاوہ بھی قبولیتِ دُعا کے کچھ اوقات بتائے گئے ہیں۔ رات کے پچھلے پہر اللہ ذوالجلالِ والاِکرام پہلے آسمان پر تشریف لاتے ہیں اور پکارنے والے کی پکار سُنتے ہیں۔ انسان اپنے اللہ کے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔صبح کے وقت اور نماز میں قرآن پڑھنا بہترین قرآن خوانی ہے۔ اِن سب اوقات کے علاوہ بھی بعض اوقات ایسے حقائق منکشف ہوتے ہیں جو عقل و اِدراک کی گرفت میں نہیں آتے۔ یہ خاص اوقات ہوتے ہیں۔

میری دلچسپی اِس موضوع میں اِس قدر عمیق کیوں ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ میرے رفتگان کا عیدین کے قریب ایّام اور جمعرات جمعہ سے گہرا تعلق ہے۔میرے ایک بڑے بھائی، میری شریکِ حیات اور میرے گھر میں مقیم میری خوش دامن جمعرات کو فوت ہوئیں۔ میری والدہ محترمہ جمعہ کے روز اللہ کو پیاری ہوئیں۔ وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ میری بھابھی 2023 میں عیدالفطر سے دو روز قبل فوت ہوئیں اور میری شریکِ حیات عیدالفطر سے اگلے روز 2۔شوال کو اللہ کو پیاری ہوئی۔ چھوٹے بھائی عباس علی اور والدِ محترم نے بھی شوال کے مہینے میں رحلت فرمائی۔ بڑے بھائی ڈاکٹر شوکت علی اور میری خوش دامن نے ذی الحج میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔اب اِسے اتفاق کہہ لیں یا کوئی دوسرا نام دے لیں، لیکن میرا خیال ہے کہ اِس میں کچھ نہ کچھ خاص ضرور ہے۔اب صورتِ حالات یہ ہے کہ خاندان میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ عید آ رہی ہے، کِس کی باری ہے اب کے!

**نیب کی سی۔بی۔ایس اور میں:** cbs.punjab.gov.pk سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

" CBS in synergy with NAB is to be credible, effective, efficient, dynamic and efficacious financial anti corruption forum meant for enabling of an environment for a corruption free Pakistan."

اپنے طویل مُدتی مقاصد کے حصول کے سلسلے میں یہ کہتے ہیں:

"To eliminate corruption from all sectors of Pakistan by engaging the stakeholders of the society through purpose meant activities ie awareness, whistle blowing, prevention and enforcement through an approach which is forthe comprehensive, holistic and progressive and is meant reformation of societal fabric."

مئی، 2015 کی ایک شام ڈپٹی کمشنر آفس شیخوپورہ سے فون پر مجھے بتایا گیا کہ محترمہ کرن خورشید صاحبہ ڈی۔سی۔شیخوپورہ مجھے ضلعی کریکٹر بلڈنگ سوسائٹی میں شامل کرنا چاہتی ہیں۔

''مجھے کیوں؟ اور یہ کریکٹر بلڈنگ سوسائٹی کیا ہوتی ہے''؟ مَیں نے استفسار کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ نیب کا ایک مددگار ادارہ ہے اور اِس کا مقصد تو اس کے نام سے ظاہر ہے اور آپ کو اِس لیے شامل کیا جا رہا ہے کہ اِس اِدارے کو آپ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

الحفیظ، الامان ............ نیب ............ کریکٹر بلڈنگ؟ ............ قُربِ قیامت ہے! یہ کیا طُرفہ تماشہ ہے میرے اللہ! ............ میرے مالک! یہ میری سماعت کو کیا ہو گیا ہے؟

میں نے خود کو سنبھالا اور کالر سے گزارش کی کہ یہ کام میرے کرنے والا نہیں ہے۔ اس ضلع میں بل کہ شہر میں دانشوروں کی بہتات ہے۔ ہر اینٹ کے نیچے سے ایک راہنما برآمد ہوتا ہے، آخر میں ہی کیوں؟ کالر نے مجھے باور کرایا کہ نیکی کا کام ہے، مَیں ذرا سوچ لوں وہ کل پھر کال کریں گے۔ اور مَیں واقعتاً سوچ میں پڑ گیا۔

مجھے یاد آیا کہ جب 1999 میں مسلم لیگ ( ن ) کی حکومت نے واپڈا میں ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی تھی تو آئی۔ایل۔او کے دباؤ پر ملازمین کے مسائل کے حل کے لیے ہر ڈسٹری بیوشن کمپنی میں ایک نام نہاد لیبر اینڈ ویلفیئر کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔لیسکو میں اس کمیٹی میں سٹاف کی نمائندگی کے لیے مجھے رُکنیت بخشی گئی۔اس کے پہلے ہی اجلاس میں کچھ اہم امورزیرِ بحث آئے۔اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ واپڈا انتظامیہ Compensation Act اور کچھ دیگر قوانین صنعتی تعلقات کی غلط تشریح وتعبیر کررہی ہے۔مَیں نے ایک کیس کا ذکر کیا کہ ایک مہلک حادثہ (fatal accident) کے شکار لائن مین کے لواحقین کو معاوضہ (compensation) کی ادائیگی نہیں کی جارہی۔اجلاس کے صدر، کمیٹی کے سربراہ جو لیسکو کے چیف ایگزیکٹو اور حاضر سروس بریگیڈیئر تھے، کو شاید پتہ چل گیا کہ میرا اِشارہ کس طرف ہے۔اُنھوں نے کہا کہ کچھ لوگ سیفٹی قوانین یا کچھ دیگر قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مارے جاتے ہیں، اُنھیں معاوضہ کیوں دیا جائے؟ میرا تیر نشانے پر تھا۔مَیں نے جواب دیا کہ ''اُنھیں نہیں، اُن کے وارثان کو معاوضہ دینا ہے'' اوراس کی راہ میں کوئی قانون مانع نہیں تھا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' اُنھوں نے فرمایا۔

''نہیں جی! ایک نہیں، جدا جدا ہے ............ قانون کی منشا یہ ہے کہ مرنے والے کے جرم کی سزا اُس کے وارثان کو نہ دی جائے۔آپ Compensation Act پڑھ کر دیکھ لیجیے۔'' کمیٹی کے ایک دوسرے فاضل رُکن شبیر بٹ، ڈائریکٹر لیبر اینڈ ویلفیئر واپڈا، بہت نفیس انسان اور صنعتی قوانین کے ماہر تھے۔اُنھوں نے میرے مؤقف کی تائید کی اور یوں ایک مرحوم لائن مین کے ایسے خاندان کی اشک شوئی ہوگئی جو دیر سے ناسمجھی کے بے رحم شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔اس کے بعد دیے سے دیا روشن ہوتا گیا۔

بس یہی واقعہ تھا جس نے اگلے روز مجھے ڈی۔سی۔شیخوپورہ کے نمائندہ کو 'ہاں' کہنے پر مجبور کیا۔ اس کے چند روز بعد 8۔جون، 2015 کو ڈی۔سی۔شیخوپورہ کی جانب سے ایک نوٹیفکیشن جاری ہوگیا، جس میں یہ نیرنگ سازی میرے لیے باعثِ حیرت تھی کہ میں سوسائٹی کا رُکن نہیں بل کہ صدر تھا۔اس کی سرپرست حسبِ ہدایت نیب محترمہ کرن خورشید ڈی سی او شیخوپورہ اور سیکرٹری محترمہ نازیہ ممتاز ڈی۔ڈی۔او مرید کے تھیں۔اس کے علاوہ چار ممبرز مختلف شُعبہ جات سے تھے۔اِس 'عزت افزائی' کے چند روز بعد مَیں

نے سیکرٹری سوسائٹی اور نیب لاہور کے دفتر میں متعلقہ ڈائریکٹر صاحب سے رابطہ کیا۔ مجھے یوں لگا دونوں ہی فرما رہے تھے کہ تم بہت بھولے، بل کہ جاہل انسان ہو۔ ہَیہات، ہَیہَات! اِن کالز کے بعد مجھے ایک بار پھر واپڈا کی ویلفیئر کمیٹی کی رُکنیت یاد آ گئی کہ صاحبانِ اختیار نے کِس طرح عالمی اِداروں کی آنکھوں میں دُھول جھونکی اور دو اجلاسوں کے بعد ہی کمیٹی کو واصلِ جہنم کر دیا۔

چند ایّام کے بعد ہمیں شاید حلف برداری کے لیے لاہور بلایا گیا جس میں سی بی ایس کے ایک فاضل رُکن پروفیسر ڈاکٹر اکرم سعید صاحب نے اپنی حاضری یقینی بنائی لیکن میں نے معذرت کر لی۔ پروفیسر صاحب ایک طویل مدت تک یو۔ای۔ٹی لاہور میں ہونے والے اس جلسہ میں شرکاء کی تذلیل کی داستان مزے لے لے کر سناتے رہے۔ مَیں اکثر سوچتا ہوں کہ زبانِ خلق کا نقارۂ خدا ہونا بالکل سچ ہے۔ بھلا واپڈا کے انتہائی مصروف اور نیب کے اُن سے 'بہت زیادہ مصروف' ناخداؤں کے پاس ویلفیئر اور کریکٹر بلڈنگ کے لیے وقت کہاں؟ اِس سی بی ایس کی نام نہاد صدارت نے بہر حال مجھے ایک کالم لکھنے پر ضرور مجبور کیا، جو دو قسطوں میں مختلف اخبارات میں شائع ہوا، اور میری کتاب 'جو بچے ہیں سنگ' میں شامل ہے۔

**تیرے بغیر مسافتیں**: مئی 2019 کا آغاز ہو گیا تھا۔ رمضان میں چند ایّام باقی تھے۔ ایک روز فرحت (میری بیوی) نے ایمن (میری بیٹی) سے کہا کہ درزیوں کے بہت نخرے ہوتے ہیں، عید کے کپڑوں کا فائنل کر لو۔

''ٹھیک ہے امّی! چلو ابھی چلتے ہیں درزی کے پاس۔ کپڑے تو خرید رکھے ہیں''۔

پھر چند روز بعد فرحت نے تھوڑے فاصلے پر مقیم ایمن کو فون پہ کہا کہ ''میرے کپڑے درزی سے واپس لے آؤ۔''

''کیوں؟ واپس کیوں لے آؤں؟؟''

''ضرورت نہیں ہے ان کی۔ البتہ نیلے رنگ کا ایک سوٹ خرید کر سلوا دو۔ دیکھنا بس ایک نیلے سوٹ کی ضرورت ہے باقی کپڑے سلائی نہیں ہونے چاہئیں۔''

رمضان شروع ہو چکا تھا۔ ہر چیز حسبِ معمول تھی۔ فیوض و برکات سے میرا گھر بھی فیض یاب تھا۔ گھر کے ہر فرد

کے ہاں پورا اخلاص وتضرّع نظر آ رہا تھا۔ پریشان تھا تو صرف مَیں تھا۔ الٰہی! عید آ رہی ہے۔ میرے خاندان پر رحم فرمانا۔ اپنی عنایات کا سٹیرنگ وہیل اِسی طرح میری طرف گھمائے رکھنا۔ دل سے ہر لمحہ یہی دُعا نکلتی تھی۔ ایسے میں ایک روز فرحت نے ایمن سے کہا کہ میرا سوٹ درزی سے واپس لے آؤ، اس کی ضرورت نہیں رہی۔

فرحت کیا کہہ رہی تھی، سمجھ سے بالا تھا۔ سب کچھ تو ٹھیک ٹھاک تھا۔ کوئی بھی غیر معمولی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ اللہ کا کرم ہمیشہ کی طرح شاملِ حال تھا۔ فرحت پوری طرح ٹھیک تھی۔ شاید وہ کسی وسوسے کا شکار تھی یا شاید الہام کی شِدّت سے اُس پر یہ کیفیت طاری تھی، مَیں سوچتا رہا۔ اور یہ بھی کہ انسان کتنا بے بس ہے کہ اپنا دُکھ بھی کسی سے نہیں کہہ سکتا کہ لوگ مذاق بنائیں گے۔ مَیں پریشان ہوتا کہ انسان ہر لمحہ سمندر میں کشتی کی طرح موجوں کے رحم وکرم پر ہی کیوں رہتا ہے۔ اضطراب سوچنے کی صلاحیت بھی چھین لیتا ہے۔ اِرد گرد اہلِ بینش پر نظر دوڑائی، کچھ حاصل نہ ہوا۔ آدمی جس نے پرندوں کی طرح اُڑنا سیکھ لیا اور مچھلی کی طرح گہرے پانیوں میں غوطہ زنی سیکھ لی؛ آدمی جس نے پہاڑوں کو مسخّر کر لیا؛ آدمی جس کا خوردسال بچّہ عظیم الجثہ اور قوی ہیکل جانوروں کی لمبی قطار کو اپنی مرضی سے جدھر چاہتا ہے، موڑ لیتا ہے، آخر بے بس ہی نظر آتا ہے۔ کیا کیا جائے! میری ذات میں فرحت کے لیے بے پناہ مقناطیسیت تھی۔ مَیں اُس کے لیے خاوند سے کچھ زیادہ تھا، بل کہ 'کچھ' نہیں بہت زیادہ تھا۔ اُس کی ہر گردش کا محور میں ہی تھا۔ اُنسیت اور عقیدت کی اِس انتہا نے بعض اوقات کچھ مسائل بھی پیدا کیے لیکن چونکہ اُس کا جذبہ صادق اور متضرّع ہوتا تھا اِس لیے اللہ نے ازدواجی زندگی کے بڑے مسائل سے محفوظ رکھا۔ اِس رمضان المبارک میں وہ مجھ سے بیگانگی برتنے لگی اور بیٹی ایمن کے ساتھ گفت وشنید میں مصروف رہنے لگی البتہ سکول کے اوقاتِ کار کے بعد جب ایمن اپنے گھر چلی جاتی تو وہ مختصر سی بات چیت کرتی جس میں اپنائیت کا فقدان اور مایوسی کا اظہار نظر آتا۔ بس کچھ اِسی طرح کے حالات تھے کہ ایک روز اُسے اچانک قے آئی۔ اُسے ایمرجنسی میں لے جایا گیا تو اگلے روز اُس کی طبیعت سنبھل گئی۔ ہمیں بتایا گیا کہ چونکہ وہ خون پتلا رکھنے والی دوائی (Anti Coagulant) استعمال کرتی ہیں، اِس لیے کسی وین (vein) میں پنکچر کے بعد خون کا اجتماع ہوا جو اَب خارج ہو گیا ہے، لہٰذا خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اِس اطمنان کے بعد ہم فرحت کو

آ ئے۔موت اٹل حقیقت ہے لیکن DHQ ہسپتال میں پیشہ وارانہ ذمہ داری کا فقدان نہ ہوتا تو شاید نتیجہ کچھ مختلف ہوتا۔

وہ جمعۃ الوداع تھا۔مسجد سے گھر لوٹا تو فرحت کی طبیعت کی بے چینی عیاں تھی۔مَیں نے بلڈ پریشر چیک کیا تو وہ خوفناک حد تک ِگر چکا تھا۔اُسے گرم نمکین دُودھ دیا گیا اور فوری طور پر ایمرجنسی میں لے گئے۔راستے میں مَیں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ہسپتال سے ایمبولینس حاصل کر کے اُسے فوراً لاہور لے جانا ہے۔لہٰذا ایسا ہی کیا اور اُسے شیخ زید ہسپتال لاہور لے جایا گیا۔تدبیر اور تقدیر کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔عید سر پر تھی لہٰذا ہسپتال میں کوئی سینئر ڈاکٹر نہ مل سکا۔فیصلہ کیا گیا کہ فوری طور پر ڈاکٹرز ہسپتال پہنچا جائے۔فیصل (میرا بیٹا) اور عدیل (میرا داماد) فرحت کو ڈاکٹرز ہسپتال لے گئے اور مجھے ان دونوں کے کہنے پر میرا ایک کزن کاشف بھٹی اپنے گھر لے گیا۔کاشف بہت ملنسار اور محبت کرنے والا انسان ہے اور اس کی بیوی اُس سے بھی آگے ہے۔وہ دونوں مجھے تسلّی دیتے رہے کہ باجی ٹھیک ہو جائے گی، ان شاء اللہ۔پریشان نہیں ہونا۔

مَیں اُس رات بہت کرب میں تھا کہ فرحت مجھ سے چند میل دُور ڈاکٹرز ہسپتال میں پڑی مجھے ڈھونڈ رہی ہو گی۔دُکھ کے وقت مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھیں تھوڑی سی بھیگ جاتی تھیں۔آج رات بھی آنکھوں کا پانی بے تاب ہو رہا ہو گا لیکن میں تو اُس سے دُور تھا۔مَیں قیاس کر رہا تھا کہ دونوں بھائیوں نے مشاورت کی ہو گی کہ ابّو کو فوراً گھر بھیجا جائے۔ماں کو سنبھال لیں گے، ابّو نہیں سنبھالا جائے گا۔میں گھر سے باہر نہیں رہتا، لہٰذا اُس رات مَیں 'صدیوں' کے بعد اُس کے بغیر بستر پر تنہا تھا۔مَیں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اُسے ڈھونڈ رہا تھا۔کبھی اِدھر، کبھی اُدھر۔

تُو شریکِ سُخن نہیں ہے تو کیا
ہم سُخن تیری خامشی ہے ابھی

ایسی درد انگیزی اور ایسا اکلاپا! ...... یہ تو نہ دیکھا تھا کبھی۔راکبِ وقت نے زمامِ گردش کو کھینچ لیا تھا۔ 38 سال کی ازدواجی زندگی فاسٹ موو ہو رہی تھی۔کچھ ناگفتہ بہ سی کیفیت تھی۔اچانک آواز آئی:
''جاوید بھائی! چائے کا ایک کپ اور لے لیں، تھکاوٹ بہتر ہو جائے گی۔'' بیگم کاشف چائے پکڑے کھڑی تھی۔

مَیں نے چائے حلق میں اُنڈیلی اور اسمائے حسنیٰ کا وِرد شروع کر دیا۔ یہ شبِ وصل تھی یا ہجر سے دو چاری تھی، اُس رات سمجھ میں آیا اور نہ اُس کے بعد کبھی۔ مَیں نے بمشکل عشاء کے چار فرض ادا کیے۔ دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ لیکن بس ہاتھ ہی اُٹھے رہ گئے، زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا۔ مَیں نے فیصل جاوید کا فون ملایا۔ اُس نے فون نہ سُنا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی کال آئی کہ ''ابّو! امّی بات نہیں کر سکتیں۔''

نجانے اُسے کوئی الہام ہوا تھا یا اب وہ میرا مزاج شناس بن چکا تھا۔ لیکن یہ جملہ مجھ پر جہنم بن کر گرا۔

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا۔

مجھے یوں لگا کہ خضرِ عہد نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا ہے۔ مَیں نے اللہ سے مجادلہ کرنا چاہا کہ یہ دُکھ کی تخلیق کا مقصد کیا تھا تو مجھے موسیٰ کا وہ مکالمہ یاد آ گیا۔ جب اُس نے پاس سے گزرتی ہوئی چھپکلی سے کراہت محسوس کرتے ہوئے خالق سے سوال کیا تھا کہ اے اللہ! اِس کی تخلیق کا مقصد کیا تھا۔ تو تخلیق کرنے والے نے جواب دیا کہ مُوسیٰ! تعجّب ہے، ابھی ابھی چھپکلی پوچھ رہی تھی کہ اے خالقِ کائنات! یہ موسیٰ کی تخلیق کیوں ضروری تھی۔ اور موسیٰ خاموش ہو گئے۔ ہاتف نے کہا کہ ''یہ دُکھ نہ ہوتا تو سُکھ کا احساس کیسے ہوتا، یہ وصال و فراق کی ساری داستانیں دراصل دُکھ اور سُکھ کی ہی داستانیں ہیں۔ چشمِ نم آلود ہی چشمِ بینا بنائی جاتی ہے، یعقوب کو دیکھ لو۔ اسحاق سے پوچھ لو'۔ لیکن یہ سب اِتنی جلدی کیوں ہو گیا؟......

ہاتف نے کہا کہ ''نہیں، جلدی تو نہیں۔ بس ہنگامہ ہائے سود و زیاں نے تجھے ہوش نہیں آنے دیا۔''

مَیں خاموش بستر پر پڑا رہا۔ کاشف فیملی نے بھی شاید مجھے ڈسٹرب کرنا درست نہ جانا۔ میری خاموشی، زندانِ خاموشاں کے کسی مقیم سے ذرا مختلف نہ تھی لیکن اِس خامُشی کی آواز زبردست اور بعض اوقات بہت خوفناک ہوتی ہے۔ اُس رات بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ مَیں واپس ہسپتال جانا چاہتا تھا۔ فیصل کا نمبر ملایا اور خود ہی کاٹ دیا۔ بھلا وہ مجھے اِن حالات میں گھر سے نکلنے کی اجازت کیسے دے گا۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ لیکن مَیں نے سوچا کہ ہم سب مالک کے مطیع و منقاد ہیں۔ گھر سے نکلتا ہوں، مالک کو منظور ہوا تو ڈاکٹرز ہسپتال پہنچ جاؤں گا، ورنہ کسی بھی دوسرے۔ مَیں نے ذہن و جسم کی پوری توانائی استعمال کی لیکن بستر سے نہ اُٹھ سکا۔ فجر کے وقت فیصل کو فون کیا تو اُس نے بتایا کہ امّی کی طبیعت بہتر ہے۔

بہتر؟ ............ جھوٹ کہہ رہا ہے فیصل! مجھے تسلّی دے رہا ہے! مزاج شناس ہو گیا ہے نا! مَیں گفتگو کے دوران ہی سوچتا رہا کہ سایہ صرف بوڑھے برگد کا ہی نہیں ہوتا، دراز ٹاہلی کی چھاؤں بھی بڑی گھنی ہوتی ہے، اور ہوتی بھی ٹھنڈی ہے۔ پتہ نہیں ٹاہلی کیسے تیز دُھوپ لے کر بھی پانی سے بھیگے پتے اپنے وجود کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ فیصل اُس دراز ٹاہلی کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہے نا ...... ماں کے قریب ہے ۔۔۔ ماں کو بار بار دیکھ رہا ہو گا ............ اُس کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر اُس سے باتیں کر رہا ہو گا ...... اُس کا لمس اُسے سکون دے رہا ہو گا، اِس لیے مطمئن سا ہے۔ مَیں کچھ دُور ہوں اِس لیے اضطراب میں ہوں۔ مَیں نے وسواس و واہمہ سے نکلنا چاہا کہ فیصل ٹھیک ہی کہہ رہا ہو گا۔ فرحت ٹھیک ہو گی؛ بہتر ہو گی؛ آخر اِتنے بڑے ہسپتال میں زیرِ علاج ہے، کچھ تو علاج معالجہ ہوا ہو گا رات بھر! ...... فون بند ہو گیا۔ میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ ہاتف بار بار میری سماعت کو چھیڑ رہا تھا۔ مَیں کبھی بستر سے اُٹھتا اور کبھی لیٹ جاتا۔ دل تھا کہ کچھ سمجھنے ماننے کو تیار ہی نہ تھا۔ اِسی بے چینی میں اُٹھا اور ڈاکٹرز ہسپتال کی طرف چل دیا۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ تختِ بلقیس لانے والا باہر دروازے پر کھڑا ہو گا اور وہ آنکھ جھپکتے ہی مجھے ہسپتال پہنچا دے گا لیکن میں سُلیمان نہیں تھا۔

ہسپتال میں بچّے چھوٹی سی، بے ہودہ سی اذیت ناک انتظار گاہ میں یوں بیٹھے تھے جیسے آج کی صبح اُن سے زیادہ بے یار و مددگار کوئی ذی رُوح نہ ہو گا۔ مَیں نے بچّوں کا حال چال پوچھا نہ فرحت کا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے پوچھیں کہ ''ابّو! آپ کا کیا حال ہے'' اور مَیں جواب میں سچ بول دوں، جھوٹ کی رتی بھر ملاوٹ کے بغیر ............ پورا سچ ............ سو فیصد سچ ............ زندگی میں پہلی بار، لیکن شاید اُنھیں بھی میرے حال کی خبر تھی۔ ہفتہ سے منگل تک کے ایّام بھی اسی ویٹنگ ایریا اور چھوٹی بہن کے گھر میں گزر گئے۔ رات ہوتی تو فیصل مجھے ہدایت کرتا کہ ابّو! آپ پھوپھو کے گھر چلے جائیں۔ یہ پھوپھو ماضی میں بھی تلخ اوقات میں میری خدمت گر رہی اور فرحت کی بیماری کے دوران بھی اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

**آج عید ہے:** آج عیدالفطر ہے۔علی الصبح بہن کے گھر سے اُٹھ کر ہسپتال پہنچ گیا ہوں۔ ہاتف آواز دے رہا تھا ''نہ جاؤ............ تہی دامنی ہے تیرے مقدّر میں''۔

''کون ہو تم؟ سامنے تو آؤ۔ کیوں نہ جاؤں؟ میں پوچھ رہا ہوں۔

''کہا ہے نا کچھ نہیں ہے وہاں''

''نہیں، مجھے جانا ہے ............ اور ہاں تم کیوں مجھے روک رہے ہو؟''

''حکم کی تعمیل کر رہا ہوں اور سُنو! تم آدم زاد تو ہوتے ہی باغی ہو ............ تمھیں معلوم ہے آدم کے بیٹے نے بھائی کی نعش ٹھکانے لگانا کہاں سے سیکھا تھا؟ مَیں نے سکھایا تھا اُسے اور تمھیں بھی ٹھیک مشورہ دے رہا ہوں۔''

اور مجھے جلال الدین رُومی یاد آ گئے ہیں:

کندن گورے کہ کمتر پیشہ بود　　کے زفکر و حیلہ و اندیشہ بود

لیکن مجھے فرحت کے پاس آنا تھا سو پہنچ گیا ہوں۔ مَیں نے ہاتھ میں اپنی تالیف 'ربِّ رحیم' تھامی ہوئی ہے۔ اسی طرح فرحت کے کمرے میں گیا ہوں اور اب ویٹنگ ایریا میں 'ربِّ رحیم' سے مختلف آیات با آوازِ بلند تلاوت کر رہا ہوں۔ لوگ خاموش ہو گئے ہیں، شاید تلاوتِ قرآن کے احترام میں۔ اچانک آواز آتی ہے، فرحت جاوید کے ساتھ کون ہے؟ میمونہ میری طرف دیکھتی ہے۔ مَیں بھاگ کے اندر جاتا ہوں۔ ایک پروفیسر صاحب نہایت مؤدبانہ انداز میں السّلامُ علیکم اور عید مبارک کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ فرحت کی زندگی بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ ہاتف کی آواز آتی ہے، ''جملہ عسیر الفہم ہے نا؟'' ............ نہیں تو، میں سوچتا ہوں۔ میں ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور تقدیر کی نیرنگ سازی پر خندہ زن باہر آ جاتا ہوں۔

سامنے میرا بھتیجا عمر الیاس کھڑا ہے۔ عمر بہت نفیس، محنتی اور سیانا لڑکا ہے لیکن عید کے روز یہ یہاں کیسے؟............ دوستی کے پیچھے دُکھوں کی سانجھ ہوتی ہے یا مفادات کی، یہ رِشتے وِشتے تو بس یونہی ہیں۔ میں اس کے ایک دُکھ میں ساجھے دار رہا ہوں لیکن لوگ تو بھول بھال جاتے ہیں، یہ کتنا اچھا ہے کہ عید چھوڑ کے ہسپتال آ گیا ہے۔

''چاچو! آؤ کچھ کھا پی کے آتے ہیں۔'' عمر کہہ رہا ہے۔

جانا چاہیے، صبح سے بھوکا ہوں۔ جو لکھا گیا ہے وہ تو کالنقش فی الحجر ہے۔ میری حالت بارش کے چھانڈے میں بھیگی اور جاں بلب چڑیا سے ذرا مختلف نہ ہے لیکن ہم لفٹ کی طرف بڑھ رہے، ہسپتال کی پانچویں منزل سے نیچے جانے کے لیے ............ پانچویں منزل؟ ہاں پانچویں منزل ہی تو تھی۔ دو تو شکمِ مادر میں طے ہوئیں، تیسری پیدائش، چوتھی زندگی اور پانچویں ............

''عمر! یہ دُنیا بھی پریم نگر ہے، ورنہ چاند، چاند نہ رہتا اور چکور، چکور نہ رہتی...... ہے نا؟

''جی چاچو'' ............ وہ شاید کچھ سمجھ نہیں پایا۔

ہم ہسپتال کے مین گیٹ کے بالکل سامنے کیک اینڈ بیک بیکری پر آ گئے ہیں۔ باہر سورج دن چڑھتے ہی قہر برسا رہا ہے۔ شدید گرمی ہے آج، عمر کا خیال ہے کہ بیکری کے اندر کھڑے کھڑے ہی کچھ کھا لیا جائے۔ مَیں بل کی ادائیگی کے لیے کاؤنٹر کی طرف بڑھتا ہوں۔ ایک صاحب نے ایک ہاتھ میں بچے کی انگلی تھامی ہوئی ہے اور دوسرے ہاتھ سے فون کان سے لگا رکھا ہے۔

''ہاں ہاں، نمازِ عید سے فارغ ہو گئے ہیں۔ واپس آ رہے تھے۔ یہ تمھارے لاڈلے نے بیکری پہ روک لیا ہے۔ بس تم کھانا تیار کرو، ہم چند منٹ میں آئے۔''

مَیں سوچ رہا ہوں کہ یہ آنے اور جانے میں چند منٹ ہی کیوں لگتے ہیں۔ میں عمر کو اِشارہ کرتا ہوں کہ آؤ چلیں۔ اپنا ناشتہ، ناشتہ نہیں، توشۂ عید تھامے سڑک پار کرتے ہیں اور ڈیوائیڈر پر ایک چھوٹے سے، صرف قدِ آدم درخت کے نیچے سائے میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ توشہ تو حلق سے نیچے نہیں اُتر رہا۔ چلیے ڈیوائیڈر پہ پھینک دیتے ہیں۔ نمازِ عید سے فارغ ہو کر لوگ گھروں کو جاتے کتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔ خوب صورت، نئے لباس اور بعض کے سروں پر ٹوپیاں کتنی بھلی لگ رہی ہیں۔ سامنے بیکری پر رش بڑھ گیا ہے؛ پارکنگ تنگ پڑ گئی ہے، لیکن لوگ سروس روڈ کو جائے پناہ بنا رہے ہیں۔ اس بیکری کی پہلی برانچ سمن آباد میں بنی تھی، جب میجر ثاقب نے اس کی تعریف کے پُل باندھے تو عید پر مَیں فرحت اور بچوں کو لے کر ادھر پہنچ گیا تھا۔ گاڑی کی ڈِگی بھر لی تھی فرحت نے لیکن وہ خریداری کیے جا رہی تھی۔

مَیں ابھی فرحت کے لیے کوئی کیک خرید نہ لوں، سوچ ہی رہا ہوں۔ ہاتف نے کہا ہے احمق نہ

بنو۔ جو عازمِ سفر ہوا سو ہوا۔ منفی اور غیر منطقی باتوں کے لیے کتنی آوارہ گردی کرو گے؟

میں نے مجادلہ شروع کر دیا ہے۔ آدم کی سُنی گئی تھی نا جب اُس نے رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (الاعراف:23) پڑھا تھا۔ یعقوب کی سُنی گئی تھی نا جب اُس نے کہا تھا اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ (یوسف:86)۔ ایوب کی سُنی گئی تھی نا جب اُس نے پکارا اپنے ربّ کو کہ مجھ پر پڑی ہے تکلیف اِذْ نَادیٰ رَبَّہٗ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّر (انبیاء:83) اور کیا یونس کی نا گفتہ بہ رہ گئی تھی؟ پکارا تھا نا اُس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (انبیاء:87)۔ سب کی قبول ہوئی، میری کیوں نہیں؟

''چالاک نہ بنو، مرضی اُسی کی چلے گی ...... نوح کو بیٹے سے محبت نہ تھی؟ لوط کو بیوی واعلہ سے پیار نہ تھا؟ ابراہیم کو باپ سے عقیدت نہ تھی؟...... کیا اُن کی مانی گئی؟''

''لیکن یہ جن کی طلب کی گئی یہ سب تو اُس کی سلطنت کے باغی تھے۔ میرا جُرم کیا ہے؟'' ہاتف خاموش ہے۔ مَیں اور عمر پسینے میں شرابور، گاڑیوں کا دُھواں پھانکتے، کچھ دھوپ اور کچھ سائے میں کھڑے ہیں۔ عمر کا خیال ہے کہ کافی دیر ہوگئی ہے، ویٹنگ روم میں جانا چاہیے۔ ہم واپس آ گئے ہیں۔ مَیں 'ربِّ رحیم' میں شامل رحمت و رافت پر مبنی تمام آیات با آوازِ بلند پڑھ رہا ہوں۔ لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ مَیں نے کتاب بند کر دی ہے۔ آدمؑ، یعقوبؑ، ایوبؑ، یونسؑ اور آقا محمدؐ کا واسطہ دے رہا ہوں کہ اللہ! تُو تو مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، فرحت تو ابھی زندہ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا ہے مانیٹر اُس کی زندگی کی خبر دے رہا تھا۔

میری توجّہ اب گھر کی جانب ہے، نجانے کیوں؟ اِتنے دن تو گھر کا خیال نہیں آیا! مین گیٹ کے باہر بڑا سا تالہ نظر آ رہا ہے۔ تاریخ میں پہلی بار میرے گھر کو تالہ لگا ہے اور وہ بھی عید کے روز! الٰہی یہ امتحان کب ختم ہوگا؟ کیا میں یعقوبؑ، اسحاقؑ اور ایوبؑ کی طرح رو نہیں سکا؟ ہاتف کا جواب کسی غیر متعین اور گنجلک شعر کی طرح ہے۔ کیا کروں؟ ........... روزِ عید تمام ہوا ........... رات ہوگئی ہے ........... رات زیادہ بیت گئی ہے۔ فیصل ہمیں گھر جانے کی تاکید کر رہا ہے۔ مَیں، میمونہ، ارحم، ایمن اور موسیٰ کو لیے بہن کے گھر پہنچ گیا ہوں۔ ہسپتال کی ذمہ داری فیصل اور عزیزی عدیل نے لے لی ہے۔ فیصل آج کچھ پریشان نظر آ رہا تھا لیکن عدیل کا حوصلہ جوان تھا۔ رات بیت گئی ہے۔ مَیں نمازِ فجر پڑھ کر ابھی جائے نماز پر

ہوں۔ارحم اُٹھتا ہے۔ماں سے کچھ کہا ہے اُس نے۔میں تسبیحات میں مصروف ہوں۔ایک تھپڑ کی آواز آتی ہے اور ارحم رو رہا ہے۔

''میمونہ! کیوں مارا ہے اِسے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ابّو! یہ کہہ رہا تھا آج ہمارے گھر سے جنازہ اُٹھے گا''

ارحم کی عمر تو ابھی پانچ سال ہے۔اِس بیچارے کو کیا معلوم کہ جنازہ کیا ہوتا ہے! ہاں ہاتف نے رُوٹ بدل لیا ہو گا۔اُسے معلوم ہے یہ خبر کوئی دوسرا برداشت نہیں کر پائے گا۔مَیں میمونہ کی کِسی بات کا جواب دیے بغیر ارحم کو چپ کرا رہا ہوں۔من میں یہ بات بھی ہے کہ تیاری کرنی چاہیے، ارحم نے وقت تو نہیں بتایا۔

ہم ہسپتال پہنچ گئے ہیں۔فیصل اور عدیل کی بے چینی دیدنی ہے۔مَیں نے یا میمونہ نے ارحم کی دی ہوئی اطلاع انھیں نہیں پہنچائی۔مَیں آیاتِ قرآنی کی تلاوت کر رہا ہوں۔10 بج چکے ہیں۔میرا اضطراب بڑھ رہا ہے۔مسافت جاری ہے ...... مسافرت بے بس ہے ...... یہ سفر کی موت اور موت کا سفر بے بس تو کر دیتے ہیں، لیکن فیصلہ تو ہو چکا، میری بے بسی کون دیکھتا ہے: نہ کوئی خضر نہ اِبنِ مریم۔مجھے اپنے انجام سے وحشت ہو رہی ہے ...... ایک گوہرِ نایاب، ایک دُرِّ مکنون ...... پاؤں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے۔

''فرحت جاوید کے ساتھ؟'' اچانک اندر سے آواز آئی ہے۔

مَیں کمرے میں پہنچ گیا ہوں۔ایک ڈاکٹر صاحبہ اور ایک نرس فرحت کے پاس کھڑے ہیں۔ڈاکٹر کاغذ کی لمبی پٹی ای۔سی۔جی مشین سے کھینچ رہی ہے۔میری نظر مسلسل مانیٹر پر ہے۔اب ڈاکٹر کاغذی پٹی کو بغور دیکھ رہی ہے۔اب اُس نے نہایت افسردگی کے عالم میں کاغذ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر میری آنکھوں کے سامنے کر دیا ہے ............ سیدھی لکیر ............ بغیر کسی اونچ نیچ کے ...... میری زبان سے بے ساختہ نکلتا ہے: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔اب فلک شگاف چیخوں نے مجھے پیچھے دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔یہ میمونہ ہے جو پاگلوں کی طرح پاؤں زمین پر پٹخ رہی ہے۔اس کی حالت غیر ہو گئی ہے۔پورا ایمرجنسی وارڈ اس کی طرف متوجّہ ہے۔باہر ایمن، فیصل اور عدیل کو بھی خبر ہو گئی ہے۔سب آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔دل کرچی کرچی ہیں............ روحیں مضطرب ہیں ............ یہ کیا ہو گیا: ............ یہی ہونا تھا ...... یہ ہو گیا ہے، یہ تو ہو کے رہتا ہے۔

آج چار برس کے بعد 2023 میں 2019 کی ڈائری کھول کر 6۔ جون کا ورق دیکھ رہا ہوں۔اس پر لکھا ہے:

''اِنَّا للّٰہ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ

اور وہی ہوا۔دُنیا کی تقریباً سوا تین ارب خواتین میں سے سب سے خوب صورت اور سب سے اہم خاتون آج مجھے اکیلا چھوڑ گئی ہے۔38 سال کی ازدواجی زندگی اور چار عشروں کی دوستی یکدم ماضی کا حِصّہ بن گئی۔اللہ اُسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں

تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے''

# فرحت جاوید کا سفرِ آخرت:

ہمارے شیخوپورہ پہنچنے سے پہلے مساجد میں اعلان ہو چکا تھا کہ فاطمہ میموریل اسلامک سکول کی پرنسپل داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئی ہیں۔فیصل ایمبولینس میں تھا۔میری گاڑی عدیل چلا رہا تھا۔بچے میرے ساتھ تھے۔شوکت علی روڈ ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔اسکول اور گھر کے باہر احباب کا اجتماع تھا۔دِن ڈھل رہا تھا۔شام ہو رہی تھی، بلکہ 'ہو چکی تھی'...... فرحت آگے چلنے کے لیے دم لے رہی تھی۔میں اسکول کے باہر دوستوں کے درمیان بیٹھا تھا۔گھر کے باہر فرحت کے گرد خواتین کا ایک بڑا اجتماع تھا۔اب اگلی منزل کی تیاری تھی۔ہاتف نے کہا کہ مِل لو فرحت سے۔مجھ میں اُٹھنے کی سکت نہ تھی۔اچانک فیصل کہیں سے نمودار ہوتا ہے۔میرا بازو پکڑ کر مجھے اُٹھاتا ہے اور ماں کی چارپائی تک مجھے سہارا دیے رکھتا ہے۔

واہ، کیا عجیب سماں تھا فرحت کے اِرد گرد۔جون کی شدید گرمی میں ٹھنڈک کا احساس تھا۔کوئی غیر مرئی طاقت سایہ فگن تھی۔بادل زمین کی طرف جھک رہے تھے۔ایک غیر مانوس سی خوشبو ہر سُو پھیل چکی تھی۔رخصت کرنے والے تیار تھے تو استقبالیہ بھی تیار تھا۔عجیب سماں تھا۔ایسا سُنا تو تھا لیکن کبھی دیکھا نہ تھا۔سچ مُچ میں امانت کے وصول کنندگان پوری تیاری سے موجود تھے ............ ''اجازت ہے جی؟'' کسی بھائی نے مجھ سے پوچھا، اور پھر میرا جواب سُنے بغیر اَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشۡھَدُ اَنَّ مُحَمَّدً عَبۡدُہٗ وَ رَسُوۡلُہٗ

کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ایک سفر ختم ہوا؛ دوسرا شروع ہوا، اگلی منزل کی طرف ............ اگلی منزل کی طرف ............ منزلِ مقصود کی طرف ............ مجھے پھر رومی یاد آئے جو سمجھتے ہیں کہ نہ خزاں مخالف بہار ہے اور نہ مرگ مخالفِ زندگی۔وہ فرماتے ہیں کہ:

''موت وحیات، بہار وخزاں، وجود وعدم محض ہماری نظروں کا دھوکا ہیں۔ظاہری تبدیلیوں کو افسردگی کی وجہ نہ بناؤ۔جو بظاہر مٹتا ہوا نظر آتا ہے، وہ درحقیقت مِٹتا نہیں ہے۔

ہر صورتے کہ دیدی ہر نکتہ کہ شنیدی
بدل مشو کہ رفت آں زیرانہ آنچناں است

ہاں رومی نے سچ کہا ...... وہ سچ ہی کہتے تھے،لیکن مَیں تو تنہا ہو گیا ...... نہیں کچھ غلط ہو گیا، لفظ تنہا کا میری کیفیت پر اطلاق نہیں ہوتا۔یہ لفظ میری حالت کا ترجمان ہو ہی نہیں سکتا بس یوں سمجھیئے کہ اضطراب نے مجھے پاگل پن کی حدوں تک پہنچا دیا۔وہ فرحت جس کے لباس کی ہر اپنا بیگانہ تعریف بلکہ نقالی کیا کرتا تھا، اُسے خوب صورت سفید لباس میں منوں مٹی تلے دبا دیا گیا۔قبرستان میں میری جس طرف نظر اُٹھتی تھی، ہر کوئی مجھے دیکھ رہا تھا۔مجھے کیا ہے؟ سب اَعِزّ اء واقرباء کی نظریں میری ہی طرف کیوں ہیں؟ مَیں فرحت کے پاؤں کی طرف کھڑا سوچتا اور احباب کو دیکھتا رہا۔قبر کے سرہانے برادرِ عزیز ڈاکٹر اکرم سُرا نہایت افسردگی کے عالم میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔وہ کچھ پڑھ رہا تھا۔پھر اُس نے شاید فیصل کو اِشارہ کیا جس نے میرا بازو پکڑا اور اپنی دانست میں مجھے رنج واَلم کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالنے کے لیے میرا رُخ گھر کی طرف موڑ دیا۔یہ موڑ مُڑتے ہی اکلاپا اپنی انتہا پر پہنچ گیا۔محبت مرگئی؛ زندگی دفن ہو گئی؛ سہارا کہیں سدھار گیا اور لمحاتِ مسرّت اجنبی ہو گئے۔بقول ایمن:

| | |
|---|---|
| میں تھا زندہ، تیرے دم سے گھر مِرا آباد تھا | غم سے تھا نا آشنا ، ہر رنج سے آزاد تھا |
| آہ! غالب تھی کشش حورانِ جنت کی مگر | اپنی اِک ہم جنس مجھ سے لے گئی ہیں چھین کر |
| موت کے خاموش بم میں کوئی زیر و بم نہیں | کب یہ پھٹتا ہے کہیں، آگاہ اِس سے ہم نہیں |
| رہ گئی احباب کے دل میں ہے تیری یاد دیکھ | گھر تِرا جانے سے تیرے ہو گیا برباد دیکھ |

لیکن یہ جانے والی بات بھی کچھ غلط سی لگتی ہے۔فرحت اُس روز سے آج تک میرے گھر میں، بلکہ میرے

کمرے میں موجود ہے۔ اُسے رُخصت ہوئے چند ہفتے بیت چکے تھے کہ ایک روز امورِ خانہ داری میں میری مددگار خاتون نے آلو گوشت کی ہنڈیا تیار کی۔ وہ سالن اِتنا بدذائقہ اور بدصورت تھا کہ پہلے ہی لقمہ سے میں کھانے سے تائب ہو گیا۔ مَیں کھانا چھوڑ کر ابھی کُرسی سے اُٹھ ہی رہا تھا تو فرحت میز پر میرے سامنے تھی۔ کہنے لگی، ''بھوکے رہو گے، جیسا ہے کھالو۔ بس ایسے ہی گزارا کرنا ہو گا اب۔'' فرحت رُخصت ہوئی تو میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ چند لقمے لیے اور الحمدللہ کہا۔

سائنس اور نفسیات کے ماہرین اِس حوالے سے بہت سے نظریات پیش کرتے ہیں جو ہمارا موضوع نہ ہے۔ مَیں نے اس بہت بڑی بات کو اِس لیے نظر انداز کر دیا کہ اِس کا ذکر بے فائدہ اور بے کار ہوتا۔ اسے شدید صدمے کا نتیجہ یا میری ذہنی حالت کا فتور قرار دیا جاتا جو میرے دُکھ میں بڑھاوے کا باعث بنتا۔ اس کے چند روز بعد سہ پہر کے وقت مَیں اپنے کمرے میں، اور فیصل اور میمونہ ملحقہ کمرے میں موجود تھے۔ اچانک کمرے میں وہی غیر مانوس سی خوشبو پھیل گئی جو فرحت کے سفرِ آخرت کے وقت محسوس ہوئی۔ میں تھوڑا سا متوجہ ہوا تو فرحت دروازے میں کھڑی تھی۔ مَیں نے فیصل اور میمونہ کو جلدی سے آواز دی تو دونوں نے بیک وقت کہا کہ ابّو! ہمیں پتہ چل گیا ہے۔ فرحت پہلے اُنھیں مل کر ہی میری طرف آئی تھی۔ پھر وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ ہم سب اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے لیکن کسی میں جُرأت نہ تھی کہ ڈرائنگ روم تک اُس کا پیچھا کرتے اور دیکھتے کہ وہ بند دروازے سے کیسے گزرتی ہے۔

اِس واقعہ کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ فرحت کو بار بار اپنے گھر میں دیکھنا کوئی میری ابنارمیلیٹی نہ ہے بل کہ یہ ایک زبردست حقیقت ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود رہتی ہے۔ جب اُسے اجازت ملتی ہے وہ آجاتی ہے اور اپنے پیاروں کو ملنے کے بعد یا کوئی خاص بات کرنے کے بعد رُخصت ہو جاتی ہے۔ مَیں نفسیات اور دینیات کا طالب علم رہا ہوں اور یہ دونوں مضامین اب تک میرے زیرِ مطالعہ ہیں۔ اِن حالات میں مَیں نے اپنے مطالعہ کو تحقیقی انداز میں وسعت دینا چاہی تو مجھے خوف محسوس ہوا کہ میں اپنے تجربات و مشاہدات کو قلم بند کروں گا تو ہدفِ تنقید بنوں گا۔ لہٰذا یہ سعیِ لاحاصل ہو گی۔ لیکن ہوا یہ کہ دورانِ مطالعہ 'غُنیۃُ الطَّالِبِین' میں ایک دلچسپ چیز میرے سامنے آئی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن ادہم سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ دُنیا میں کبھی خوش بھی ہوئے ہو۔ حضرت نے جواب دیا کہ

ہاں دو دفعہ خوش ہوا ہوں۔ پہلی بار اُس وقت جب مَیں کہیں بیٹھا تھا کہ ایک کتا آیا۔ اُس نے ٹانگ اُٹھائی اور مجھ پر پیشاب کر دیا۔ دوسری بار اُس وقت جب ایک شخص نے مجھے (بلا وجہ) گھونسہ رسید کیا۔

سو مَیں اِس فکر سے آزاد ہو گیا اور سنجیدگی سے مطالعہ کو تحقیقی انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے اِس سلسلے کی سب سے معتبر اور شہرہ آفاق کتاب، حافظ اِبنِ قیم کی 'کتاب الرّوح' کو ایک بار پھر حرف بحرف پڑھا اور اِس نتیجہ پر پہنچا کہ جس طرح بقیدِ حیات بندگانِ خدا کی کرامات ہمارے سامنے آتی ہیں اِسی طرح ارواح کی بھی کرامات ہو سکتی ہیں۔ دونوں ہی صورتوں میں اللہ کی رضا اور عنایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت عبدالرّحمٰن جامیؒ کی 'نفحات الأنس' کے مطالعہ کے دوران شرفِ آدم اور کراماتِ اولیاء کے وہ بھید کھلے کہ انھوں نے دُنیا بدل کے رکھ دی۔

قارئین! ایک بندۂ خدا ایک لمحے میں تختِ بلقیس کو اُٹھا کر لا سکتا ہے تو کوئی دوسرا آدم زاد بھی ایسا کر سکتا ہے۔ حضرت جعفر طیار کو طیّار اِسی لیے کہا گیا کہ اُنھیں دُنیا سے رُخصت ہونے کے بعد فرشتوں کے ساتھ اُڑتے دیکھا گیا۔ اور دیکھنے والی ہستی کون تھی؟ ایسی ہستی جس کی زبان سے حق اور سچ کے علاوہ کچھ نکلنے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُڑتے ہوئے سیدنا طیّارؓ نے آقاؐ کو السّلام علیکم کہا اور آپؐ نے وعلیکم السّلام کہا۔ سلام عرض کرنے کی طاقت اللہ کی عطا اور سُننے والا، عطا کرنے والے کا محبوب۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مقناطیس جتنا بھی بھاری اور طاقت ور ہو وہ کسی ایسی چیز کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکے گا جس میں اللہ نے کھنچے جانے کی صلاحیت نہ رکھی ہو۔ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔

مَیں نے 'کشف المحجوب' میں پڑھا کہ ''نزدیک و قرب جس طرح دوری کی طاقت نہیں رکھتا، اسی طرح دُوری بھی نزدیک و قرب کی برداشت نہیں رکھتی۔'' سیّدِ ہجویرؒ لکھتے ہیں کہ ''اسے اِس طرح سمجھو کہ وہ کیڑے جو سرکہ میں پیدا ہوتے ہیں اگر اُنھیں سرکہ سے نکال کر کسی اور چیز میں ڈال دیں تو وہ مر جاتے ہیں یا وہ کیڑے جو کہیں اور پیدا ہوئے ہوں، اگر اُن کو سرکہ میں ڈال دیا جائے تو وہ مر جائیں گے۔ اِسی طرح حقائقِ اشیاء کے معنی اُسی پر کُھلتے اور منکشف ہوتے ہیں جس کو خاص اِسی لیے پیدا کیا گیا ہو۔ ماسوا کے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔''

اب ہم درایں سلسلہ افکارِ غزالی کی طرف بڑھتے ہیں۔ امام ابو حامد محمد غزالی کوئی ایسی شخصیت

نہ تھے کہ بس مسلّمات کو مسلّمات مان لیتے۔ وہ علم کے لیے حواس جیسے یقین افروز ذرائع پر بھی پورا اعتماد نہیں کرتے۔ اُن کا خیال ہے کہ قوتِ بصارت سے بڑھ کر کوئی حاسہ نہیں ہے جس کے نتائج پر یقین کیا جا سکے مگر اس کی بیچارگی اور درماندگی کا یہ حال ہے کہ سایہ کو جو مسلسل حرکت کر رہا ہے، ساکن بتاتا ہے اور ایک ستارہ کو جس کا حجم پورے کُرّۂ ارض سے بھی زیادہ ہے، ایک دینار جتنا دکھاتا ہے۔ امام کا مکاشفہ تھا کہ زبانِ حال تمثیل کے طور پر مشاہد اور محسوس ہوتی ہے اور یہ انبیاء و رُسُل کا خاصہ ہے۔ جس طرح زبانِ حال نیند کی حالت میں عام لوگوں کو محسوس صورت میں نظر آتی ہے، پیغمبران اور اولیاء اللہ کے لیے حالتِ بے داری میں عالمِ غیب کے حقائق متمثّل اور مصوّر ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

تخاطبہم ھذہِ الاشیاء فی الیقظة

(یہ چیزیں بیداری کی حالت میں اُن سے باتیں کرتی ہیں)

اب امام صاحب کی کتاب 'المنقذ عن الضّلالہ' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''تمام علائق وشہوات سے انقطاع کے بعد روح کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اِس کا علم نہ کسی تحریر سے ہو سکتا ہے اور نہ کسی تقریر سے۔ فقط پارسائی میں ترقی کر کے خاص طریقوں سے ایک خاص حال تک پہنچنے کے بعد ہی انسان اِس حقیقت سے آشنا ہو سکتا ہے۔''

''(انسان کی) انتہائی منزلِ مقصود کلیۃً خدا کے اندر جذب ہو جانا ہے۔ اِس سے پہلے تمام وجدانات و احوال داخلے سے قبل محض دہلیز کی طرح ہیں۔ ابتداء ہی سے عجیب انکشافات شروع ہو جاتے ہیں۔ بیداری میں ہی ملائکہ اور انبیاء کے ارواح نظر آنے لگتے ہیں۔ صوفیاء ان کی آوازیں سُنتے اور ان سے برکات حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد روح صورتوں کے ادراک کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے اور ایسی حالت میں پہنچ جاتی ہے، جو بیان میں نہیں آ سکتی۔ اگر کوئی شخص بیان کرنے کی کوشش کرے تو لازمًا اُس کے الفاظ میں کفر و گناہ کا انداز پیدا ہو جائے گا۔''

اِسی طرح کا خیال معروف امریکی شاعر ہنری ورڈز ورتھ لانگ فیلو (Henry Wardsworth Longfellow, 1807-1882) نے ظاہر کیا ہے جو میرے

خیال میں قرآن، رومی اور غزالی سے مستعار شدہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

Tell me not, in mournful numbers,
Life is but an empty dream!
For the soul is dead that slumbers,
And things are not what they seem.
Life is real! Life is earnest!
And the grave is not its goal;
Dust thou art, to dust returnest,
Was not spoken of the soul.

ہمیں اس کے یہ دو مصرعے ایک بار پھر پڑھنا ہوں گے:

And things are not what they seem.
And the grave is not its goal;

اور اِس کے بعد غالب کا یہ شعر پڑھ لیں:

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اب ہم مولائے روم جلال الدین رومی سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ قائل ہیں کہ جب قلب محلِ وحی ہوتا ہے تو وہ اپنی ملکوتی قوت کو متمثل کر کے پیش کرتا ہے نہ کہ کوئی دوسری طاقت پیغام رسانی کرتی ہے۔ جس طرح خواب میں انسان کسی شخص کو دیکھتا ہے اور اُس سے بات چیت کرتا ہے، حالانکہ وہ شخص اس وقت اور اُس جگہ پر نہیں ہوتا جو خواب میں نظر آتی ہے، خواب میں دل ہی اپنے افکار اور تأثرات کو تمثیلی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اسی طرح بے داری میں بھی یہ سب کچھ عین ممکن ہے۔

چیز دیگر ماند اما گفتنش     با تو روح القدس گوید، نے منش
نے تو گوئی ہم بگوش خویشتن     بے من و بے غیر اے من ہم تو من
ہم چو آں وقتے کہ خواب اندر روی     تو زپیش خود بہ پیش خود شوی

بشنوی از خویش و پنداری فلاں       یا تو اندر خواب گفت است آں نہاں

اِن اشعار کی تشریح میں مولانا عبدالعلی بحرالعلوم اور مولانا شبلی کہتے ہیں کہ رسولوں کو جو جبرائیل کی صورت نظر آتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اُنھیں خدا کا پیغام پہنچا رہی ہے، وہ حقیقتِ جبرائیلیہ خود رسولوں کی روحانی قوت میں سے ایک قوت ہے۔ عالمِ مثال میں یہ حقیقت ایک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حقیقت جو رُوحِ نبوی میں مکنون اور مخفی ہوتی ہے، وہ متمثّل اور مشہود ہو جاتی ہے اور پیغامِ حق پہنچاتی ہے۔ رسول کسی دوسرے سے نہیں بل کہ خود اپنی ذات سے مستفیض ہوتا ہے۔ رسول جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے وہ اُس کے اپنے باطن کے خزانے سے نکلتا ہے۔

اب ہم Reconstruction of Religious Thoughts in Islam کی طرف بڑھتے ہیں۔ حضرتِ اقبالؒ کے چوتھے خطبہ The Human Ego-His Freedom and Immortality سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ بقائے دوام انسان کا حق نہیں ہے لیکن یہ عین ممکن ہے۔ فرماتے ہیں:

Personal Immortality, then, is not ours as of right; it is to be achieved by personal efforts.

(لہٰذا بقائے دوام انسان کا حق نہیں۔ اس کے حصول کا انحصار ہماری ذاتی سعی اور جدوجہد پر ہے)

اِسی خطبہ سے ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"The analogies of the Quran only suggest it as a fact; they are not meant to reveal its nature and character. Philasophically speaking, therefore, we cannot go farther than this-that in view of the past history of man it is highly improbable that his career should come to an end with the dissolution of his body."

(قرآن مجید نے اِس سلسلے میں جن مماثلتوں کی طرف اِشارہ کیا ہے، ان سے مقصود صرف یہی ظاہر کرنا

ہے کہ بعثتِ ثانیہ ایک حقیقت ہے، یہ نہیں کہ اِس کی ماہیت کیا ہے۔ لہٰذا جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے ماضی پر غور کریں تو یہ کہنا انتہائی غیر مناسب نظر آتا ہے کہ اس کی ہستی کا سلسلہ جسم کی ہلاکت کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے)

قارئین! حیاتِ انسانی کو تین مراتب سے واسطہ پڑتا ہے۔ سب سے پہلے اِس دارالعمل سے جس میں ہم زندہ ہیں اور جو مومن کے لیے قید خانہ ہے۔ دوسرا عالمِ برزخ ہے جو موت اور حشر کے درمیان کا وقفہ ہے اور تیسرا دارالجزا ہے۔ دارالعمل اور دارالجزا کے بارے ہمارے پاس کافی معلومات ہیں لیکن بدقسمتی یا شاید خوش بختی سے برزخ کے بارے میں ہمارا علم انتہائی محدود ہے۔ قرآنی تفاسیر، کتبِ حدیث اور علامہ ابنِ قیم کی 'کتاب الروح' سے بھی ہمیں نہایت معمولی علم حاصل ہوتا ہے۔ مطمئن روح کا پروردِگار کی طرف لوٹ جانے اور جنت میں داخل ہونے کا تو قرآن سے ثابت ہے لیکن روح کے آنے جانے پر اور دارالانتظار کی کیفیات کی تفصیل پر ہمارا علم محدود ہے۔ موت کے بعد روح کا آنا جانا اللہ کی اجازت سے ہے یا حکم سے، اللہ ہی جانتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ ایسا ہوتا ہے اور ارواح کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ میں سے کچھ اہلِ علم یہ سوال اُٹھائیں گے کہ جب اللہ نے ارشاد فرما دیا کہ ہر کسی کو فنا کا سامنا ہے تو پھر بقائے دوام کا کیا معنی؟ اِس سوال کے جواب میں اِتنی طوالت ہے کہ یہ صفحات اس کے لیے ناکافی ہوں گے لیکن ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ مَیں کچھ عرض کر دوں۔ اِس سلسلے میں پہلی گزارش یہ ہے کہ جعفرؓ بن ابوطالب بھی بظاہر فنا کا مزا چکھ چکے تھے لیکن اللہ نے اپنے عمومی ضابطے سے ہٹ کر انھیں فرشتوں کی جماعت کے ساتھ نہ صرف محوِ پرواز کر دیا بل کہ اس اصول کو بھی نظرانداز کر دیا کہ تمھیں شعور نہیں ہے کہ مرنے کے بعد زندہ رہنے والے کیسے زندہ رہتے ہیں۔ محبوبؐ خدا نے اُنھیں حواس بصارت و سماعت، دونوں سے محسوس کیا اور اصحابِ محبوبؐ نے اپنے آقاؐ کی زبان مبارک سے سُن لیا، گویا دیکھ ہی لیا۔

حضرت محمد باقی باللہؒ نامور صوفی بزرگ تھے۔ ایک روز اُنھوں نے مریدین کو یہ وصیّت کی کہ اُن میں سے کوئی اُن کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائے گا بس جنازہ رکھ کے انتظار کرنا۔ کوئی شخص نقاب پوش آئے گا اور وہ نمازِ جنازہ پڑھا دے گا۔ یہ سُن کر ایک شخص نے محسوس کیا کہ حضرت کی رُخصتی کا وقت قریب آ

رہا ہے۔ لہٰذا اُس نے حضرت باقیؒ سے سوال کیا کہ یا حضرت! یہ فنا اور بقا کا معمہ تو حل فرما دیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ جواب کے لیے کل تک انتظار کرو۔ اگلے روز سائل وہاں پہنچا تو حضرت داعیِ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ وہ نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لیے وہاں رُک گیا۔ اِسی اثناء میں ایک نقاب پوش آیا اور اُس نے نمازِ جنازہ پڑھا دی۔ سائل نے خیال کیا کہ حضرت باقی تو نہیں رہے، اس عظیم شخص کے علم سے فائدہ اُٹھایا جائے جو حضرت کی وصیت کے مطابق نمازِ جنازہ پڑھانے آئے ہیں۔ لہٰذا اُس نے اپنا سوال اُن کے آگے دُہرایا۔ نقاب پوش بزرگ نے نقاب نیچے کیا تو سائل کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ خود حضرت باقی باِللہ ہی تھے۔ آپؒ نے میّت کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا کہ بھائی وہ فنا ہے اور اپنی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ بقا ہے۔

اِس مطالعہ کے بعد میرے اِس یقین میں مزید پختگی آ گئی کہ ارواح کا اپنے پسماندگان اور اپنے پیاروں سے رابطہ منقطع نہیں ہوتا تاوقتیکہ پسماندگان خود منقطع نہ کرنا چاہیں اور اپنے رفتگان کو یہ باور نہ کرادیں کہ وہ ہمارے لیے غیر اہم ہیں۔ مَیں نے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے کہ مقناطیس اُسی چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہے جس میں کھینچے جانے کی صلاحیت ہو۔ فرحت جاوید جمعرات کو اللہ کو پیاری ہوئیں۔ اگلی جمعرات قرآن خوانی اور دُعائے مغفرت کی گئی اور اُس کے بعد سے اب تک بفضلِ تعالیٰ ہر جمعرات کو قرآن خوانی اور دُعا کا سلسلہ جاری ہے۔ اِسی طرح مَیں نے اس کے ایصالِ ثواب کے لیے روزانہ دو رکعت نماز کا اہتمام کیا۔ مَیں پوری ذمہ داری سے یہ بات تحریر کر رہا ہوں کہ 6۔ جون، 2019 سے آج تک اس میں کوئی ناغہ نہیں ہوا اور اگر ایک بار بخار کی شِدّت کی وجہ سے فرض نمازوں کے ساتھ یہ دو رکعت نفل رہ گئے تو وہ میں نے اگلے روز نمازوں کی قضا کے ساتھ ادا کر لیے۔

یہاں مجھے یاد آیا کہ جمعرات کی دُعا میں شریک ہونے والی میری ایک ساتھی جو سائنس کی طالبہ ہیں اور پنجاب یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ ایم ایس سی کر چکی ہیں نے مجھے بتایا کہ اُن کی ایک پھوپھی نے حالتِ بیداری میں اُسے کہا کہ دُعا میں مجھے بھی یاد رکھا کرو۔ اُنھیں وفات پائے کئی برس گزر چکے ہیں۔

اب ہم جدید نظریات کی طرف آتے ہیں۔ اس صورتِ حال پر مذہبی سائنسی اور نفسیاتی ماہرین مختلف نظریات رکھتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد انسان بآسانی اِس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ مرنے کے بعد

مرنے سے قبل کی حالت کی نسبت انسان زیادہ صلاحیتیں حاصل کر لیتا ہے لیکن ہمارے پاس 'کیوں اور کیسے' کا معقول جواب نہیں۔ جیسا کہ مَیں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے پاس عالمِ برزخ کی معلومات نہایت ہی قلیل درجہ کی ہیں۔

معروف امریکی دانش ور NDEs (Near Death Experiences) کے لیے مشہور اور Life After Death, Powerful Evidence You Will Never Die کے مصنف Stephen Hawley Maritn نے کتاب کی ابتداء یوں کی ہے:

"I have two primary objectives for this book ----- First is to demonstrate that you are eternal. Your body will someday die, but your consciousness will live on."

(اِس کتاب کے لیے میرے سامنے دو بنیادی مقاصد ہیں ........... پہلا یہ کہ یہ واضح کرنا کہ آپ کی زندگی ابدی ہے۔ ایک نہ ایک روز آپ کا جسم مر جائے گا لیکن آپ کا شعور زندہ رہے گا)

مارٹن مزید لکھتا ہے:

"When we die, our souls return to spirit ------- the mental realm. We may be members of a group who work together. We may be guides to one another. We may incarnate together often ------ as part of group of souls that cooperate to help one another advance."

(جب ہم مرتے ہیں تو ہماری ارواح لافانی دُنیا میں لوٹ جاتی ہیں۔ ہم ایک ایسے گروپ کے رُکن ہو سکتے ہیں جو مل کر کام کرتے ہیں؛ ہم ایک دوسرے کے گائیڈ ہو سکتے ہیں اور ہم ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے تعاون کرنے والی ارواح کے گروپ میں شامل ہو سکتے ہیں۔)

یہ بات بہرحال ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہ اللہ کی مرضی، حکم یا بشارت نہیں ہے، اور یہ بھی

کہ ایسا تمام ارواح کے لیے نہیں ہے۔ روح ایک طویل مُدّت جس جسدِ خاکی کے ساتھ لپٹی رہی اُس نے بقائے دوام کے لیے کیا کچھ کیا، ابدیت کا سارا انحصار اِسی بات پر ہے۔ اِس دُنیا میں ہمیں جو لا تعداد مواقع میسّر آتے ہیں، اُن سے ہم نے کیا فائدہ اُٹھایا۔ بقائے دوام کے حصول کے لیے کیا سعی کی۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کس حد تک ادا کیے اور اعمالِ صالحہ کی طرف کتنی توجہ کی۔ یہاں ایک اور بات بھی عرض کرتا چلوں کہ 'اعمالِ صالحہ' کی جو تعریف مُلّا اور ذاکر کرتا ہے، اُسے بھی revisit اور redefine کرنے کی شدید ضرورت ہے ورنہ بقائے دوام کا خواب، خاکم بدہن، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

فرحت جاوید بہت دلچسپ اور پُرکشش شخصیت کی مالکہ تھی۔ مہمان نوازی، ملنساری اور جذبۂ خلوص و وفا اللہ کی طرف سے اُسے ودیعت کیے گئے تھے۔ صبر و شکر اس میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا تھا۔ وہ سیدھا چلنے کی عادی تھی اور توقع رکھتی تھی کہ دوسرے بھی سیدھا ہی چلیں گے۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ جنابِ رحمت اللعالمین آقاؐ جب پہلی وحی کے بعد گھر تشریف لائے تھے تو سیّدہ خدیجہؓ نے آپؐ کی ڈھارس بندھاتے یہ نہیں کہا تھا کہ آپؐ بہت بڑے عابد ہیں، لہٰذا اللہ آپؐ کو پریشان رہنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑے گا بل کہ یہ کہا تھا کہ آپؐ بلند اخلاق اور ہمدرد انسان ہیں۔ وہ حقوق العباد اور حقوقِ نسواں کی بہت بڑی علمبردار تھی۔

فرحت کے سفرِ آخرت پر جو سماں بندھا تھا، مَیں وہ آج تک بھول نہیں پایا۔ اُن لمحات کو اور مابعد واقعات کو یاد کرتے میں نے ایک دن فیصل جاوید سے پوچھا کہ تمھاری ماں کو اللہ نے اِتنی محبت سے کیوں نوازا ہے۔ اُس نے خوب صورت جواب دیا۔ کہنے لگا: ''صبر و شکر اور تحمل و بردباری کی وجہ سے'' (نہ کہ قیام و صیام کی بدولت)۔ ایک روز میرے ہاں دوستوں کی محفل تھی۔ گپ شپ کے دوران کسی دوست نے ایک شاعرہ پر کچھ ریمارکس دیے جو کہیں فرحت نے بھی سُن لیے۔ محفل برخاست ہوئی تو اُس نے عدالت لگا لی اور کہنے لگی کہ کیا شاعروں ادیبوں میں تہذیب اور شرم نہیں ہوتی۔ میں نے وضاحت چاہی تو پتہ چلا کہ وہ ایک خاتون کے لیے توہین آمیز ریمارکس پر انتہائی ناخوش تھی۔

اللہ کے ہاں فرحت جاوید کا مقام اُس کے اندازِ سوچ کی وجہ سے ہے؛ اپنے خاوند کے ساتھ بے پناہ محبت کی وجہ سے؛ صبر و شکر کی وجہ سے ہے یا کسی ایسے عملِ صالحہ کی وجہ سے ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مَیں اکثر سوچتا ہوں کہ جس طرح کا اِختیار، اجازت یا حکم اللہ نے فرحت

کو دے رکھا ہے کہ وہ مجھے ملنے آجاتی ہے، اِس طرح کا اگر مجھے بھی دے دے تو زندگی کتنی خوب صورت ہو جائے۔

فرحت کی وفات کے بعد کئی ماہ تک مَیں قلم نہ تھام سکا، یہاں تک کہ ڈائری کے اوراق بھی خالی ہی رہے۔ جب ہاتھوں کی لرزش میں کچھ کمی آئی تو قلم سے نکلا:

ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
تِرے جلوؤں سے بزمِ زندگی جنت بدامن ہے
میری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اِک تارِ نفس میں آرزو بے دار ہے اب بھی
ہر اِک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی

**مابعد فرحت:** راہِ زیست میں اِتنے بڑے حادثے سے کبھی پالا نہیں پڑا تھا۔ تقدیر نے ایسا پیچ لگایا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب زندگی کی ڈور کٹنے ہی والی ہے۔ جدائی کا صدمہ، اکلاپا اور پیرانہ سالی ........... اِس تکون نے میرا حشر کر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سال کے بعد میرے ہاں دوستوں کی ایک محفل ہوئی۔ مجھے ڈرائنگ روم سے اُٹھ کر اندر آنا پڑا۔ کچھ دیر کے بعد واپس پہنچا تو برادرِ بزرگوار پروفیسر ڈاکٹر اکرم سعید (بھاؤ جی) دوستوں سے کہہ رہے تھے کہ ''اِسے کیا کہتے ہو؟ اِس کی حالت پر تعجب کیوں ہے؟ میری بہن کو رُخصت ہوئے سات برس بیت گئے ہیں، میرا بہنوئی ابھی نارمل نہیں ہوا۔'' آج چار پانچ سال کے بعد (ستمبر، 23) میں سوچتا ہوں کہ مَیں واقعی نارمل نہیں تھا۔ اِس صدمے نے مجھے اِس حد تک مضطرب کر دیا تھا کہ مجھ سے اس دور میں ایسی حرکات سرزد ہوئیں جن کا ایک نارمل انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ مثلاً ایک روز مَیں اپنے دفتر میں ایک خاتون کو فرحت کہہ کر بلاتا رہا اور وہ پریشان ہوتی رہی۔ بالآخر اُس نے مجھے کہہ ہی دیا کہ ''سر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی، آپ گھر چلے جائیں''؛ لاہور سے تعزیت کے لیے آنے والے ایک دوست کو مَیں نے گھر کے گیٹ سے ہی واپس کر دیا؛ اپنی ایک عزیزہ کے ذریعے مَیں نے ایک ایسی خاتون کو پیغامِ نکاح بھیجنا چاہا جو دو بچوں کی ماں ہے اور اپنے خاوند کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ ایک روز میں فرحت کی قبر کے ساتھ خالی جگہ پر مٹی پر لیٹ گیا اور نجانے کتنی ہی دیر

لیٹا رہا تاوقتیکہ مجھے کسی شخص نے کہا کہ ’’بھائی جی! ہوش کریں۔‘‘

قارئین! محبوب کی جدائی اور اکلاپے کے دُکھ، حیاتِ انسانی کے ناقابلِ برداشت دُکھوں میں سے ہیں۔ یہ سچ مچ انسان کو پاگل کر دیتے ہیں۔ یہ کرب آپ کو شِدّت سے احساس دلاتا ہے کہ آپ کے اِردگرد کے لوگ وہ نہیں ہیں جیسا وہ نظر آتے ہیں۔ ایسے میں آپ کو پتہ چل جاتا ہے کہ آج کا انسان کتنا جھوٹا اور منافق ہے۔ یہ انسان اپنے ہم جنسوں کے دُکھ سے حظ اُٹھاتا ہے۔ رات کا سنّاٹا اور رفاقت سے محرومی بہت بڑا عذاب ہے۔ تنہائی کا یہ زہر آپ کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے۔ ہر رات ہزاروں نیش ہائے عقرب آپ کو تڑپاتے رہتے ہیں۔ اِس لیے اگر ایسی کسی کیفیت سے دوچار شخص کبھی آپ کو نظر انداز کر دے؛ آپ کو پہچاننے سے انکار کر دے یا آپ کی توہین بھی کر دے تو اسے معاف کر دیجئے گا۔ آنسو صرف ہمارے ہی مقدس نہیں ہوتے، دوسروں کے بھی ہیں۔ آگے بڑھ کر پونچھ دیں گے تو آنے والے دِنوں میں اللہ آپ کی اشک شوئی کے لیے بھی کوئی فرشتہ بھیج دے گا۔ تنہائی کے کرب سے نجات اور انسان کے فہم کے لیے دُعا کرتے رہا کریں۔ یہ اشک شوئی اور دُعا بھی عبادت ہے بل کہ عین عبادت ہے۔

**عاقی:** اُن دنوں اضطراب اور ذہنی پراگندگی اپنے عروج پر تھی کہ ایک روز میرے پرانے دوست حاجی محمد نواز سابق ایم پی اے اور ضلعی صدر مُسلم لیگ (ن) میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ جاوید! نکاحِ ثانی کرلو، فوراً نہ سہی، کچھ دیر ٹھہر کے سہی۔ چند روز بعد ڈاکٹر اشفاق ورک نے اِس موضوع پر ایک طویل لیکچر دیا۔ ایک روز اپنے چیمبر میں بیٹھے تھے کہ میرے رفیقِ کار اور پرانے دوست چوہدری عبداللہ نے لمبی تمہید باندھی اور کہنے لگا کہ تمھاری صحت بہت بگڑ گئی ہے، بہتر ہے نکاحِ ثانی کرلو، توجہ بٹ جائے گی۔ یہ چوہدری عبداللہ بھی کمال کا آدمی ہے۔ وکیل ہو کر بھی سچ بول لیتا ہے؛ درست مشورہ دے دیتا ہے اور چلتا ہے تو نبھاتا ہے۔ خدا کا نام بھی لے لیتا ہے، وہ بھی ’’اِس زمانے میں۔‘‘ بدقسمتی سے وہ بھی اِس طرح کا صدمہ برداشت کر چکا تھا۔ ڈاکٹر اشفاق ورک اور چوہدری عبداللہ، دونوں نے ایک بات مشترک کی کہ ایسے میں کچھ مسائل بھی ہوں گے لیکن برائیاں ناگزیر ہوں تو چھوٹی سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔

’’میرے جیسے پیر سال اور بے کار کے ساتھ شادی کون کرے گی؟‘‘ مَیں نے چوہدری عبداللہ سے کہا۔ کہنے لگا:

''ذہن بناؤ، دُعا اور دوا بھی کریں گے۔''

''تمھاری دُعاؤں نے فرحت کو تو زندگی نہ بخشی۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''اور تمھاری دُعاؤں کے باوجود زاہدہ (بھابھی ...... مسز عبداللہ) اللہ کو پیاری ہو گئی۔ حالانکہ تمھاری دُعاؤں میں زیادہ خلوص تھا! ہے نا؟'' اور مَیں خاموش ہو گیا ........... سچ ہے انسان، انسان کی تقدیر بدلنے پر قادر نہیں ہے ورنہ مَیں زاہدہ کو نہ مرنے دیتا۔ ہماری بہن بھائی کی محبّت بہت مثالی تھی۔

چند روز بعد سماجی تعلقات میں بڑھاوے کی ایک سائٹ پر مَیں نے خود کو رجسٹر کیا۔ اس کے نتیجہ میں کچھ خواتین نے مجھ سے رابطہ کیا لیکن اُن میں زیادہ تر 'رابطوں والی' ہی تھیں۔ میں پیچھے عرض کر چکا ہوں کہ اضطراب کی شِدّت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کر دیتی ہے۔ میں نے بغیر کسی دوست سے مشاورت کے یہ فیصلہ کر لیا کہ کوئی غیر ملکی عورت بہتر رہے گی۔ لہٰذا میں نے ایک انڈونیشیائی بیوہ مُسلم خاتون کے نکاح کے پیغام کے نتیجہ میں 'ہاں' کہہ دی۔ اُن سے کچھ ضروری معاملات طے ہوئے۔ اُنھیں انگریزی سمجھنے میں کچھ دُشواری ہوتی تھی لہٰذا کچھ بات چیت اُن کی بڑی بہن سے ہوئی۔ طے یہ ہوا کہ وہ دونوں ملکوں میں رہیں گی اور وقت کی تقسیم مشاورت سے ہوگی۔ لہٰذا بغرضِ نکاح میری وہ دوست چند ایّام کے بعد پاکستان پہنچ گئیں۔ اگلے روز نکاح کی تقریب ہوئی اور اُنھوں نے درجن بھر لوگوں کی موجودگی میں راضی خوشی بزبانِ انگریزی نکاح نامہ پر دستخط ثبت کر دیے۔ اِس دوران اُنھوں نے میرے موبائل فون پر ایک message کیا جس میں کچھ ایسی شرائط تھیں جو میرے لیے نا قابلِ قبول تھیں۔ لہٰذا میں نے نکاح نامے پر دستخط نہ کیے، لیکن چونکہ نکاح ہو چکا تھا اور خلوتِ صحیحہ کے بھی امکانات تھے لہٰذا میں نے اُنھیں حق مہر ادا کر دیا اور پھر یہ افسانہ آرتھر ملر کی کہانیوں کی طرح ایک خوفناک موڑ پر ختم ہو گیا جو آج تک میرے لوگوں کے لیے ایک معمّہ ہی ہے۔

سوہارتی یوسف عرف عاتی کوئی دو ہفتے میرے گھر میں رہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں۔ جب وہ لاہور ایئر پورٹ کے لیے رُخصت ہو رہی تھیں تو اُنھوں نے مجھے تنہائی میں ملاقات کا کہا لیکن میں نے اُنھیں سمجھایا کہ میں اُنھیں طلاق دے چکا ہوں، لہٰذا ایسا ممکن نہیں ہے۔ بچّے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے لیکن اُنھیں کہانی کے اندر کی کہانی کا علم نہیں تھا۔

**عظمیٰ**: میرا یہ احساس شِدّت اختیار کر گیا تھا کہ اکلا پا مقدّر میں لکھ دیا گیا ہے۔ حضرت واصف علی واصف سے جب ہم پوچھتے تھے کہ سر! دُعا سے واقعی تقدیر بدل جاتی ہے تو وہ کہتے تھے کہ ''بھائی! بدل جائے تو تقدیر کیا ہوئی؛'' لہٰذا تنہائی کے اِس کرب کے ساتھ لمحاتِ زیست ماضی کا حِصّہ بنتے گئے۔ جب کبھی مجھے کوئی دوست میری حالت کے پیشِ نظر نکاحِ ثانی کا مشورہ دیتا تو میرا ایک ہی جواب ہوتا کہ واصف صاحب کہتے تھے کہ تقدیر نہیں بدلا کرتی۔ کئی مہینوں کے بعد میں نے اپنا اِرادہ پھر سے بدلا اور کسی طرح میرا رابطہ کچھ لوگوں سے قائم ہو گیا۔ جن میں، ایک معزّز اور لائقِ احترام خاتون زبیدہ بیگم بھی تھیں۔

محترمہ زبیدہ متحدہ ہندوستان کے لاہور کے ایک اُستاد، اُردو اور فارسی کے شاعر اور علامہ اقبال کے دوست سراج الدین ایمن کی بیٹی اور سنٹرل ماڈل اسکول لاہور کے اُستاد اور ٹیچرز یونین لاہور کے صدر محمد حسین آزاد کی بہن ہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہی محمد حسین آزاد ہیں جن کی، بقول آزاد کے فحش نگاری پر، منٹو سے مقدمہ بازی رہی۔ اُنھوں نے مجھے بتایا کہ وہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول سمن آباد لاہور سے بحیثیت اورینٹل ٹیچر ریٹائر ہوئی ہیں اور اُن کی ایک بیٹی کا نکاحِ ثانی مقصود ہے۔

اگلے روز ٹیلی فون پر مذکورہ بیٹی سے بات ہوئی تو اُنھوں نے بتایا کہ اُنھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی باٹنی اعزاز کے ساتھ کیا ہے۔ ایجوکیشن میں بھی سند یافتہ ہیں اور آج کل ایل ڈی اے گرلز ہائی سکول جوہر ٹاؤن میں بحیثیت ایس ایس ٹی سائنس خدمات انجام دے رہی ہیں۔ میں تھا کہ اپنے حالات سے فگار و شرمسار۔ اپنے بارے کیا کہتا لیکن کچھ 'پھڑیں' مار دیں۔

''میں آپ سے کب مل سکتی ہوں؟'' اُنھوں نے پوچھا۔

''ایک تصویر تو send کریں'' میں نے جواب دیا۔

''Sorry''

''کیوں؟ کیا ہرج ہے اِس میں''؟

''میری صورت کوئی زیادہ بُری نہیں ہے۔'' اُنھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ کو معلوم تو ہو گا کہ اِس عمر میں لوگ کیوں شادی کرتے ہیں؟''

''جی معلوم ہے ...... میں سائنس کی طالبہ ہوں ...... میڈیکل میں داخلہ ہو گیا تھا لیکن لاہور نہ چھوڑ سکی۔''

''پھر بھی آپ مجھ سے نکاح کرنا چاہتی ہیں؟''

''ملاقات پر تفصیل بتاؤں گی۔''

''ملاقات کے لیے کہاں حاضر ہونا ہے مجھے؟''

''میں خود شیخو پورہ آؤں گی۔''

''تو ٹھیک ہے آپ اتوار کو تشریف لے آئیں۔ دو پہر کا کھانا ہم اکٹھے کھائیں گے''

اور اتوار کو عظمیٰ حسین اپنے دو بھائیوں کے ساتھ میرے ہاں تشریف لے آئیں۔ اِس دوران کچھ دیگر لوگوں سے بھی میرا رابطہ رہا۔ اِس رابطے نے مجھے اَلم ،افسردگی اور مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا۔ ایسے ایسے خوفناک مسائل سامنے آئے کہ کلیجہ شق ہو جاتا تھا۔ خلع ،خلع ،خلع اور طلاق۔ ہر کہانی کا وِلن خاوند اور اور اس ولن کے پیچھے لائقِ نفرت کردار ساس کا نظر آتا تھا۔ ایسی ہی ٹریجڈی فلم کا ایک کردار لاہور کی ایک ادھیڑ عمر لیکن پُرکشش خاتون انیلا کا تھا۔ انیلا دو بچوں کی ماں تھی اور بیرونِ ملک مقیم اپنے بھائیوں کے زیرِ کفالت تھی۔ اس کے علاوہ مَیں نے رائیونڈ روڈ لاہور اور اقبال ٹاؤن لاہور میں بھی دو خواتین سے ملاقاتیں کیں۔ اقبال ٹاؤن کی رہائشی معصوم اور بھولی بھالی سی خاتون کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ اُس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ والدین کی محبت وشفقت ،پُرتکلّف چائے اور گھر سے رُخصت کرنے کا اُن کا انداز میرے من کو بہت بھایا۔ ان قابلِ احترام خواتین کے دُکھ جان کر مَیں اپنا دُکھ بھول گیا، لیکن میری بھی کچھ حدود تھیں، کیا کرتا؟

مَیں نے قحط الرّجال کا لفظ تو سُن رکھا تھا لیکن اس کی جھلک مجھے 2020 میں نظر آئی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ انسانوں کا قحط انسان کے معاشرے میں؟ یہ کیا ہوا؟ یاد آیا کہ ہم اِنسان ابنِ منصور حلاج کو سُولی پر لٹکا دیتے ہیں؛ رُومی اور حسین لاہوری کو پاگل اور شریعت کے باغی قرار دیتے ہیں؛ ٹیپو اور عبداللہ بھٹی جیسے سُورماؤں کو شہید کر دیتے ہیں؛ غازی علم الدین اور غازی عبدالقیوم اپنے آقاؐ پر قربان ہو جاتے ہیں اور جناح جیسے دانش ور مار دیے جاتے ہیں تو پھر پیچھے اصغر علی جاوید جیسے ماٹی کے بے روح پُتلے ہی رہ

جائیں گے۔قحط نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ قحط زدہ، کِرم خوردہ اور پدرسری معاشرے میں ہماری عورت جس طرح پس رہی ہے، اس کا جتنا شدید صدمہ مجھے اُن ایاّم میں ہوا، ماضی میں کبھی نہ ہوا تھا۔اِن حالات میں مجھے اپنا غم کچھ ہلکا محسوس ہو رہا تھا اور میں نارمل زندگی کی طرف واپس لوٹنے لگا۔سوچ رہا تھا کہ کہاں دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے کہ ایک روز عظمیٰ خادم حسین کے بھائی محمد نواز صاحب، جو ایک دانش ور اور مہذب انسان ہیں نے فون پر رابطہ کیا اور کہا کہ اپنی امانت اپنے گھر لے جائیں۔یوں 14۔نومبر کو ہم کچھ افرادِ خانہ، برادرانِ عزیز چوہدری محمد عبداللہ ایڈووکیٹ اور پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم سُرا کے ساتھ سمن آباد لاہور پہنچ گئے اور نکاح کے بعد محترمہ کو اپنے گھر لے آئے، اِس دُعا کے ساتھ کہ الٰہی! یہ خانہ آبادی، بیتِ عنکبوت ثابت نہ ہو۔2023 کے رُبع آخر میں جب میں یہ سطور قلم بند کر رہا تھا تو عظمیٰ ان کی یوں پڑتال کر رہی تھی جیسے میٹرک اور ایف ایس سی کے کیمسٹری کے امتحانی پرچے۔

عظمیٰ ایثار سے سرشار، تحمّل اور بردباری کی علامت اور صوم وصلاۃ کی پابند، تہجّد گزار خاتون ہیں۔شعر وادب میں نظم ان کی پسندیدہ صنف ہے۔تصوّف پر گفتگو اور تلاوتِ قرآن کے بغیر نیند ان سے بیگانہ رہتی ہے۔حضرت رُومی اور حضرت محمد علی جناح ان کی پسندیدہ شخصیات اور دُعا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔یہ کہتی ہیں کہ کسی مسلمان کے بارے میں یہ جان کر میرے تحیّر کی کوئی انتہا نہیں ہوتی کہ اُس نے جمعہ کا روز سورۃ الکہف اور کوئی شام سورۃ الملک پڑھے بغیر گزار دی ہے۔

عظمیٰ کو جوہر ٹاؤن چھوڑنے جانے کے لیے مجھے ڈاکٹرز ہسپتال کے آگے سے، اور اُس درخت کے پاس سے گزرنا پڑتا ہے جس کی چھاؤں میں 2019 کی عیدالفطر کا زہرناک توشہ نگلنا پڑا تھا۔یہ لمحہ بہت پُراذیّت ہوتا ہے۔میرا عہدِ جوانی، تعلیم، شادی، ملازمت اور کئی داستانیں لاہور میں دفن ہیں۔شیخوپورہ میں گھر کی تعمیر کے بعد تک بھی فرحت مجھے دوبارہ لاہور شفٹ ہونے کا کہتی رہی۔اِس چوک سے گزرتے ہوئے مجھے اُس کی یہ بات ہمیشہ یاد آتی ہے کہ بیروت، قطر، حافظ آباد، لاہور اور شیخوپورہ جیسے مساکن میں سے مجھے صرف لاہور سے پیار ہوا۔اُس نے اپنے آخری سانس بھی اسی شہر میں لیے۔اس چوک سے گزرتے میں خود کو حوصلہ دینے کے لیے اور اپنی توجہ ہٹانے کے لیے بآوازِ بلند درودِ پاک پڑھنا شروع کر دیتا ہوں لیکن پھر بھی مجھے یوں لگتا ہے کہ میں مر رہا ہوں۔میں ڈرائیونگ میں بہت محتاط

ہو جاتا ہوں؛ پانی کا گھونٹ پیتا ہوں اور بعض اوقات کچھ فاصلے پر جا کر گاڑی چند منٹ کے لیے روک دیتا ہوں۔

کِس طرح لوگ چلے جاتے ہیں اُٹھ کر چپ چاپ
ہم تو یہ دھیان میں لاتے ہوئے مر جاتے ہیں
یہ محبّت کی کہانی نہیں مرتی ، لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
گھر پہنچتا ہے کوئی اور ہمارے جیسا
ہم تِرے شہر سے جاتے ہوئے مر جاتے ہیں
(عباس تابش)

**جب عمر کی گٹھڑی کھولی گئی:** شیخوپورہ کی ادبی فضا کئی عشروں سے 'دریچہ' نامی تنظیم کی مرہونِ منّت چلی آ رہی ہے۔ ایک طویل مُدّت سے اس نے اپنے ماتھے پر ''علمی، ادبی اور ثقافتی تنظیم'' کا سٹِکر چسپاں کر رکھا ہے لیکن بدقسمتی سے قیادت کے فقدان اور غیر سنجیدہ رویّہ کی وجہ سے یہ کوئی قابلِ ذکر قلم کار پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ شیخوپورہ میں مقیم نامور محقق ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے ہمیشہ ہی 'دریچہ' کی عزت افزائی کی لیکن ہمالیہ سے بڑے اِس نام کو کِسی پلیٹ فارم کی ضرورت نہ تھی۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے طنز و مزاح میں پوری قوّت سے اپنے آپ کو منوایا ہے۔ ڈاکٹر محمد اکرم سُرا جو ڈاکٹر وِرک کی طرح جملہ سازی کے رموز سے آشنا ہیں، نے بہت تھوڑا کام کیا ہے اور ابھی تک اُن کی پہچان نہ بن سکی ہے۔ یوں نثر اور بالخصوص فکشن میں 'دریچہ' ہمیشہ ہی قحط سالی کا شکار رہی ہے۔ علمی، ادبی اور ثقافتی تنظیم کہلوانے والی 'دریچہ' کی بقا کا سارا انحصار شعراء پر ہے جن کی craft اور thought پر مضبوط گرفت ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے شعراء کے دامن میں ایسا ذخیرہ نہایت محدود ہے جسے قاری پڑھے، پھر پڑھے اور پھر پڑھے اور پھر اپنے کسی دُکھ کے اظہار کے لیے کِسی چاہنے والے یا چاہے جانے والے کی طرف کسی برقی سندیسہ میں ارسال کر دے۔

میرا خیال ہے کہ مستقبل 'نظم' کا ہے اور اگر ہم ماضی پر بھی نظر دوڑائیں تو اِس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ شعر کے عام قاری نے جن شعراء پر اپنی محبتیں نچھاور کی ہیں وہ نظم نگار ہی ہیں یا یوں کہہ لیں کہ اُن کی عظمتوں کے مینار اُن کی نظم کی وجہ سے ہیں۔ مَیں نے گزشتہ صفحات میں اپنے المناک اظہار یہ کے لیے غزلوں کا سہارا لیا ہے تو کیا مجھے نظم کی حیثیت اور اہمیت کو بڑھاوا دینے کے لیے پچھلے صفحہ پر نقل کیے گئے عباس تابش کے اشعار قلم زد کرنا ہوں گے؟ نہیں، میں ایسا نہیں کروں گا۔ نہیں کرنا چاہیئنا مجھے؟ یہ بہت بڑی بد دیانتی ہوگی۔ غزل کی خوب صورتی اور ہیئتی اعتبار سے اِس کی اہمیت سے مفر ممکن نہ ہے۔ تو پھر میرا دُکھ کیا ہے؟ مجھے آج کے شاعر سے شِکوَہ کیوں ہے؟ اِن دونوں سوالوں کا جواب ایک ہی ہے کہ شاعر نے 'مجھے' نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کی پوری توجہ craftsmanship کی طرف ہے۔ مزدور، مسوّدہ لے کر پبلشر کے پاس کھڑے بھیک مانگنے والے نئے قلم کار، سڑک تعمیر کرنے والی تار کول جیسی عورت، بیوہ کی زندگی کا پہلا سال، بے گناہ کے جیل میں گزرتے لمحات اور اکلاپے کے شکار پیر سال مریض سے میرے شاعر کی نظر کیوں چُوک جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ نہیں ہونا چاہیے نا؟ تاثیر سے بہت پرے دِق کرتی ہوئی شاعری اور نظم کے نام پر لکھی تحریروں کو بہتر اور بامقصد بنانے کے لیے مَیں نے جب بھی اپنے شعرائے عظام سے گزارش کی تو مجھے اس مضحکہ خیز ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا کہ مجھے اپنے ویژن کو کُشادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک بار تو اِس طرح کا جملہ بھی سُننا پڑا کہ نظم کو سمجھنے کے لیے ایک خاص ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ فنِ ابہام سازی میں معرکہ آرائی کرنے والے ہمارے لائقِ صد احترام شعرائے کرام تخلیقات کا معیار بہتر بنانے کی بجائے قاری کو ویژن بہتر بنانے کا مشورہ دیتے ہیں اور بین الاقوامی طور پر مسلّمہ اِس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ قاری کبھی کم فہم نہیں ہوتا۔ اور پھر فضولیات کے ماحصل مرکّبات کی محض پی۔ آر کی طاقت سے تقاریبِ پذیرائی منعقد ہوتی ہیں جہاں جھوٹ اور منافقت کے نہایت شاندار مظاہرے ہوتے ہیں۔ یوں ہم اپنے تئیں مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اچھا شعر اور اچھا فکشن تخلیق کر کے ادب کی نا قابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب گلزار جولاہے کو یہ کہتا ہے کہ وہ اُسے گرہ لگانے کی ترکیب سکھا دے یا عابی 'بُدھ ہے بابا' تخلیق کرتا ہے تو کیا وہ پہلے اپنے ریڈر کو بادام کی سردائی پلاتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے

بلکہ وہ تخلیق میں بادام اور شہد شامل کر کے ایسا آمیزہ بنا دیتے ہیں جسے readability کہتے ہیں۔

کچھ اِسی طرح کے جذبات تھے میرے جن کے نتیجہ میں مَیں نے نظم میں تاثر کے متلاشی قارئین کے لیے نظموں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا۔ اِس انتخاب پر مجھے تو کچھ نہیں کہنا کہ یہ قارئین کا کام ہے لیکن کتاب کے تعارف کے لیے یہ عرض کردوں کہ اِس میں Heart Touching نظمیں شامل ہیں اور اِسے نام دیا گیا ہے: ’جب عمر کی گٹھڑی کھولی گئی‘۔

**جو بچے ہیں سنگ**: 2023 کے اواخر میں مَیں نے اپنے وہ کالمز اور مضامین بھی یکجا کردیے جن کی اہمیت دائمی نوعیت کی ہے یا اُن میں readability موجود ہے اور اُنھیں ’جو بچے ہیں سنگ‘ کے عنوان سے شائع کردیا۔ ’جو بچے ہیں سنگ‘ میں شامل فنِ افسانہ پر 50 صفحات کا مضمون قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان رکھتا ہے۔

# حرفِ آخر

قارئین! میں نے اپنے تجربات وحوادث میں سے بہت کچھ نہیں بل کہ ’کچھ‘ آپ کی نذر کیا ہے۔ ہر فعل کے پیچھے کچھ ’کیوں‘ ہوتے ہیں۔ میرے پاس کسی ’کیوں‘ کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میں الجبرا کے مشکل سوال حل کرنے کا عادی ہوں۔ اگر میں یہ عرض کروں کہ اِس کتاب میں آپ کو کچھ خاص ملا ہوگا تو ایسا کہنا مجذوب کی بڑ کے سِوا کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر ققنس کی چونچ میں تین سو ساٹھ سوراخ نہ ہوتے تو وہ ققنس نہ ہوتا۔

پیرانہ سالی پوری قوّت سے حاوی ہورہی ہے۔ 365 ایّام اور 6 گھنٹوں کی گردش نے نئے پیمانے تھام لیے ہیں۔ کِسی ناقابلِ فراموش جمعرات، جمعہ کا انتظار ہے، اپنے نام کے ساتھ ایک لفظ کے اضافے کے لیے۔

دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔